سلسلہ تردیدِ الحاد:۴

جدید نسائیت پرستوں کے اسلامی اصول دین اور شرعی قوانین پر اعتراضات کا علمیاتی جایزہ و تردید:حقوق النسا کے تناظر میں

جدید نسائیت کا شرعی ،تہذیبی ،ثقافتی اور فسلفیانہ محاکمہ

مرتبہ: مقدمہ تخریج،تہذیب اورحواشی

ڈاکٹر محمد علی جنید

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

کرف™kurf©2020
مطبع برقیہ: جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش۔
جنس:جدید نسائیت۔
سلسلہ تردید الحاد:۴۔
مرتبہ:تخریج،تحقیق،تہذیب،حواشی،مقدمہ،سرورق اور پیشکش:ڈاکٹر محمد علی جنید۔
بشکریہ:الحاد ڈاٹ کام،اسلام کیو اے ڈاٹ کام اور جملہ مقالہ نگار۔
کلید:فلسفہ،تاریخ،سیاست،بنیادی حقوق،مغربیت،جدیدیت،جدیدیت،غامدیت، لونڈی،غلام،کنیز،زنا بلجبر،قران،حدیث،استشراق،مغربیات،ادب،نسا ،عورت،تاریخ،تہذیب،ثقافت،عورت مارچ، واقعہ قصور ،فحاشی،عریانی وغیرہ

www.facebook.com/kurf.ku
www.facebook.com/groups/kurfku
www.kufrku.blogspot.com

کرف

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

[1] **November 13, 2014**

[2] **August 13, 2016-**

مقدمہ

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ رواں سال اس صدی کا ایک خاص سال اس لحاظ سے گردانا جاسکتا ہے کیونکہ اس سال کئی ایسے امور اور حادثات وقوع پذیر ہوئے ہیں جو کل عالم کے ہر فرد،جنس ،مذہب و ریاست نے بذات خود دیکھے،پرکھے اور محسوس کئے ہیں،۲۰۱۹ کے آخری ماہ میں چین میں نمودار ہونے والی وبا کو شروع شروع میں باشندگانِ عالم ارض نے خاص توجہ کے قابل نہیں سمجھا تھا اور دوسری طرف جہاں تک چینی حکومت کا تعلق ہے تو جناب خود چینی حکومت نے بھی ووہان میں نمودار ہونے والی اس وبا کو وبا کم ایک مخالفانہ پروپگینڈے اور نقص امن کی کوشش سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھیبلکہ الٹا اسکی طرف توجہ دلوانے والے ڈاکٹر لی کو نا صرف ڈرایا دھمکایا گیا تھا بلکہ کچھ حلقوں کی جانب سےانہیں لعن و طعن بھی کیا گیا تھا۔

جبکہ وہ بیچارہ یہ بات شاید جانتا ہی نہیں تھا کہ اس کے پیچھےکون کون سے حادثاتی،سازشی تصورات و حکمتیں کارفرما ہیں۔اب اللہ ہی جانیں یہ وبا امریکہ و چین کی باہمی پس پردہ سرد جنگ کے سبب نمودار ہوئی یا پھر قدرتی طور پر پھیلی،خیر ۲۰۲۰ کے آغاز پر ہی میرے جیسے فرد کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ عالمی طور پر کساد بازاری،اور معاشی بحران سرمایہ دارانہ دنیا میں ایک عشرے بعد اک بار پھر عود آئینگے جیسے ۲۰۰۸ میں یا ۱۹۳۰ میں دنیا کو اس عظیم بحران نے ہلا کر رکھ دیا تھا ،ویسا ہی کچھ دوبارہ ہونے والا کا گمان ہونے لگا تھا۔

جس میں چند نادیدہ ہاتھوں نے عالمی سرمایہ سمیٹ کر تہہ خانوں میں بند کردیا تھا اور نتیجتاً اس وقت کا کثیر دولت و سرمایہ چند ان دیکھے ہاتھوں میں جمع ہوگیا تھا جبکہ کئی بینک اور عالمی معاشی ادارے اور ملٹی نیشنل ادارے اس طرح یوں دولت کے اپنے پس پشت غائب ہونے کی وجہ سے دیوالیہ اور قلاش ہونے لگے تھے اور ایک کے بعد ایک یہ دوسروں کو بھی لے کر بیٹھنے لگے تھے اوپر سے سٹہ بازی اور اسٹاک مارکیٹنگ نے بھی سب کی جان بلب کرکے رکھدی تھی ،جس سے اندازہ ہوا کہ کل دنیا کا سرمائہ عالمگیریت سے وابستہ نسل بندیوں نے کہیں سے کہیں پہنچادیا تھا اورآج یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ چند نادیدہ ہاتھ اپنی تباہ کن معاشی حکمت عملیوں اور علم معاشیات کی خود ساختہ تخلیق کردہ منصوبہ بندیوں اور سازشوں کے سبب کل دنیا کی معیشت پر حکمرانی کررہے ہیں۔

مگر پاکستان میں ۲۰۲۰ کے ساتھ ہی جس امر نے سب کی توجہ مرکوز کئے رکھی وہ میڈیا پر حقوقِ نسا کے ضمن میں ہونے والے جنگ و جدل کے میدان سخن تھے جس میں نسائیت،جدیدیت،جنسیت اور مذہب گریز عناصر کا شور شرابا،واویلا کرنا ،چیخ چیخ کر لوگوں کو خود کی طرف راغب و متوجہ کرنا نمایاں تھا،اس معاملہ سے قبل ایک ڈرامہ میں ایک بے وفا بیوی کو اسکے شوہر کا اس کو ڈرامائی دھوکہ بازی پر دو کوڑی عورت کہنا ،جبکہ سب کچھ غیر حقیقی اور فکشن سے زیاد کچھ نہیں تھا اک ایسا شور شرابا اور طوفان بدتمیزی برپا کرگیا کہ ،ڈرامہ راتوں رات ہٹ ہوگیا اور اپنے ساتھ فکری بحث کا ایک نیا دروازہ مزید وا کرگیا، مابعد ڈرامہ صورتحال کچھ یوں تھی کہ اب اس بحث میں

صرف ماڈرن حلیہ کی خواتین پیش پیش نہیں تھیں بلکہ اب اس میں انکے ساتھ ظاہری حجاب و چادر میں چھپی درون خانہ مغرب زدہ خواتین بھی صف اول کا کردار ادا فرمانے لگی تھیں۔

اسکولوں کالجوں،اور جامعات کی خواتین کی خواتین سب سے زیادہ انکے پروپگینڈے سے متاثر ہونے لگی تھیں ،مگر ہم جانچتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی۹۹ فیصد مرد و عورت نے اس ڈسکورس اور بیانیہ کو اپنے اقدار و معاشرہ کے منافی قرار دیا ہے،خٰیر اسی بحث کو مارچ میں منعقد ہونے والے عالمی عورتوں سے مخصوص دن نے اور تیزگام بنادیا تھا اور اسکے ساتھ ان جدید الفکر ،جنس پرست معاشرہ گریز خواتین نے میڈیا،اور سوشل میڈیا پر ایسا طوفان بدتمیزی برپا کردیا تھا کہ مجھے جیسا فرد بھی اس بحث کو سنجیدگی سےدیکھنے پرکھنے پر مجبور ہوگیا،حلانکہ نسائیت اور جنسیت پرستی کے لئے موضوں ماحول کی تشکیل کا مطالبہ کوئی پاکستان میں نیا موضوع نہیں تھا،مگر اس دفعہ سوشل میڈیا کی وسعت اور مغلوب الفکر،کم فہم جدید کم عمر نسل نے اسے سہ آتشہ بنادیا تھا،،سیدی سیدی سی بات تھی کہ بحث علمی،معقولی سے زیادہ جذباتی،نفسانی،جنسی نوعیت کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبیت اور مشرقیت سے قطع تعلق کرنے پر واضح طور پر مبنی نظر آنے لگی تھی۔

اس پوری بحث پر گفت و شنید سے قبل کچھ چیزوں پر غور وفکر اور تدبر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جیس اکہ اس مباحثہ کا ماحاصل یہ اظہاریہ ہے کہ کیا اس عالم انسانیت میں صرف عورت نام کا گروہ ہی موجود ہے ،مرد نامی کوئی گروہ کیا سرے سے موجود ہی نہیں ہے؟ ممکن ہے کہ اسکے جواب میں کہا جائیگا کہ مرد کے وجود کا ہم کو انکار نہیں ہے مگر مابعد نسا پرست گروہ کہتے ہیں کہ اگر چہ مرد بھی اس معاشرہ کا اہم رکن ہے مگر ساری (۱)بدمعاشیاں،شیطانیاں،ظلم اسی کا پیدا کردہ ہے،اور(۲) خواتین کو صدیوں سے اسی گروہ نے ہی مغلوب و مقہوربنا کررکھے ہوا ہے،(۳)اسے اسکا وہ حق نہیں دیا گیاجسکی وہ ہمیشہ سے حقدار تھی۔

(۴)اسے لونڈی بنا کر رکھا گیا ،کنیز بنا کر رکھاگیا(۵)خادمہ بنا کر چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر مارا پیٹا گیا،جنس بنا کر بازار میں بیچا گیا (۶) اسے جائیداد سے محروم رکھا گیا (۷)حکومت و سیاست کے قابل سمجھا ہی نہیں سمجھا گیا (۸) اسے تحصیلِ علم سے محروم رکھنے کی سازشیں کی گئیں ہیں۔

(۹)اسے وہ آزادی دی ہی نہیں گئی جسکی یہ حقدار تھی (۱۰)اسے گناہ و ثواب کے بندھنوں میں گرفتار کئے رکھا گیا (۱۰)جسکے لئے خود ساختہ اصول و ضوابط،اخلاقی اقدار ،رسم و رواج مردوں کی جانب سے وضع کئے گئے ہیں (۱۱) مساوات بھی سرے سے دونوں جنسوں میں مد نظر نہیں رکھی گئی ہے۔

ہم اسکے جواب میں کہہ سکتے ہیں اول یہ کہ انسان کے عمومی لفظ میں جو مجموعیت پیدا ہوتی ہے وہ مرد و عورت کے مساوی،مقابل،ازواجی رشتہ سے پیدا شدہ مجموعی کلیت کی عکاسی ہوا کرتی ہے پھر یہ بتدریج ماہ و سال،کمسنی و پیری،بچپنے،جوانی ،بڑھاپے سے متمیز کی جاتی رہتی ہے اور اس ساری بحث ، تقسیم یا تدریج میں مرد و عورت دونوں ہی جنسیں مساوی طور پر شریک سفر ہوتے ہیں ۔لہٰذا انسان چاہے مرد ہو یا عورت ہو، دونوں ہی حقیقت میں ایک جیسے نطفہ سے لوتھڑے تک ترقی کرکے ماں کے حمل میں ایک بچہ یا بچی کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ایک ہی باپ کا نطفہ ایک ہی ماں

کے حملی ماحول میں اسے بچہ یا بچی کی شکل خالق کائینات کے مقرر کردہ تخلیقی نظام کے زیر اثر تقدیر شدہ جنسوں میں تقسیم کر کےدیتا ہے،مگر اس تقسیم بندی میں حق و صداقت اسی امر میں پنہاں ہے کہ دوران حمل تخلیق و پیدایش میں نا ہی مرد کوئی سازش کرکے کسی قسم کی تبدیلی لاسکتا ہےاور نا ہی عورت کسی تبدیلی و انتخاب کی اہل ہوتی ہے ،یہ سب اللہ کے تخلیق کردہ نظام تقدیر و تخلیق کی کرشمہ سازی ہوتی ہے جسے وہ اپنے اذلی و ابدی علم و تقدیر سے مقررہ مقدار میں مقدر کردیتا ہے۔

اسلام اور اسکا رب بطور انسان اور بطور جنس مرد اور عورت کو یکساں انسان تصور کرتے ہیں،دونوں ہی گناہ و ثواب نیکی یا بدی،اچھائی یا برائی،بدصورتی اور خوبصورتی،میں اپنی اپنی جنس کے لحاظ سے الگ الگ ہوکر بھی مساوی طور پر اعمال کی بنیاد پر جنت و دوزخ میں جانے کے اہل ہوتے ہیں۔

لہذا بدمعاشی کرنے،شیطانیاں کرنے یا بداعمالیاں کرنے میں کوئی مرد و عورت کی تخصیص دین میں واقع نہیں ہوئی ہے،مرد و عورت اگر شادی شدہ ہوکر زنا کریں تو دونوں ہی سنگسار کئے جائنگے یہاں دونوں پر یکساں جرم و گناہ کے لحاظ سے ایک ہی سزا مقرر کی گئی ہے،اب اگر غیر شادی شدہ ہونگے تو دونوں کو ہی برابر سو کوڑے مارے جائینگے،چوری کرینگے تو دونوں جنسوں کو ہی یکساں سزا میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائیگی،کسی پر بھتان لگانے میں مرد و عورت اعلی و اشرف دونوں جنسوں پر یکساں کوڑے لگینگے جیسے حمنہ بنت حجشؓ نبی اکرمؐ کی سالی محترمہ ہوں یا پھر حسان بن ثابتؓ شاعر رسول ہوں دونوں پر عایشہؓ پر بھتان طرازی کے ضمن میں دیگر لوگوں کی طرح حد کا نفاذ کیا گیا تھا۔

اب فاطمہ مخزومیؓ جسی قریشی اعلی خاندان و نسب کی چوری کرنے والی خاتون ہوں یا کمتر درجہ کا مرد دونوں یکساں سزا کے مستحق قرار پائے گئے ہیں،اسی طرح مرتد چاہے مرد ہو یا عورت دونوں کو ہی یکساں سزا ملے گی،چونکہ یہاں ذکر مرد کی شیطانیوں اور بدمعاشیوں کا ہے تو جان لینا چاہئے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں اعمال و نیت اگر انفرادی ذاتی معاملہ ہے تو دین الہی نے اس میں کوئی جنس کی بنیاد پر مواقع کو کسی ایک جنس میں محدود نہیں کردیا ہے،عدم تفریق فطری و طبعی جنس کی بنیاد پر وظایف کار کی ہے،سورج و چاند کی اپنی اپنی اہمیت ہے چاند سورج کے تابع ہے،اگر چہ اسکا اپنا وجود ہے مگر وہ رات سے قبل روشنی بکھیرنے کا فریضہ سرانجام نہٰن دے سکتا ہے،اور سورج جسکی تخلیق نظام شمسی کو وحدت میں پرو کر کل نظام شمسی میں زندگی پروان چڑھاتی ہے کو دن کرنے اور دن میں حیات کو برقرار رکھنے کا شعبہ دیا گیا ہے،عین ایسے عورت چاند ہے اور مرد سورج ہے دونوں کا باہم ناطہ تعلق اور شعبہ حیات بھی ہے،سورج سے آنکھین ملائی نہیں جاتیں اور چاند نے نظر ہٹائی نہیں جاتی۔

لہذا بدمعاشیاں چاہے کسی بھی قسم کی ہوں خالی مرد سے مخصوص و متعین نہیں ہیں بلکہ اس میں عورت بھی عین اپنی جنسی استعداد و قوت کے لحاظ سے ویسے ہی شریک و سہیم ہے جیسے مرد

نظر آتا ہے،مگر بحرحال تخلیقی وصف و استعداد میں دونوں میں تخلیق کے مالک نے جو فرق ودیعت کیا تھا وہ اذلی وصفی طور پر صدیوں سے نسل بہ نسل دونوں جنسوں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے،اللہ نےاگر مرد کو جسمانی قوت ،تدبر،عقل،صبر،فراخی،وسیع القلبی،مستقل مزاجی میں قوی کیا ہے تو ساتھ میں کسب،روزی،کمانے،سیاست کرنے،جنگ کرنے،علم کی ترویج،و تشکیل،عقل و تدبر،حزم و احتیاط،قوت تخلیق،ندرت طبع،قانون سازی،میں مرد کو ہی اہل قرار دیا ہے کیونکہ یہ خصایل و وظایف تخلیق فطرت و سرشتی کے وقت ہی اسکی ذات میں پنہاں کردئے گئے تھے ،اور اسکو ان امور کا اہل قرار دیکر ان امور اور انکی فروعات کو اسکے فرایض میں شامل کردیا گیا تھا کیونکہ خالق کائینات نے تخلیق سے قبل ان وظایف کی تبیر و تشکیل کو مد نظر رکھ کر اسکی تخلیق کی تھی،اسکی حاکمیت اگر خارج میں تھی تو عموم میں بھی تھی، یوں وہ ریاست و خاندان دونوں کا سربراہ قرار پایا۔

دراصل آدم ؑ اور حواؑ کے واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ عورت مرد کے جسد کی ایک فرع تھی خود عین اصل نہیں تھی، پورانوں میں منو کے قصے و تخلیق میں بھی اسکے مماثل بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ یہ تو جانی مانی بات ہے کہ اول آدمؑ کی تخلیق وجود میں آئی تھی اماں حواؑ اسکے بہت بعد میں پیدا ہوئی تھیں،اور انکی پدائیش کے لئے بھی مرد کے مادہ کو ہی بنیاد بنایا گیا تھا ،آج بھی مرد و عورت کے تعلق میں عورت کا حمل ایک ایسے زندہ حیاتی تخلیق کار آلہ کار کا درجہ رکھتا ہے جہاں مرد کا نطفہ اسکے نطفہ سے تعلق و امتزاج پیدا کرکے اللہ کے حکم سے نیا وجود تخلیق میں لاتا ہے،

یہ وصف قدرت نے مرد کو نہیں دیا ہے،جب عورت یہ دکھ سہتی ہے،بچہ کو حمل میں اٹھائے پھرتی ہے تب مرد کماکر اسکے لئے رزق لاتا ہے،اب کچھ عورتوں کا ان عموم سے کچھ خارج میں کسی اتفاق کا شکار ہونا عمومی حقایق کا انکار ممکن نہیں بنا سکتا ہے،عورت اور مرد کے تعلق سے پیدا شدہ اولاد کی تخلیق و تشکیل میں مرد کا نطفہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے،اور عورت کے نطفہ میں حیات بخش تخلیقی ووظایف کو بڑھوتری دیتا ہے،جبھی تمام آسمانی ادیان میں نسب باپ سے ہی چلتا ہے،شریعت نے جو ایک عورت کو ایک مرد سے ایک وقت میں تعلقات کو جایز طور پر قایم کرنا محبوب جانا ہے ،اسکا ایک سبب عورت کی عزت بطور ماں،بطور سربراہ خاندان قایم کرکے اسکے بچے کے باپ کی رفیقہ حیات کے طور پر اسکی عزت کو محفوظ کرنا بھی ہے۔

عورتوں کی جانب سے شور مچایا جاتا ہے کہ مرد کو کیوں ایک سے زاید عورتوں سے شادی کی اجازت ہے عورت کو کیوں اس امر میں مساوات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ حق نہیں دیا گیا ہے غور کرو کہ ایک مرد اگر آدھا گھنٹہ میں تین بیویوں کے پاس جاکر حمل ٹھراتا ہے،اور تینوں کی زندگی میں اسکے علاوہ کوئی دوسرا مرد نا ہو اور وہ تینوں نتیجتاً اگر حاملہ ہوں تو بلا شک وہ مرد ہی تینوں کے بچوں کا جایز باپ تصورہوگا،اب اگر ایک عورت کے پاس تین مرد آدھے گھنٹے میں جاکر اختلاط کرتے ہیں تو وہ عورت اور وہ مرد تینوں یقین سےکچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ بچہ کس کا ہے؟ اس میں کیا شک ہے کہ ان تینوں سے پس پشت اسکے سوا کیا توقع ممکن ہے کہ وہ تینوں ہی اس عورت کو اپنی داشتہ کہیں گے اپنی بیوی نہیں مانیں گے اور اسے اپنے خاندان کا حصہ تصور کرنے سے پہلو بچائنگے،جبھی یہاں مرد و عورت میں کثیر ازواجی حقوق کے ضمن میں وظایف کار،جسمانی ساختوں ،قوتوں اور سماجی معیارات کی رو وہ مساوات ممکن نہیں ہے جسے مرد پر

قیاس کرکے وجود میں لانے کا ڈھکا چھپا مطالبہ ناقص العقل آج کل کر بیٹھتے ہیں،اس بحث کو آگے موڑ پع مذید واضہ کیا جائیگا جب تک ذرا صبر فرمائیں۔

جبھی انسانی تاریخ مرد سیاست دانوں حاکموں،تخلیق کاروں،جنگجووں،عالموں،سائینسدانوں،اور پیغمبروں سے بھری پڑی ہے،اللہ نے آج تک کسی عورت کو نبوت سے سرفراز نہیں کیا ہے اور یہ ایک عمومی مسلہ اور عقیدہ تسلیم کیا گیا ہے،جس میں صرف امام ابن حزمؒ نے ذرا الگ موقف اختیار کیا ہے۔

اب مرد کی سیادت وقیادت جو اسکی جنس سے وابستہ وصف کے طور پر صدیوں سے نمایاں رہی ہے کہ مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت میں سرے سے کوئی حاکم رہی ہی نہیں ہے،نا اس سے یہ مراد ہے کہ سرے سے کوئی عورت ایسی صلاحیتوں،وظایف کار،اہلیت و قابلیت کی حامل رہی ہی نہیں ہے،واضح رہے کہ استثنیٰ کا کلیہ ہمیشہ عموم سے خارج اپنا وجود منواتا چلا آریا ہے،مگر یہ استثنائی خصوص ایک قلیل المقدار واقعہ سے زیادہ کہیں کچھ نہیں رہا ہے۔

چناچہ عورت ہوا یا مرد ہو دونوں اپنے عصر،حالات،ماحول اور رواج سے خارج و لاتعلق نہیں رہ سکتے ہیں،ہر شہ میں تدریج،احتیاط،حزم،و تدبر کا کردار اہم رہا ہے، کون نہیں جانتا ہے کہ دھلی سلطنت کی رضیہ سلطانہ خاندان غلاماں کی ملکہ بن بیٹھی تھی مگر اس نے ان دو تین سال کی ملکہ گیری کے لئے کیا کیا مشکلات برداشت نہیں کیں؟،کون کون سی قیمت نہیں چکائی؟،کیسے وہ ایک حبشی غلام تک سے شادی کر بیٹھی تھی یوں عورت کی حکمرانی پر چراغ پا ترکوں نے اس جلد فارغ کردیا،چاند بی‌بی بلاشبہ قابل رہی ہوگی مگر اکبر نے اسے کیسے تمام صلاحیتوں کے باوجود ناکام بنادیا تھا۔

سیاست و قیادت میں مرد و عورت ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے جو کوششیں کرتے ہیں اس میں جتنا وقار و عزت عورت کا قربان ہوتا ہے اتنا مرد کا نہیں ہوتا ہے،مرد کے پاس یا تو جسمانی قوت،ہوتی ہے یا دولت ،یا پھر خاندان،عصبیت،تعلقات،صلاحیتیں اور سازش کا وصف ہوتا ہے۔

جبکہ عورت کے پاس سیاست میں یا کسی بھی مقابلے میں آگے بڑھنے کے لئے اسکا جنسی کارڈ نمایاں کردار ادا کرتا نظر آتا ہے،جسکی فروخت یا جسکا تبادلہ عمل وہ مرد سے ہی کیا کرتی ہے، جب کہ اسکے مقابل مرد ایک خاص غیرت و انا کا حامل ہے جبھی وہ اپنی جنس کو قوت مبادلہ کے طور پر ناہونے کے برابر ہی استعمال کرتا نظر آتا ہے،مرد کی جنسی قوت،جسمانی ہیت عورت سے الگ تھلک ہے ،جبھی اپنی طبیعی تخصیص کار کے سبب وہ اپنے کئی ناجایز و جایز تعلقات کے باوجود اپنی گناہی حیات چھپانے میں عموماً کامیاب رہتا ہے، ویسے بھی گناہوں کے بھی کچھ اپنے ذاتی درجات اور معیارات ہوتے ہیں،اللہ کے ہاں ہر جنس کو اپنے گناہ کا عذاب بھوگنا پڑتا ہے،لہذا اس دنیا کا ماحول ہی اخروی حقیقت کی کھڑکی ہے،جسے نظر انداز کرکے خیالی باتیں کرنا نسبتاً ایک آسان عمل دکھتا ہے، مگر بحرحال اس ماحول میں جو عمل روایات سے پروان چڑھ کر رواج کی شکل پاچکا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کے جسنی تعلقات کو کھل کر وہ قبول عام حاصل نہیں ہوتا ہے اسکے

برخلاف،اس ضمن میں معاشرہ مرد کے گناہ اور بدکرداری کو سات خون معاف کے قول کے مصداق خاص اہمیت نہیں دیتا ہے۔

یہاں ہماری اس بحث سے کوئی یہ تاثر قطعاً نہیں لے کہ ہم مردوں کو کھلی چھوٹ دے رہے ہیں کہ جو چاہے کرتے پھرو بلکل نہیں کیونکہ چھوٹ دینا نا دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو بھی ہمارے لئے حکم کرچکا وہ قابل تعمیل و عمل ہے،ہم دنیا داری کے معیارات اور اس میں رواج و روایات کی روشنی میں کچھ امور کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کررہےہیں جن سے یہ واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ جنسی اعمال کی تفریق کے لحاظ سے مرد و عورت کے جنسی اعمال و افعال کو یکساں طور پر نا ہی دیکھا جاتا ہے اور نا ہی کبھی پرکھا جاتا ہے ،اور اس کی بابت بڑی بوڑھیاں نوجوان لڑکیوں کو بہت کچھ سکھاتی سمجھاتی رہی ہیں اور کامیاب مردوں کی مائیں ایسی بڑی بوڑھیوں کے اقوال کی روشنی میں ازواجی حیات کی تشکیل کرتی رہی ہیں، اس میں موجود عدم مساوات کافی حد تک مذہب کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ معاشی،سیاسی،سماجی نظاموں کے تضادات کے سبب موجود ہے۔

ہمیں اس امر میں شک نہیں کرنا چاہئے کہ یہ بحث سرمایہ دارانہ،عالمی مسابقتی نظام کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے جس نے غلامی کو نشاۃ ثانیہ کے قایم کردار و تصورات کے خلاف جانکر،اس میں مذید وسعت وا متداد پیدا کرنے کے لئے اس نرم گرم،مزدور کو بھی مرد مزدور اور محنت کار کے مقابل سستے متبادل کے طور پر بروئے کار لانے کی کوشش کی تھی ، چناچہ جسے صنعتی انقلاب کے بعد فلسفیوں ،ریاستی و جمہوری قایم کردہ اقدار نے مذید وسعت دی تو عالمی ریاستوں کو اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب انسانی حقوق کے ذریعے انسان کی خدا اور مذہب سے آزادی کا قانونی عالمی راستہ نکالا جانا ضروری ہوگیا ہے۔

جسکے نتیجے میں مجلس اقوام اور مابعد اقوام متحدہ کی چھتری تلے ایسے پہ،در پہ معاہدوں میں اقوام عالم کو رعایتوں اور امداد کے ذریعےشامل کیا گیا اور جنکی مخالفت کی ان میں ہمت و استعداد نہیں تھی،اور جنھونے انکے مقابل ذرا سی بھی جرات دکھانے کی کوشش کی تو جواب میں انکی قوت و غیرت کو قوت،خوف اور مقاطعہ کے ذریعے توڑنے کی منظم کوششیں کی گیئں۔

آج سے قبل دور میں مرد و عورت میں قدرتی جنسی اختلاف کے باوجود تقسیم بندی کے لحاظ سے کبھی اپنی اور غیر کی جنسی تفریق موجود نہیں تھی،خاندانی نظام نے مرد و عورت کو ماں،بیٹے،شوہر بیوی،بھائی بھن،خالہ بھانجے،پھوپھی بھتیجے،نانی نواسے کے رشتوں میں محبت و اپنائیت سے صدیوں سے جوڑے رکھا ہوا تھا،اُس دور میں شوہر اور بیوی کے تعلقات میں یہ فکری بعد نہیں تھا کہ کوئی زمانہ قدیم اور ماضی قریب کی بیوی شوہر کی بدسلوکی کو انسانی حقوق کے مخالف، شخصیاتی اقدار کے خلاف یا اپنی جنس پر جنسِ مخالف کا حملہ یا زیادتی تصور نہیں کیا کرتی تھی۔

کیونکہ اس مرد کی ماں ،بہن،پھوپھو اور خالہ نے اسکی تربیت ہی ان اقدار پر قایم کی تھی کہ وہ مرد اس عورت کی اس سوچ کے عین مطابق سوچے جسکا درس یہ ہوکہ یہ تیرا مرد اور تیرا سربراہ ہے،

اس خاندان،شہراور ریاست کا سربراہ ہے،اور تو اسکے گھر،جسم روح کی ملکہ ہے،جبھی اگر وہ زیادتی بھی کرے تو صبر کر جب تو اسکے بچوں کی ماں بنے گی یہ ظالم مرد موم ہوجائیگا، اور دیکھنا یہ جلد اپنی غلطیوں کی بتدریج اصلاح کرتا چلا جائیگا ،باقی کوئی مرد ڈھیٹ اور ہٹ دھرم،ذہنی مریض ہو تو الگ معاملہ ہےعموماً مشاہدہ سے یہ محسوس کیا گیا ہے کہ مار پیٹ کرنے والے مرد کو بھی آہستہ آہستہ یہ احساس ہوجاتا ہے کہ اسے اپنے گھر کی عورت بلخصوص بیوی سے اب مذید ایسے ناروا سلوک نہیں کرنا چاہئے جن سے اس کی اور تیری انا مجروح ہوجائے،ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ عموماً ایسے قصصِ بیجا نچلے طبقے میں ہی عام ہوا کرتے تھے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور کے اعلی طبقہ میں عورت کو مرد اور اسکے خاندان میں خاص مقام حاصل رہا تھا۔

مرد اور عورت کے تعلقات میں دوری کی وجوہات عموماً مادی،معاشی،جنسی اور نفسیاتی پہلووں میں پنہاں ملتی ہے،اور یہ امور اسکے علاوہ خاندان،ماحول،ضروریات،احتیاجات،غیرت،معاشرت ،مذہب اور اخلاق پر مبنی متغیر اقدار سے بھی بنیادیں حاصل کرتی ہیں ،جبھی اس پیچیدہ جنسی اختلاف کو سمجھنے کی کوشش خالص عالمانہ بنیادوں پر کرنا ہی کسی محقق کو ذیب دیتا ہے،لہذا یہ کہنا کہ مرد ہی بدمعاش ،اور بدمعاملگی کی واحد وجہ رہا ہے اور عورت کا اس ساری بحث میں کردار اور افعال مجہول اور بلواسطہ رہا ہے جو درحقیقت عورت کو کمزور بنا کر سیاست کرنے والوں کا اقداری مقدمہ نظر آتا ہے۔

۲۔ اب جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ مردوں نے عورتوں کو صدیوں سے کنیز،باندی اور زرخرید لونڈی نما چیز بنا کر رکھا ہوا ہے،یہ اعتراض خالصتاً صدیوں سے دنیا میں بسنے والے مردوں کی نگاہ اور نیت میں شامل نہیں رہا ہے کہ عورت کو دشمن جان کر کوئی ظالمانہ اقدام سرانجام دیتا پھرے ،کیونکہ جس طرح عورت انسانی مجمع کا اہم حصہ رہی ہے اور اس سے مثالاً تالیاں بجانے کے ضمن میں ایک تالی کا کردار طلب کیا گیا ہے عین اسی طرح مرد کا کردار و تعلق بھی اس تالی بجانے کی مثال میں دوسری مقابل تالی کا رہا ہے جو ہیمشہ سے اسکا زوج اور اسکے جوڑے کا دوسرا حصہ رہا ہے۔ جو نئی نسل کی تخلیق میں ایک دوسرے کے ساتھ اذل سے اشتراک کرتے چلے آئے ہیں،چاہے وہ اشتراک ایک فعال جایز میاں بیوی کے روپ میں ہو یا پھر ،تقدیر کے طرف سے مقرر رشتوں کے روپ میں انکا تعلق برقرار رہا ہو، یا یہ کبھی بھن کی صورت میں بھائی کے ساتھ ایک ہی خاندان کا حصہ رہے ہوں تو کہیں باپ بیٹے،کے مقابل بیٹی یا بھن موجود ہوں ، عین ایسے ہی چچا کے سامنے بھتیجی،ماموں کے سامنے بھانجی،اسی طرح پھوپھی ،خالہ کے سامنے انکے پیارے بھانجے بھتیجے قدرت کی جانب سے رشتوں میں منسلک کردئے گئے ہوں۔

انسانی کُل کو جنسی اعتبار سے اگر مرد اور عورت ،لڑکا ،لڑکی،بچہ بچی،بوڑھا بوڑھی میں تقسیم کیا جاتا ہوتو وہیں اسکے ساتھ ساتھ ہر جگہ دونوں جنس ایک دوسرے کے سانجھے و رانجھے بنے نظر آتے ہیں،ان دونوں میں یہ جنسی و جسدی دوئیت پیدا کرنے والے دراصل انسانی خوبصورت رشتہ ناطوں میں نفرت و عناد پیدا کرنے کی منظم کوشش کررہے ہیں اور یہ گھناونی منظم کوشش جو اس کھیل میں آج کل کھیلی جارہی ہے دراصل ہمارے خاندانی رشتوں کو ملیا میٹ کرسکتا ہے،خاندانی

نظام جیسی حسین و عمدہ شہ کو بس دو طرفہ تعلقات اور مفادات میں مقید کرکے رکھ سکتا ہے، اور جس سے جتنا بچا جائے اتنا ہی بھتر ہے۔

اس میں شک کی گنجایش نہیں پیدا کرنی چاہئے کہ مرد دوسروں کے لئے ہمیشہ سے جتنا چاہے ظالم وجابر و آمر ہو اسکی بیٹی،بھن،بھتیجی،بھانجی،پوتی،نواسی یا بھو اسکے لئے کوئی مفت کا مال نہیں ہوتی ہیں بلکہ عزت وقار،افتخار اور غیرت کا سامان ہوتی ہیں،جنکے لئے قدیم قبایل اور معاشرے باہم دست گریبان رہے ہیں ، اور انکی عزت پر ہاتھ ڈالنا مرد کی غیرت،قبیلے کی غیرت اور ریاست کی غیرت پر ہاتھ ڈالنا سمجھا گیا ہے،بڑے بڑے طرم خان بازار میں جتنے شیر بنے رہتے ہوں اپنی بیوی کے بستر پر بیوی کے عاشق اور ماں کے سامنے اسکا فرمانبردار بیٹے کی صورت میں نظر آنا عام بات رہی ہے،جنگیں جہاں ان کے سبب شروع ہوسکتی تھیں تو وہیں انکی پھیلی چادریں جنگلی سے جنگلی قبایل میں جنگ رکوا کر صلح کرواسکتی تھیں۔عرب کے چند جاھل بدو جو بیٹی کو غربت و غیرت کے سبب ہلاک کردیتے تھے،وہ نا تعداد میں کل مرد معاشرے کے عکاس رہےتھے اور نا ہی اس وقت یا کسی وقت کے مہذب معاشرے نے اسکے ان اقدام و اعمال کو وسیع القلبی سے قبول کیا تھا،یہ چند معدودے واقعات تھے جنھیں کل معاشرے کی وسعت پر وسیع کرکے لعن و طعن کا بازار گرم کرنا جایز عمل نہیں ہے کیونکہ یہ نمونے گنتی میں شاذ ونادر ہی جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔

مکہ،مدینہ،طایف جیسے شہروں کی عورتوں کی سماجی حیات عزت و وقار یقین جانو کافی حد تک معقول تھا،زمانہ قدیم،کی خدتیجہؓ ہوں یا ہالہؓ،ہندہؓ ہوں یا ام جمیل ملعونہ،ام افضلؓ ہوں یا اروی بنت کریزؓ ان سب کی قریش میں کچھ نا کچھ سماجی رفعت موجود تھی، اسی سماج کی خواتین مابعد اسلام نبی اکرمؐ کی ازواجکے روپ میں امھات المومنین کہلائیں،عایشہؓ کی عزت و وقار امت میں کیا ہے چھوڑیں انکے جو نخرے ہمارے پیارے نبی اٹھاتے تھے اللہ کو انکا کتنا خیال تھا قران اسکا گواہ ہے۔

۳۔جہاں تک تک کنیز باندی،بنانے کا مسلہ ہے اس مسلے کی اصل بحث میں خواتین کو کوئی واحد متاثرہ فریق نہیں رہی ہے بلکہ سب سے اول کھلے میدانوں میں دوران سفر،میدانِ جنگ میں،بازاروں میں ،قرض میں،دشمنوں کے سامنے کمزوری کی حالت میں مرد ہی اول غلام بنائے جاتے تھے،جنگ میں جو فاتح ہوتے تھے وہ اگر مرد ہوا کرتے تھے تو مفتوح بھی میدان میں مرد ہی ہوا کرتے تھے،میدان جنگ میں ہاتھ لگنے والے شکست خوردہ سپاہی بھی مرد ہوا کرتے تھے،اور ان میں سے اکثر اسیرانِ جنگ جنکا فدیہ ادا نہیں کیا جاتا تھا یا جنھیں دشمن سپاہی کے ساتھ تبادلہ نہیں کیا جاتا تھا غلام بنالئے جاتے تھے،انکے ساتھ جیسا اذیت ناک ،انسانیت شکن سلوک روا رکھا جاتا تھا وہ سلوک،وہ درد، خودی کو وہ تکلیف دہ کچوکے لگاتا تھا کہ جسکا احساس عورت نہیں کر سکتی ہے،بلال حبشیؓ،عمار بن یاسرؓاور سلمان فارسیؓ نے ایمان کے لئے غلامی میں جو اذیت سہیں تھیں وہ تاریخ میں اتنی معروف ہیں کہ انکی وضاحت بس یاد تازہ کرنا ہی تصور کیی جائیگی۔

اسی طرح جن غلاموں کو محل میں حرم سرا کے لئے چنا جاتا جاتا تھا،انکے خصیے و ذکر تک کٹوادئے جاتے تھے،کہ کہیں وہ جنسی میل ملاپ نا کر بیٹھیں ،انکو خطاوں پر سزا دینے می نصرف مرد ہی آگے آگے نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ مرد کی بیوی،بیٹیاں،بھنیں وغیرہ بھی انھیں اپنی ملکیت

تصور کرکے تیسرے درجہ کا انسان تصور کیا کرتی تھیں،یاد رکھیں جس طرح مرد کنیز کا مالک ہوا کرتا تھا اسی طرح عورت بھی غلاموں اور کنیزوں کی خریدار،بیوپاری،مالکہ ہوا کرتی تھی،جبھی یہ کہنا کہ ظلم صرف عورت نامی جنس پر ہوا ہےقطعاً ایک غلط تاثر ہے۔

مرد و عورت کی ساخت،وظایف،استعداد کار میں فرق فطری و تخلیقی ودیعت شدہ ہے،انسان ازل سے کسی آسمانی راج،سامراج،معاشرت سے واقف نہیں تھا ،اس نے یہ سب باتیں یہ معاشرت،تعلقات، اور متنوع تخصیص کار ارتقا کے ساتھ ساتھ سیکھے ہیں،اور دنیا بھر کے معاشرے و ریاستیں کچھ قبایل سے ہٹ کر پدرسری نظام کے قایل و عامل رہے ہیں،سوائے چند ایک جنگلی قبایل کے ورنا قبایل کی اکثریت بھی بہ حیثیتِ مجموعی پدرسری نظام کے حامل رہی ہے ،ہاں افریقہ و ایشیا کے کچھ قبایل میں زمانہ قدیم سے تاحال مادرسری نظام کی بابت کچھ معلومات ہمیں میسر آجاتی ہیں۔

قدیم مرد نے جو ورثا اپنی نسل کو دیا اور جو بتدریج ارتقائی مراحل کرکے سب میں مشترک طور پر شامل رہا ہے وہ خاندان ،ریاست و سماج میں باپ،اور مرد کی سیادت کا معاملہ ہے جسے پروان چڑھانے میں اسی مرد کی ماں ،دادی،نانی،پھوپی،خالہ اور بہن کا بھی کہیں نا کہیں ایک خاص کردار رہا ہے،جنھونے خود اپنی ہم جنس خواتین کی دماغی تربیت میں بھی یہ امر ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تھی کہ :اسے ہماری بیٹی مرد و عورت ایک ہی بیل گاڑی کے دو پہیے ہیں،اگر مرد شوہر کی صورت میں حاکم و مالک ہے تو اسکی ماں لے روپ میں اسکے اوپر فایق ہے،کتنے ہی مردوں نے ریاست،سیادت ،دولت و حکومت کے خواب اس مامتا کی چھاوں میں بیٹھ کر اپنی آنکھوں میں بچپن سے سجائے جس مامتا نے اسکی تربیت کے دوران میں اسے یہ باتیں راتوں کی لوریاں میں تھپکیاں دے دے کر سکھائیں تھیں کہ تو گھر کی مالکہ تیرا مالک مرد رات کو حکومت کرتا ہے اور تو دن رات مالکہ بنی معاملات چلاتی رہتی ہے۔

ویسے بھی کبھی یہ مرد جب اپنی بیوی پر گرجتا برستا تھا،تو وہیں ماں،دادی،نانی،پھوپی اور خالہ کے سامنے دبتا بھی تھا،جنسی و جسمانی رشتے کسی منجمد پتھر کی طرح کی شہ نہیں ہیں بلکہ یہ پانی کی طرح کا مایا ہیں جو جس سانچے میں ڈالے جاتے ہیں وہی ہیت اختیار کر لیتے ہیں۔

سماجی ،خاندانی نسلی رشتے، تعلقات،عزت و احترام کے بندھنوں سے بندھے ہوئے ہوتےہیں جہاں اختیارات ایک جگہ مرتکز نہیں ہوتے ہیں بلکہ رشتوں کی تخصیص کار کے لحاظ سے منقلب ہوتے رہتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکی بیوی بنکر جب خاندان میں آتی ہے تو اسے اپنےشوہر ،ساس و سسر کی سیادت مانی پڑتی ہے برداشت کرنی پڑتی ہے، اور پھر جب خود اس کی اپنی اولاد پیدا ہوتی ہے تو اسکا اپنے شوہر سے بندھن و تعلق جنسی تعلق سے بلند ہوکر خاندانی تعلق تک رفعت اختیار کرنے لگتا ہے،پھر بتدریج عمر کے ساتھ وہ خود اسی گھر کی بڑی بن جاتی ہے،یہ ضروری نہیں ہے کہ اسکی کل حیات تک اسکا شوہر زندہ رہے،یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ زمانہ قدیم کے مرد جلد لڑائی جھگڑوں،جنگ و جدل میں زندگی کی قید سے فارغ ہوجایا کرتےتھے تو اسکی بیوی ہی خاندان کی بڑی جانی جاتی تھی،اور جب اسکی اپنی اولاد کم عمر ہو تو اور اسکی خاندانی سیادت دیگر مرد رشتہ داروں کے ساتھ بتدریج مسلم ہوتی جاتی تھی۔

جاہل سے جاہل اور طاقتور سے طاقتور سرکش گھوڑا اپنی ماں کا اسیر ہوتا ہےیہ سنہری جملہ کل تاریخ پر بھاری جملہ ہے جبتک خاندان و انسان ہیں یہ جملہ مضبوط و محکم رہے گا،،ہاں اگر یورپ کی نقل کرتے ہوئے ہمارا خاندانی نظام ، رشتے اور تعلقات عورت کے حقوق کے نام پر ملیا میٹ ہوگیا ہے تو سمجھیں یورپی تہذیبی روش ہماری سماجی تاریخ کو بھی لے ڈوبے گی۔

کوئی ایسی محقق تاریخ اور تاریخی نیت ہمارے سامنے موجود نہیں ہے کہ جو ہمیں یہ باور کراسکے کہ ماضی کا انسان صنفی مخالفت میں پیش پیش رہا کرتا تھا یا اس کیفکر میں باولا سودائی ہوجایا کرتا تھا،وہ نادان تو سمجھیں بس طاقت و اخلاق کی دھار پر چلتا تھا،معدودے چند افراد کے سوا،اس دور کا اخلاقی نظام عورت کو عزت و وقار اور غیرت کا تمغہ جانتا تھا اور عورت کی سلطنت خاندان کی سلطنت تصور کیا کرتا تھا، اور اسکا ماننا تھا کہ عورت ہی سماجی ،خاندانی نظام کی مہربان و دانا نگہباں ہے،ماں ،دادی ،نانی اور بڑی بھابھی ہی گھر کی لڑکیوں اور کم عمر لڑکوں کی تربیت گاہ ہیں،انکی تربیت کے بعد ہی بچہ ،بچہ سماج میں قدم رکھنے کے قابل ہوا کرتا تھا،جبھی جتنے قابل پیروی اخلاقی نمونے ماضی نے پیدا کئے ہیں انکا انکار آج کا کوئی باشعور بامطالعہ فرد نہیں کرسکتا ہے۔

لہذا ظلم کی چکی اپنے پاٹوں کو پیستے وقت مرد و عورت کی تخصیص کی قایل نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ مرد چونکہ جسمانی و سیاسی طور پر طاقتور جانا جاتا تھا اور بحث سے براہ راست تعلق رکھا کرتا تھا جبھی ظلم و جبر،قوت کے شکار کا اولین شکار بھی مرد یا کچھ حالات میں عورت کے ہاتھوں مرد ہی بنتا نظر آتا تھا،اسکا ایک ثبوت،جنگوں،لڑائی جھگڑوں میں مرنے والوں کی عظیم تعداد ہے ،جس کی فہرست مردوں کے نام سے بھری نظر آتی ہے،ہم یہ نہیں کہتے کہ سرے سے عورت کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار نہیں کیا جاتا تھا،بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انکی تعداد نسبتاً مردوں کے مقابل بھت کم ہوا کرتی تھی،اب یہ الگ معاملہ تھا کہ جنگجو ،ظالم جارح اپنے حملوں میں کھلے عام قتل عام میں جنس و عمر کی تخصیص کم ہی روا رکھتے تھے،جیسا کہ عصر حاضر کی فلموں و ڈراموں میں ان امور کی مبالغہ آمیز منظر نگاری بخوبی جا بجا دیکھی جاسکتی ہے،باقی جسکو ظلم کرکے مزا و لطف آتا تھا جو سادیت پسند،عزیت پسند نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہوا کرتےتھے تو وہ حضرات اپنے میلانات ،رجحانات افتاد طبع کے لحاظ سے جو انکو محبوب ہوتا تھا اسکو ظلم و جبر کا نشانہ بنا دیا کرتے تھے،ایسے افراد کو عموم میں شامل کرنا کوئی معقولی امر تصور نہیں کیا جانا چاہئے۔

۴۔ یہ اعتراض ایک کافی معقولی اور قابل تسلیم حالت کا مالک اعتراض ہے کہ عورت کو اسکا حق نہیں دیا گیا تھا،ہم یہ دیکھتے ہیں جہاں ایک طرف ترقی یافتہ مہذب معاشرے اور مذاہب میں عورت کو قبایلی و دیہی معاشروں کے مقابل نسبتاً زیادہ حقوق حاصل تھے،وہیں اسے شریک سفر کے انتخاب،جائیداد کا حق،دوسری شادی کا حق حاصل نہیں تھا ،سیاسی حق تو خیر ایک الگ امر ہے جسے خود جدید یورپی معاشرے بھی ایک صدی قبل رایج کرنے کے قابل ہوئی ہے ،انکی لاکھ اصلاحات و خواہشات کے باوجود بھی یہ حضرات وہ رنگ جمانے سے قاصر نظر آتے ہیں جسکے یہ متلاشی ہوتے ہیں تاحال امریکہ اپنی ریاستی سربراہی کسی عورت کو تمام آذادی اور انسانی حقوق کے دعووں کے باوجود عورتوں کے نام کرنے میں ناکام رہا ہےکبکہ اسکے برخلاف اسکی مقلد ریاست پاکستان

نے سربراہ حکومت سے لیکر قومی اسمبلی کے اسپیکر تک کی سربراہی عورتوں کو سونپ دی تھی،کل جنوبی ایشیا کی تین بڑی ریاستیں ،بھارت،بنگلہ دیش اور پاکستان کی صف اول کی سیاسی جماعتوں کی سربراہی اور حکومت عورتوں کے پاس رہ چکی ہے،ہندو مذہب جو ایک عظیم تہذیب کا مذہب جانا جاتا ہے میں عورت کو اگر چہ طبقہ اعلی میں کچھ سماجی رتبہ حاصل تھا وہاں بھی مرد پتی پرمیشور،گھر کا اندر دیوتا ہوا کرتا تھا، جبکہ دیوی ستی کی پورانی کتھا کی پیروی میں شاہی خاندان کی شادی شدہ رجپوت عورتیں ، اپنے فوت شدہ پتی کی چتا میں جل کر اسکے ساتھ اگلے جنم میں جنم لینے کی خواہش کے ساتھ جل جایا کرتی تھی،اگر چہ یہ کوئی باقاعدہ بڑے پیمانے پر رایج قابل عمل رسم نہیں تھی ،مگر پورانی قصص کی رو سے مہا دیو کی پیاری دیوی ستی کی قربانی نے وہاں کی عورتوں کے لئے وفاداری کی ایک اعلیٰ مگر ظالمانہ آدرش قایم کردی تھی۔

عرب میں عورت کو شہروں میں اگر چہ کافی عزت و وقار اور مال و ثروت حاصل تھی،مگر بہ حیثیتِ مجموعی بدووں کے ہاں بیٹی کی پیدایش ،حالت جنگ یا پھرغربت و افلاس کے سبب ناپسند کی جاتی تھی،بیوہ وارثوں کا مفت کا مال جانی جاتی تھی،متوفی کا بڑا بیٹا،بھائی یا کوئی اہل وارث اسے بھی اپنی ملکیت جانا کرتا تھا،وہ ایک سال تک سوگ منایا کرتی تھی،کئی جگہوں پر اسکا مقام بکروں کا باڑا ہوا کرتا تھا،جہاں وہ روکھی سوکھی روٹی کھاتی ،گندی شندی رہا کرتی تھی،جب عدت ختم ہوتی تو بکریوں کی سوکھی مینگنیاں اپنے پر سے اتار کرکے عدت ختم کرنے کا اعلان کیا کرتی تھی۔

جمہوریت و فلسفے کے آدرش یونان میں عورت کا گھر میں رہنا ہی بھتر تسلیم کیا جاتا تھا،اسکا اور غلام کا استھان گھریلو قید خانہ ہوا کرتا تھا،اسکا کام گھریلو کام کاج کرنا ،یا غلاموں سے کام لینا ہوا کرتا تھا،یا پھر وہ عموماً جنسی خواہش کا مخزن جانی جاتی تھی،مردوں کا کام باہر رہنا بحث و مباحثہ کرنا کم عمر لڑکوں سے دل لگی کرنا تھا،ایسا ہی رجحان آج ہمارے سندھ،پنجاب،بلوچستان ،خیبر پختون خواں اور افغانستان تک پھیلا نظر آتا ہے،کہ اوطاق میں کم عمر لڑکوں کو دل لگی کے لئے رکھا جاتا ہے،مگر کھل کر اس بات پر گفتگو نہیں کی جاتی اور نا اعتراف کیا جاتا ہے ،مگر اس قسم کی باتیں کہاں چھپا کرتی ہیں۔

روم کی عورت کو طبقہ اعلی میں آزادی حاصل تھی،جبکہ عام عورت وہاں بھی جنس لذت اور ،کام کاج کرنے کے کام آتی تھی،یا گھریلو امور کی سربراہ ہوا کرتی تھی،اسکی عزت و وقار کا تعین اسکے مرد کی سماجی،مالی اور سیاسی اہمیت کے تناظر میں ہوا کرتا تھا۔

ان حالات میں اسلام کا ارتقا گھوم کر آخری مراحل پر آکر ٹھیرااور اس نے صدیوں سے موجد عام عورت کے تمعلق ظالمانہ طور طریقوں اور رواجوں کا خاتمہ کردیا ،اسکے حقوق کو عین مرد کے مساوی تو جانا نہیں گیا مگر،کئی جگہوں پر اس عدم مساوات کو دیگر سماجی حقوق و مراتب سے بدل دیا گیا،جو اس دور کی ہی نہیں آج کی جدید جمہوری دنیا کے عروج تک ایک نفرد،یکتا اور معتدل آدرش کا درجہ رکھتے ہیں اسے (۱)مرد سے آدہی وراثت کا حقدار ٹھرایا گیا،اسے حق دیا گیا (۲) بیوہ ہے تو دوسری شادی کرے اور اپنی مرضی سے نکاح کرنے کا اسکا حق تسلیم کیا گیا،(۳)کنواری لڑکی سے نکاح کو مشروط کردیا گیا کہ اسکی رضامندی دریافت کی جائیگی وہ اپنے ولی اور امیدوارِ

نکاح دونوں کی بات کو قبول کرنے یا عدم قبول کرنے کی مجاز تسلیم کی گئی،(۴)انکے وٹے سٹے کی ممانعت کردی گئی،(۵)کنیزوں سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا،صاحبِ اولاد ہونے کی صورت میں انکو آزاد جانا گیا،(۶) عورت کو مرد کے گھر کا منتظم مانا گیا ،(۷)سماجی مذہبی رشتوں میں ماں کی تعظیم و وقار باپ سے دوگنا تسلیم کیا گیا ،(۸)اسکی عدت مختصر کردی گئی،(۹)جنسی ظالمانہ نکاحوں کو ختم کرکے ایک عورت کو صرف ایک مرد کی اجازت دی گئی تاکہ نسل ،و حسب و نسب کو محفوظ رکھا جاسکے(۱۰) شریعت نے حکم دیا کہ عورت کو بے راہ روی پر صرف ریاست ثبوتوں پر سزا دے سکتی تھی،عین یہی سزا مرد کےلئے بھی مقرر کی گئی،(۱۱)غیرت کے نام پر قتال کا دروازہ بند کردیا گیا،(۱۲)اس امر کی ممانعت کردی گئی کہ سوتیلی ماں سوتیلے بیٹے یا کسی شوہر سےمحرم کی نا تو ملکیت بن سکتی تھی اور نا اس سے نکاح ممکن تھا،(۱۳)اسی طرح بیوہ کے لئے شوہر کی وراثت سے حق مہر کے ساتھ ساتھ اسکا آٹھواں حصہ بطور میراث تسلیم کرلیا گیا۔

باقی پاکستان ہو یا مسلم دنیا کے کسی ایسے ملک میں جہاں بھی عورت کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا ہے،اسکو وٹہ سٹہ کیا جاتا ہے،غیرت کے نام پر قتل کیا جاتا ہے،اسکو کنوارہ بٹھایا جاتا ہے،قران سے نکاح پڑھوایا جاتا ہے،اسے تعلیم سے محروم کیا جاتا ہے،بیجا ذد وکوب کیا جاتا ہے،کاروکاری کیا جاتا ہے ان سب امور کا اسلام سے نا تو تعلق ہے اور نا ہی اسلام کسی صورت میں یہ ناجایز حرام اور غیر شرعی حرکات و سکنات تسلیم کرتا ہے،نا انکی پشت پناہی کرنے کی جازت دیتا ہے۔

لہذا لبرلز بھلے بیرونی ہوں یا اندرونی انھیں دیگر ادیان اور اسلام کی تفہیم،پس منظر،مبادیات،شرعی اصول و فروع ،نصوص ،میں تفریق روا رکھنی چاہئے اور اسلام پر تنقید سے قبل جہاں ان امور کو سمجھنا چاہئے وہیں ساتھ ساتھ ماضی اور حال کی تفریق کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اگر انکو محسوس ہوتا ہے کہ اسلام عصر حاضر کی ترقی کا ساتھ نہیں دے پارہا ہے جیسا کہ ان کا ذاتی دعوی و گمان ہے تو اس بھث میں یہ بھی دیکھا جائے کہ کس حد تک مقامی ریتی روایات،ثقافت، کا ان خرابیوں پر اثر و نفوذ رہا ہے ساتھ میں جانچا جائے کہ دیگر ادیان و تہذیبوں کے اثرونفوذکا ان معاملات میں کہاں تک ہاتھ ہے مذیدِ براں متعلقہ کرداروں،مجرموں،ملزموں اور متاثرین کا واقعہ و حادثے کے پس منظر کے تناظر میں یہ غور وفکر کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ کس تعلق و مقام کی مناسبت سے ان امور کو بھی مدنظر رکھا جائے تاکہ غلطی کہاں ہورہی ہے کا مداوا کیا جاسکے اور مذہب اسلام کے علاوہ اور کون سے عوامل ان کی من پسند اقدار کے سامنے روڑے اٹکارہے ہیں،کو زیر بحث امور سے خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اب ہمیں اس بحث کے دوسرے رخ کو بھی فراموش کرنے سے آنکھیں نہیں چرائی چاہئیں کہ کیا عورت کا عصری مقام ،انکی مشرقیت ،مذہبیت اور اسلام کی طرف جھکاو کیا ترقی کے خلاف ہے تو پھر جواب میں یہ بھی بیان کی جائے کہ درحقیقت یہ موئی ترقی کیا چیز ہے؟ کیا ایک قدر ہے؟، کیا ایک معیار ہے ؟ تو کس چیز کا ؟ ،یا تہذیب کو جانچنے ،ناپنے کا کوئی پیمانہ ہے؟ اگر ہے تو کس تہذیب،ریاست،قوت نے اسکو یہ قدر،اہمیت،چلن،رواج اور معیار دیا ہے کہ دیگر اقدار کو اپنی قدر سے زیر کرکے ان پر بالائی ہاتھ رکھ سکے؟ کس نے اسے بنا کر،تخلیق کرکے ،نافذ کرکے کیونکہ کس بنیاد پر یہ حق دیا کہ دیگر تہذیبی حقوق انفرادیتوں ،صداقتوں کی نفی کرتے پھریں؟ دراصل یہ کل

بحث و اقدار سامراجی مغرب کی سیاسی بالادستی کی دین ہے باقی یہ پیمانے کیا آسمانی وحی کی دین ہیں؟ بلکل نہیں کیونکہ آسمانی وحی میں اتنی مادیت کی گنجائیش کا خیال تک موجود نہیں ہوتا ہے جو انکی من چاہی ترقی کی ڈرامہ بازی کو الوہی جواز فراہم کرنے کے لئے کوئی سند عطا کرسکے، کیونکہ ہمارے عصری اقدار اس نشاۃ ثانیہ کی پیداوار ہیں جو اٹلی سے یورپ میں پھیلیں اور جنھونے فنون ،فنون لطیفہ ،کاروبار،تجارت،بینکاری اور تعمیرات کے لئے فلسفیانہ جواز فراہم کئے اور جنکی پیروی بتدریج بعد ازاں کل یورپ نے کی، پھر جس میں ،یورپی اقوام کے درمیان باہم منڈیوں،راستوں،علاقوں،نا آبادیوں کے لئے باہمی جنگ نے اسے اتنی وسعت دے دی کہ انکی یہ باہمی جنگیں، کل دنیا پر یورپی اقتدار کی وجہ و سبب بن گئیں،یوں استعماری نظام کی نئی جدید داغ بیل ڈالی گئی،انسان کو ہی حق باطل کا پیمانہ مان کر اقدارکی تعمیر و تشکیل کی گئی،خدا ،وحی ،رسالت کو راسخ عقیدہ جاهل انسانوں کی اقدار مان لیا گیا،خدا کو گھر تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی،یا کہا گیا کہ یہ سب عوامل اور وجوہات انسانی ترقی کی راہ میں حایل ہیں ،یوں ترقی حق و باطل کو جانچنے کا ایسا پیمانہ بن گیا جسکی بنیاد مذاہب کی کی نفی،شکست و ریخت پر رکھی گئی ،اسکے تصورات و اقدار کو خود ساختہ کہہ کر دامن چھڑالیا گیا اور اب اسلام و مشرق سے کہا جارہا ہے کہ انسانی حقوق ،جمہوری سیاست اور حقوق النسا کے بغیر تم کبھی ترقی یافتہ نہیں کہلائے جاسکتے ہو،جیسا کہ برنارڈ لیوس اور ہنٹنگٹن کی تحریروں سے ایسے معنی و مفہوم اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

چناچہ عصر حاضر کی جدید تاریخ کو اب معاشی،ثقافتی،اور استعماری بنیاد پر لکھا جانے لگا ہےتاکہ استعماری قوتوں کی جابرانہ حکومتوں، اور انکےعالمی غلبہ کا اخلاقی جواز فراہم کیا جاسکے،غلام و محکوم اقوام کو یہ باربار یہ باور کرایا گیا ہے کہ اب تک تم جہالت و اندھیرے کے دور میں زندہ تھے،اب نیا دور شروع ہوا ہے جو تم کو جہالتوں سے نکال کر روشنی میں لےآیا ہے ،ہم تم پر سختی و غلبہ تمہاری بھلائی کے لئے قایم کررہے ہیں،تم چھوٹے چھوٹے کارخانوں کو چلاتے ہو،کھیتی باڑی کرتے ہو،تمہیں زمانے کے ساتھ اگر ترقی کرنی ہے،تو ہمارے لئے اپنی منڈیاں کھولنی ہونگی ،ہم تمہارے خام مال سے دنیا کو روشناس کروائنگے،یہاں اسکو نئی جدید شکل عطا کرکے بیرونی منڈیوں میں بھیجیں گے،تم بھی کماوگے ہم بھی کمائینگے۔

مگر ہوا کیا وہ مشرق جو ہزاروں سال سے ترقی یافتہ امیر خوشحال،دولت کی دیوی سمجھا جاتا تھا،غریب ہوتا گیا،اور یورپ امیر ہوتا گیا،مشرق کا خام مال کوڑیوں کے دام بکتا گیا ،محنت کشوں،کسانوں سے رات دن کام کرواکر انکے ہاتھوں میں چند کوڑیاں زندگی کی،لهر برقرار رکھنے کے لئے ڈال دی جاتی تھیں،اور بیرون ریاست خام اور تیار شدہ مال مہنگے داموں بیچ دیا جاتا تھا اور اگر کسی نئی ہیت میں ڈھال کر پروسس آئیٹم کے طور پر برامد کیا جاتا تھاا تو صنعت کار امیر تر ہوتا جاتا تھا اور غریب غریب تر ہوجاتا تھا،محکوم اقوام کو کچھ اس طرح کی لولی پاپ دی گئی کہ تمہاری یہ حالت تمہاری ماضی کی حالت و تاریخ سے بدرجہا بہتر ہے،ابن قاسم ،محمود ،سلاطین دهلی،اور مغل سب مفاد پرست مجارح و غاصب تھے،صرف ہم ہی مبنی بر حق حکمران ہیں،ہندووں کو باور کرایا گیا کہ آریا قبایل اور تم حقیقی دھرتی کے سپوت ہو،مسلمان ہر روپ میں جارح،لٹیرا ،جاهل ،کمین و خبیث تھا،جبھی تمہیں اگر ان سے ماضی کا بدلہ لینا ہے تو اس کے لئے ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔

جبھی چپ چاپ رہو ورنا ہمارا وکھڑا ڈنڈا تمہیں سیدھا کرکے رکھ دے گا،اب یا تو شرافت سے ہمارے بن جاو ورنا ہم ڈنڈے سےمار مار کر تمہیں اپنا بنا لینگے،اپنا ماضی،اپنی تاریخ ،اپنا تمدن اب بس ماضی کا قصہ جانو،ہمیں ہی اپنا حال اور مستقبل جانو،ہم سے ترقی کا پاٹ سیکھو تاکہ دیگر اقوام کے شانہ بشانہ چل سکو،تم صدیوں سے گدھے اور الو کی عقل و شعور کا مجموعہ رہے ہو،جبھی اپنی زبان ،چھوڑو،مذہب چھوڑو،ہماری زبان،ہماری تہذیب،ہمارا تمدن اپناو،اور ترقی کرو،کل تم تاریخی اندھیروں و گمراہی گم تھے آج ہم تم کو روشنی میں لے آئے ہیں۔

خیر یہ باتیں کرنے والی ہماری ماضی کی آقا برطانوی قوم بھی اب ایک سامراجی تاریخی قصہ بن چکی ہے مگر انکی زبان تہذیب،اقدار،ثقافت،افکار و رجحانات آج بھی ہماری ان جامعات کے دم پر آج بھی بھی زندہ جاوید ہیں جنھیں انھونے ہماری مسلسل تشکیل اقدار کے لئے قایم کیا تھا،لہذا ہم برطانوی دور سے زیادہ آج انکے زیادہ ذہنی غلام بنتے جارہے ہیں جسکے لئے جدید سرمایہ داری نظام کی خاص اصطلاح ترقی اہم کردار ادا کرہی ہے،ہر سال،ہر عشرے کوئی نیا معیار ،معاہدہ اور ،عالمگیر رجحان ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ شماریات کے فلاں فلاں اعداد و شمار کی رو سے ہم دوسروں سے اتنے اتنے پیچھے ہیں،اور اتنا اتنا آگے بڑھنے کے لئے ہمیں مطلوب ہے،جبھی اس معیار کے لیے سرمایہ اور علمیت نہیں ہے تو اتنا اتنا خرچ تربیت و بنیادی ڈھانچہ پر آئیگا، اب یوں کرو کپ سرمایہ کار کو اتنی اتنی مراعت دے دو،یہ یہ بیچ دو،ورلڈ بینک،آئی۔ایم ایف، تمہیں اتنے اتنے شرح سود پر قرضہ دینگے۔ مگر سوچ لو کہ بدلے میں تمہیں انکی ان ان شرایط و حکم کو پورا کرنا ہوگا،یوں یہ ترقی کا پیمانہ عالمی طاقتوں اور اداروں کے حکم پر نئی ایجادات،ٹیکنالوجی،علوم،و فنون کی نئی شکلوں اور امتداد کے سبب گھومتا رہتا ہے،اور ہماری غلامی،فکر اور بزدلی اور مرعوبیت بھی ویسے ہی اس چرخی پر گھوم کر پرانی ہوتی جاتی ہے، پرانی ترقی کی جگہ نئی ترقی کی اقدار جگہبنا لیتی ہیں، سمجھو کہ اگر کل پینٹ چھوٹی تھی تو پرسوں ایک انچ بڑھ جاتی ہے،پھر پانچ انچ گھٹ جاتی ہے، کبھی سینہ کھل کم کھلتا ہے تو کبھی بند ہوجاتا ہے،اب یہ ترقی کا حکم ہے،کہ کل سینہ کھولنا ترقی کی علامت تھی مگر آج ایک انچ بٹن بند کرنا ترقی جانی جاتی ہے غرض یہ کہ ترقی ہر پل تبدیلی،چینج،وسعت کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔

اب آئیں جدید تہذیب یا اسکی اولیں بنیادوں کی طرف یہ وہ تہذیب ہے جو عیسائیت ،یہودیت اور الحاد کے ملغوبہ سے تیار ہوئی ہے جس میں درون خانہ اسلام و توحید سے خاص قسم کی نفرت و عناد شروع سے ہی موجود ملتا ہے،حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اسلامی شریعت کی تربیت یافتہ تہذیب سے قبل توحید اس قدر خالص ،کامل،اور عمدہ شکل میں کبھی نہیں رہی تھی ،جبھی تمام انبیا کرام کے تربیت یافتہ صحابہ کرام اور اہل توحید ہمیشہ بھت قلیل تعداد میں رہے ہیں ،بنی اسرائیل کی شروع سے آج تک کی تاریخ ،الوحی کتب اور سینہ بہ سینہ روایتیں انکی کج روی سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں،جگہ جگہ وہ اپنے انبیا کرام کے لئے مسایل کھڑے کرتے رہے تھے اور انکی شہادتوں تک میں جری رہے تھے،ذکریاً،یحییؑ اور عیسیؑ اسکی کھلی مثالیں ہیں ،یہی بدبخت عیسی کی مصلوبی کی سازش میں پیش پیش رہے ہیں انھونے ماضی میں موسیؑ،شیموئلؑ،طالوتؓ،داودؑ اور سلیمانؑ کو مسلسل تکلیف و مشکلات کا شکار کرے رکھا،انکی کتب سماوی وقت کے ساتھ مٹ گیئں تھیں اور جو آج موجود ملتی ہیں وہ

الحاق شدہ،ترمیم شدہ اصلی و حقیقی تعلیمات سے بہت حد تک مختلیف و تحریف شدہ ہیں ،ہاں اسی تحریف میں کچھ جگہوں کی اصل محفوظ ہیں جو قران سے کہیں کہیں مطابقت کھاتی ملتی ہیں۔

بنی اسرائیل کے رہبان و فقہا بلا شریعت انکو جہاں چاہئے ہانکتے رہے تھے، اور یہ انکی تابعداری میں ہانکے جاتے رہے تھے مگر یہاں بھی ڈنڈی مارنا انکا معمول بن گیا تھا،اب جب عیسائی انکے وارث بنے تو پال نے انھیں کافر اقوام کے عقاید کا ملغوبہ دین اچھا بنا کر دکھایا،عیسیٰؑ کے تربیت یافتہ حواریوں کی تعلیمات کی ترویج انکے مقابل پال کی محنت و جستجو کے سبب کم ہوئی اور پال کی رہبانیت زدہ عیسائیت پھلتی پھولتی رہی،شروع شروع میں عیسائیت میں توحیدی رنگ یہودی اثرات کے سبب موجود تھے،اتنا انحراف واقع نہیں ہوا تھا،مصر کے ارئیس کی تعلیمات میں بھی کافی حد تک اقنام ثلاثہ کی مخالفت موجود ملتی تھی مگر قسطنطین کے قبول عیسائیت نے خداوند ثلاثہ کے ماننے والوں کو ریاستی تحفظ فراہم کردیا،جس سے اتھنائیسس مضبوط ہوتا گیا اور ایریس کمزور ہوتاگیا،مگر بحرحال افریقہ میں اسکی باقیات نبی اکرمؐ کی بعثت تک بھی موجود تھیں ،قیاساً نجاشی اور اسکے کچھ درباری ان امور سے واقف تھے۔

یہی ورثہ اور وراثت جب پوپ کی تنظیم کلیسا تک پہنچا تو انھونے اسے مزید کفر،شرک،بت پرستی کی طرف جھونک دیا،اب کلیسا اور پوپ جو کہتے وہی شرعی قانوں مانا گیا،انھونے عورت و مرد پر کافی قدغنیں لگادیں،انسانی فطرت کے خلاف اصول وضع کردئے ،رہبانیات کو محبوب قرار دیا جانے لگا،نکاح کی حوصلہ شکنی کی گئی بعد میں جب انھیں اندازہ ہوا کہ کہیں اسکی وسعت سے عیسائی نسل اور عیسائیت ختم نا ہوجائے، یوں نتیجتاً کلیسا کے تابعدار کم ہوتے چلے جائینگے،ایمان تو کمزور ہوگا ہی ہوگا،کلیسا کی جائیداد ،و آمدنی بھی کم ہوجائینگی اور اس طرح نکاح،کاروبار ،تعلیم و تعلم کی سرگرمیوں بھی ان سب سے متاثر ہونگیں۔

لہذا مردوں کو پابند کردیا گیا کہ کوشش کرو کہ ایک ہی شادی کرو،اور طلاق دینے سے پرہیز کرو،طلاق کی اجازت کا طریقہ کار مشکل بنادیا گیا،کلیسا کے مقامی بشپوں،اسقفوں،اور کلیسا روم کی اجازت نکاح و طلاق میں لینا لازمی قرار دے دی گئی۔ایک بڑی تعداد شادی سے منحرف ہوکر کلیسا ،دیروں اور عبادت گاہوں سے وابستہ ہوگئی ،جو کہنے کو تو شادی نہیں کرتے تھے ،مگر ان میں سے اکثر پس پردہ حرام جنسی تعلقات قایم کرتے رہتے تھے،حرام بچوں کی ہڈیاں اور باقیات اکثر و بیشتر میدانوں اور ویرانوں سے دریافت ہوتی رہتی تھی،جنکے ماں باپ کا اتا پتا نہیں ہوتا تھا اور انکے عمارتوں کے دور دور تک کوئی آبادی بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔

بعد ازاں مسلم فتوحات تک یہ معاملات چلتے رہے پھر جب مسلمانوں سے انکا تصادم ہوا اور چرچ کی آنکھیں کھلی تو کچھ اصلاحات کی گئیں مگر کفر و شرک،نذر و نیاز،نوٹ کمائی کے معاملات

مذہبی چھتری تلے ویسے ہی چلتے رہے جیسے ہمارے آج کل مزار اور پیر اپنے دھھندے چلاتے نظر آتےہیں۔

اس تاریخی اور سیاسی حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ پاپائی ریاستیں اطالیہ و یورپ کی عظیم ترین دولت و جائیداد کا گڑھ بن گیئں تھیں،جب صلیبی جنگیں رونما ہوئیں تو یورپ نے مسلمانون کا کردار دیکھا ،انکی تہذیب و تمدن دیکھا ،وہاں مردوں کی نگاہ میں عورت کے عزت و وقار کو دیکھا تو ،اعلی طبقوں میں انکی عورتوں کا مقام بھی بلند ہونے لگا، مگر من حیث المجموع ۱۵۱۷ کے لوتھری انقلاب و بغاوت کے بعد اور اطالیہ کی نشاۃ ثانیہ نے کلیسا کی کمر توڑنا شروع کردی تھی ،اب تک کلیسا کی جو پابندیاں عاید تھیں وہ آذاد توریت ،انجیل و تالمود کے مطالعے نے مذید کم کردیں لوگوں کو اندازہ ہونے لگا کہ ہمارے پاس کوئی کلاسک ،فقہ،احادیث کی طرح کی شہ موجود نہیں ہے، اور جو کچھ ہے وہ بس کلیسا کی مرضی و منشا ہے جسے وہ وحی اور خدا کی رضا کے نام پر پیش کررہا تھا۔

جب انجیل کی قسمیں لاتعداد ٹھریں،عیسیٰ کے احکامات کا کوئی مستند ماخذ ہی ان پر وحی شدہ ثابت نا ہوا،اور چرچ پال کا قایم کردہ استحصالی ادارہ ثابت ہوا تو کل عیسائیت پر سوالیہ نشان کھڑے ہونے لگے تو اس تناظر میں ملحدین اور اباحت پسند،نراجی طبقہ ابھر کر سامنے آیا جو روز مذہب پر حملہ کرنے اپنا اخلاقی فریضہ سمجھنے لگا۔

انھیں محسوس ہونے لگا کہ اب وقت آگیا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں موجود شکوک و شبہات کو منطقی ہوا دیکر مذہب کو یورپی تمدن اور حیات سے خارج کردیا جائے،دینی عالموں کی کمزوری کاکردگی،ظلم و جبر ،استحصال کو ہوا بنا کر پیش کیا جائے ،اگر ایک انچ کا جرم ہوتو اسے سوفٹ کا جرم بنا کر پیش کیا جائے،چونکہ مغربی سامراجیت کل معلوم دنیا میں کسی نا کسی شکل میں موجود تھی،لہذا ان سب میں بہت سے پہلو یورپی عیسائی تہذیب و تمدن کا حصہ ہونے کے سبب سب جارح،جابر ،استعماری قوتوں میں در آئے سب نے ہی کلیسا کو بھلے کیتھولک فرانس ،اسپین،پرتگال کا ہو یا پروٹسٹنٹ،ہالینڈ کا ہو یا پھر چرچ آف انگلینڈ اور امریکہ ہوں کو محدود و مقید کردیا اور انھیں پابند کردیا کہ چرچ کی چار دیواری تک محدود رہو،ریاست کے تابع رہو ،ریاست سے تصادم سے گریز کرو،ورنا ریاست اسکی جگہ تمہیں کامل مقید،محدود اور ختم کرنا بھی جانتی ہے،مردوں کی سرمایہ داری کو اب علم نفسیات،جنسیات،جمالیات،اور حیاتیات جیسے علوم و تحقیقات نے یہ باور کرادیا کہ چونکہ سرمایہ عالمی انتقال پذیر شہ ہے،اور سرمایہ داری بھی عالمی نوعیت کی حامل ہے،اور یہ دنیا آٹھ دس طاقتوں کے درمیان براہ راست یا بلواسطہ تقسیم ہوچکی ہے، لہذا اب منڈیاں کھلی ہونی چاہیں،تخصیص کار کو فروغ دینا چاہئے،اور سرمایہ محکوم ریاستوں سے خام مال کے ساتھ تیزی سے قابض ریاستوں کے بینکوں،انشورینس کمپنیوں،اسٹاک ایکسچینج تک وسعت پذیر ہونا چاہئے۔

چناچہ غلام ذہنوں کی خاص پیرائے میں ایسی تربیت کی جائے کہ جسکا نتیجہ جسدی غلامی سے زیادہ روحانی اور فکری غلامی کی صورت میں آزادی کے بعد بھی قایم و دایم رہ سکے،لہذا غلامی

کی اب چونکہ خاص ضرورت نہیں رہی تھی لہذا،اسکا نعم بدل سامراجیت اور اسکے ذیل تہذیبی،فکری غلامی پیدا ہوچکے ہیں ،،اور چونکہ ہم نے انسانی خدائی کا اعلان کردیا ہے،لہذا انسانی حقوق کے فلسفہ کے تحت مردوں اور عورتوں کو غلام و کنیز بنانے کو بتدریج ختم کیا جائے،یہودی سرمایہ دار آہستہ آہستہ اپنی قوم کی آزادی اور تحفظ کو ان اصلاحات کے ذیل تحفظ فراہم کررہے تھے،چناچہ انکا منصوبہ تھا کہ فلسطین کے قبضے تک تمام عالمی طاقتوں کو اپنے فکری و سرمایہ دارانہ دایرہ کار میں لاکر زیر ذمین منصوبے کو تیزی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے،چناچہ سرمایہ کو سرمایہ ہی پیدا کرتا ہے،لہذا عالمی طاقتوں کو قرض فراہم کئے جائیں جیسے اطالیہ کے میڈیچی،اپنے بینکاری نظام، اور اس میں محفوظ سرمایہ سے پوپ سے لیکر اطالوی نشاۃ ثانیہ تک سب کو متاثر اور زیر دست بنا رہے تھے ایسے ہی روتھ شایلڈ اور راک فیلر گروپ بھی یورپ تا امریکہ اپنے سرمایہ کو ریاستوں کو بھاری شرح سود پر قرضہ دیکر متاثر کرنے لگے تھے حد یہ کہ سلطنت عثمانیہ بھی سلیمان اعظم کے آخری دور سے ان سے قرضے مجبوری میں لیتی رہی تھی جو ترک اختتام تک جاری رھا،اور سلطنت عثمانیہ میں فری مینسنز کا ایک بااثر ایشیائی لاج ایک گرینڈ ماسٹر کے زیر سایہ زیر ذمین کام کر رہا تھا ایسے ہی روس کے زاروں تک انکا اثر جا پہنچا تھا ،یہ عام و خاص اشرافیہ کو ایسے ہی متاثر کیا کرتے تھے جیسے ،ٹاسٹائی کے وار اینڈ پیس کا مرکزی کردار پرنس پئیر انکے دام تزویر میں کچھ عرصہ رہا تھا۔

خیر سرمایہ سے جہاں ایجادات ،ٹیکنالوجی اور صنعت کاری اور رسل و رسائید میں سرعت سے ترقی ہوئی وہیں ان صنعتوں اور ان سے منسوب اداروں کو بھی افرادی قوت کی ضرورت محسوس ہوئی تو عورت کو جو زراعت کی قید سے نکل کر اب روزگار کے لئے خاندانی نظام ٹوٹنے کے سبب چوراہے پر آکر کھڑٰی ہوگئی تھی کو مرد کے شانہ بشانہ کھڑا کردیا گیا،وہ دلفریب بھی تھی،جنسی مزے و ہوس کا سامان بھی تھی،اور اب مرد کی قید سے آزاد اپنے فیصلوں میں خودمختار بھی تھی،تو اسے مرد سے کم نرخ پر روزگار دیا جانے لگا،یوں بچا کچھا خاندانی نظام بھی باقی نا رہا اب یہ حالت انقلاب فرانس سے قبل بھی کافی ابتر ہوچکی تھی،ادیب،فلسفی اور منچلے بے چین ادھر ادھر منہ مارتے پھرتے تھے جیسے روسو کا حال تو سبط حسن بڑی وضاحت سے پیش کرچکے ہیں ،وہ کھاتی پیتی عورتوں کا دم چھلا بنا رہتا تھا،ایک سے اچھل کر دوسری کی گود میں جا بیٹھتا تھا،جیسا اسکا بچپن گزرا اس سے برا اس نے اپنی جاھل بیوی سے پیدا شدہ بچوں کے ساتھ سلوک کیا کہ اپنی حیات میں ہی انھیں یتیم خانہ بھجوادیا،یہ اسکی ایسی رومانیت بازی تھی جو حالت فطرت کا اتنا تقاضہ بھی پورا نا کرسکی تھی کہ کم از کم اپنے بچوں کی بقا کہ لئے درندوں سے ہی لڑ جاتا۔

خیر سرمایہ دارنہ انقلاب کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت،دستکاری،فنی ندرت طبع ،بینکاری،حصص بازاری، انشورنس ،ہوائی بحری ذمینی ذریع نقل و حرکت،عمارتی و ریاستی تعمیراتی ڈھانچے کے شعبوں میں وسعت وسرمایہ کاری نے ایجادات کو پر لگادئے ،کم سے کم وقت میں پیداوار کے لئے ایجادات کی بڑھوتری نے موجدوں ،سائینسدانوں کو جدید صدی کا پیغمبر بنادیا،انھی شعبہ جات میں پیداوار و خدمات کے شعبہ پہلو بہ پہلو پیدا ہوئے تو خدمات کے شعبے میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جانے لگی یہاں تک کہ اب تو اکثر ملازمتیں صرف خواتین کے نام کی جاچکی تھیں جیسا آج کا حال ہے،اسکے باوجود آج مسلسل یہ آواز اٹھتی رہتی ہے کہ عورتوں کو مردوں کے مقابل کم

روزگار کے مواقع حاصل ہیں،خیر انیسویں اور بیسویں صدی کے کلاسک دور میں تو یہ حال تھا کہ شہر کام کرنے والوں کی تلاش سے بھرنے لگے تھے،فیکٹریوں میں عورت و مرد باری بارہ گھنٹے کام کیا کرتے تھے ،کہیں کہیں تو بلا تعطل یہ اٹھارہ گھنٹے بھی ہوجاتے تھے،ایسے میں جدید عورت کی جانب سے آواز اٹھنی شروع ہوئی کہ انھیں سیاسی نمائندگی کا حق بھی دیا جائے ،انکی پیشہ ورانہ نشستوں میں اضافہ کیا جائے،انھیں جامعات کی ملازمتوں ،تحقیقی مراکز میں جگہ دی جائے خیر سرمایہ دار،جنس پرست نشاۃ ثانیہ کے لئے یہ کوئی بڑا مطالبہ نہیں تھا انھیں ویسے بھی حسن،نزاکت ،لطافت میں لپٹی کام کاج کرنے والی روزگار تلاش کرنے والی خواتین کو لانے میں کوئی تردد نہیں تھا خیر اسکے لئے بتدریج قانون سازی کی گئی مگر ان ساری کوششوں کے باوجود برطانیہ و امریکہ جیسے مغرب کے فکری رہنما ممالک میں بھی یہ سیاسی نسائی اہداف و مقاصد بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہی کچھ کامیاب ہوپائے تھے۔

اس دوران خواتین کے حقوق کے مطالبے زیادہ تر سیاسی و انتظامی نوعیت کے حامل تھے،ان خواتین کی اکثریت کو بحرحال فطرت کے ساتھ ساتھ اپنی حدود کا بھی بخوبی اندازہ تھا،انھونے کبھی ہماری عورت مارچ کی مغرب ذدہ عورتوں کی طرح وہ فحاشی عریانی،گالی گلوچ،لعن و طعن کا بازار گرم نہیں کیا تھا کیونکہ انھیں ملازمت بھی انھی مردوں کے ساتھ کرنی تھی اور تعلقات بھی انہی کے ساتھ قایم کرنے تھے لہذا عورتوں کے تحفظ کے لئے ہونے والی قانون سازی کے باوجود انھونے مرد کے ساتھ بلاشادی رہنے کو زیادہ ترجیع دی ناکہ انکی مار کٹائی پر شیرف ،و کاونٹی کی عدالتوں کے دروازوں میں شکایتیں درج کروانے میں تیزی دکھائی لہذا آج بھی یورپ کی عورت اکثریتاً قانونی شکایتوں و کاروائیوں سے بچتی نظر آتی ہے،ایک بوائے فرینڈ چھوڑا دوسرا پکڑا جب شادی ہی نہیں ہے تو پلو میں بندھنے کی مجبوری بھی نہیں ہے پھر جب پہلے سے تعلقات صحیح ہوئے تو دوسرے سے لڑ کر پہلے کے پاس چالی گئی یہ اسکی عصری تعلقاتی منطقیت ہے ،کیونکہ وہاں معاملہ اور معاشرہ دونوں ہی ہمارے معاشرے سے الگ تھے۔

دوسری بات یہ کہ چونکہ وہ مغربی اور یورپی قوم سے تعلق رکھتی تھیں لہذا یہ خواتین کسی احساس کمتری اور دوغلیت کا شکار نہیں تھیں،انکو مغربی یورپی ہوتے ہوئے کبھی ایشائی،افریقی ہونے کا جنون بھی نہیں چڑھا تھا ،جیسے ہماری خواتین کو انکی خام اتبع میں چڑھا ہوا ہے،کیونکہ انکی نیت مقامی اور یورپی نوعیت کی حامل تھی،تو انکو کسی بیرونی طاقت و قوت سے مال،مقام و روزگار کے لئے لینا دینا نہیں تھا ،انکے مطالبے ذاتی مقامی ہونے کے ساتھ خالص انکی ثقافت کے عین مطابق تھے جبکہ ہماری نسا پرستوں کی فکر،حلیہ،زبان،روش،تہذیب و تمدن،تعلیم و تربیت سب کچھ بیرونی،مغربی و خارجی نوعیت کا حامل ہے،جسکی موضوعیت فطری نہیں کسبی مفادیت میں ڈھلی ہوئی ہے،اس روش کی ظاہریت جس عینی موضوعیت پر استوار ہے وہی خالصتاً مقامی فکری نہیں بلکہ پروپگینڈہ ذدہ ترغیب و تحریب شدہ موضوعیت ہے جسکا سانچہ مغربی فکری ڈھانچہ کی تقلید میں پکا کر بنایا گیا ہے ،جبھی اسکی ظاہریت اسی سانچے کی موضوعیت میں ڈھل کر وہ نظر آرہی ہے جیسا یہ مغربی مقلد ذدہ خواتین الاپ لے کر اپنے بے سرے گانوں میں بیان کرہی ہیں۔

چناچہ حقیقی و فطری طور پر مشرق و مغرب کی عوتوں کے کلاسکی مستند پس منظر ہمیشہ ایک دوسرے سے باہمی مختلیف رہے ہیں اور یہ ہماری برطانوی یورپی غلامی کی باقیات ہیں جنھونے یہ تقلید زدہ ماحول ہمیں مغربی بنیادوں پر قایم شدہ جامعات کے ذریعے سکھایا،اور ایسا سکھایا کہ ہمارے بلاواسطہ مغربی برطانوی غلام آبا و اجداد نے بھی غیرت کے ہاتھوں اس ذہنیت کو رد دیا تھا اور پھر اس آزاد وطن کے حصول کے لئے جدوجھد کی تھی۔جسکا نتیجہ اس خطہ ارض کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

کوئی باشعور فرد کیسے اس حقیقت سے راہ فرار اختیار کرسکتا ہے کہ عورتوں کو اپنے لئے جتنے مناسب حقوق درکار تھے وہ اس سے زاید بتدریج لے چکی ہیں بھلے اسکے لئے انکو فطرت،تہذیب ،ثقافت،مذہب و ریاست سے بغاوت ہی کیوں نا کرنی پڑی تھی،گزرشتہ دو ،تین صدیوں سے بتدریج سرمایہ دار،خدا بیزار ریاستوں نے خواتین کو حقوق عطا کرنے کا غیر مختتم سلسلہ شروع کیا ہوا اور جسکے باوجود انھونے مرد کی ذات کو مورض الزام قرار دینے کی روش اختیار تاحال اختیار کی ہوئی ہے،اور اس ضمن میں اس امر کو سرے سے فراموش کردیا جاتا ہے کہ یہ مرد ایک بچہ سے عمر کے مراحل گزارتا ،جسمانی ذہنی،شعوری نمو و بڑھوتری اختیار کرکے جتنے روپ اپنے بڑھاپے تک اختیار کرتا ہے اسکی تشکیل و ترویج میں اسکے گھرانے کی خواتین بلخصوص اسکی ماں،دادی ،نانی،پھوپی،خالہ اور بڑی بھن نما رشتوں کی منتقل کردہ خاندانی و اخلاقی اقدار کا گھرا تعلق ہوتا ہے۔

پھر یہ بھی مت بھولا جائے کہ مرد کی انا ،تشخص،خودی ،ذمہ داری،اور غیرت نما خصایل، وظایف اور دیگر خصوصیات عورت سے بہت مختلیف واقع ہوتی ہیں،وہ اپنا غم درد،مجبوری عموماً خود پر بھی آشکار کرنے سے بچتا ہے،اپنے آنسو،مشکلیں،درد و کرب چھپاتا رہتا ہے،اور وہ اگر عموماً انھیں کسی پر آشکار کرنا چاہتا ہے تو وہ اسکی ماں ہوتی ہے یا کبھی کبھار بیوی ،یا پھر گھرا دوست ،اسکی گھٹن دوران خانہ اسکی موت کا سامان بھی پیدا کردیتی ہے،عورت کو لگتا ہے اسکے ساتھ ظلم ہورہا ہے، حلانکہ ظلم کوئی جنسی طور پر کسی خاص جنس سے وابستہ حالت،کیفیت ،اذیت و سزا کا نام نہیں ہے،یہ ایک معروف مطلق اذیت و جرم ہے جو کوئی بھی کسی پر قطع نظر تفریق جنس وارد کرسکتا ہے۔

اخبارات،تاریخ اور واقعات و حادثات کا مطالعہ،مشاہدہ و تجزیہ کرکے دیکھ لیں مرد پر سب سے زیادہ ظلم ہوتا ہے،اسکا قتل ہوتا ہے،اسکو لوٹا جاتا ہے،اسکے مال عزت و وقار پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے،اور یہ کارنامہ بھی مردانہ ذات ہی عموماً سرانجام دیتی ہے،سادیت پسند،اذیت پسند،انا پرست،نرگسیت کا شکار مالیخولیائی عورتیں بھی بڑی ظالم واقع ہوتی ہیں جنکی سازشیں بڑے بڑوں کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیتی ہیں اور یہ وہ کارنامے بھی عورتیں ہی مرد کی تقلید میں دوسری عورتوں کے ساتھ جنکے حقوق پر عورت مارچ والیاں پریشان ہیں کے ساتھ ہی سب سے زیادہ روا رکھتی ہیں،خطے ،رشتوں،ثقافتوں،تہذیبوں اور اقدار کے ساتھ ان میں تفاوت آتا رہتا ہے،یورپ کی عورت کو عموماً ساس نند،بھو جیسےمعاملات سے خاندان بیزار تہذیب کے سبب خاص لینا دینا نہیں ہوتا ہے،مشرق کی عورت کے لیے اپنی ہی جنس کے یہ رشتے سب سے زیادہ اذیت کا تعلق ہوتے ہیں جبکہ یورپ اور امریکہ

میں عورت کو یہ یاتو بوائے فرینڈ کی دوسری فرینڈ کی شکل میں بری لگتی ہے یا پھر کسی ذاتی پیشہ وارانہ تعلق کے سبب بری لگتی ہے۔

حقوق النسا کی علبردار خواتین بہت محدود حد تک نسائی علمی ڈسکورس کی علمیت سے واقف حال ہوتی ہیں انکا علم زیادہ سے زیادہ سماجی علوم و ادب کے دایرہ کار کے کسی مخصوص پہلو کا آئینہ دار ہوتا ہے،اس قسم کی زیادہ تر خواتین یا تو صحافت سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر ادب و وکالت سے انکا تعلق ہوتا ہے، ان میں زیادہ علمی پروفیشنل طبقہ کم ہی پایا جاتا ہے،پھر یہ مخصوص خواتین ایک خاص مخصوص ذہنیت کی حامل ہوتی ہیں اور بغاوت ،چاہے سماج سے ہو یا مذہب و ریاست سے انکو انکی نفی کرنا ہی بہادری نظر آتی ہیں،انھیں اپنے پیارے راج دلھارے ویسٹرن ڈسکورس کی سطحی سی معلومات حاصل ہوتی ہے،اسکی پیچیدگیاں ہوں یا مبادیات انکی انھیں زیادہ خبر نہیں ہوتی ہے،چناچہ انکے زیادہ تر حوالے و دلایل یا تو رومانی جذباتیت پر استوار ہوتے ہیں یا پھر وہ اقوام متحدہ اور اسکی ذیلی اداروں کے منظور کردہ پروٹوکولز،چارٹرز ،کنوینشنز،قرداروں پر استوار ہوتے ہیں،اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر ،بیجنگ کانفرسزز وغیرہ کی روئیدادیں اور تقاریر انھیں بہت محبوب لگتے ہیں۔ پھر اسکے بعد مختلیف ریاستوں میں خواتین کو عطا کردہ حقوق،انکی حالت زار کے حوالے بھی انکے کام آتے رہتے ہیں ،کچھ موصوفائیں ظلم وجبر کے اعداد و شمار جو مخصوص اداروں،حکومتی و غیر حکومتی انجمنوں کے محدود سیمپلز،و سیلیکٹیڈ مواد پر دارومدار کرتے ہیں کو بھی پیش کرکے گفتگو میں جان پیدا کرنے کی کوشش کرنا عدمہ دکھتا ہے۔

دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورتوں کو آج جتنے حقوق مل گئے ہیں وہ ایک عالمی منصوبے کا حصہ ہیں اور عالمی ریاستیں اس ضمن میں امریکہ و یورپی قوتوں کی نقالی کرتی نظر آتی ہیں،ان خواتین کی نگاہ میں ذاتی،ملکی،یا مذہبی تہذیب،و ثقافت اور ان سے تشکیل کردہ اقدار کی کوئی خاص اہمیت ہوتی نہیں ہےاور نا انکو فنڈ کرنے والی پس پشت حکومتوں و انجمنوں کو اس سے خاص دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ جنکو ذمہ داریاں سونپ رہے ہیں وہ کسی قانون،قدر ،اخلاق ،ثقافت و تہذیب کو اہمیت دیں،مگر ان سب کو یہ مت بھولنا چاہئے کہ مغرب کے چوٹی کے مفکرین دوسری ثقافتوں و تہذیبوں کی اہمیت کو نا صرف آج کل تسلیم کرنے پر مجبور ہیں بلکہ ثقافتی وابستی کی قومی اتحاد میں اہمیت کو خاص مقام عطا کررہے ہیں۔

تہذٰیب ریاست کی فرع یا اساس ہے ،اتنا تو طے ہے کہ ہذبیت ہو یا مہذبیت ہو یا تہذیب ہو یہ سب ریاست سے وابستہ مباحث و صفات ہیں ،اور ریاست کی حدود میں اسکے اقتدار اعلی سے ماخوذ خاص ثقافت اسکے کلی وجود کا اسکی قومی زبان کے ساتھ ملکر ایک خاص رنگ ،ڈھنگ و قدر میں نظام قایم کرتی ہے۔ جسکی بنیاد پر وہ دیگر ریاستوں سے متمیز کی جاسکتی ہے،باقی علاقائی و صوبائی ثقافتیں لوگوں کو ایک اتحاد کے ذیل رعایت ہوتی ہے،مگر ریاست کا وجود و اتحاد ان چھوٹی اکائیوں کی تشخصی جنگ سے وحدت کھو سکتا ہے،لہذا کوئی حقوق نسا کی علمبردار جاھل جذباتی ہوکر تو بیرونی اقدار و ثقافت کی تقلید کرسکتی ہے ،مگر انا خودی،تہذیب،ثقافت و اقدار کی مداح مستقبل بین عورت اسکو کبھی قبول نہیں کرسکتی ہے،کیونکہ یہ اسکی نئی نسل کے معدوم کرنے کی سازش بھی ہوسکتی ہے ،اور اسکے وجود و ارتقا سے نئی نسل کے تغافل کی ابتدا بھی ہوسکتی ہے،

ہم جانچتے ہیں کہ یورپی تہذیب کے عروج کے ساتھ ہی اسکے زوال کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا،اس ضمن میں بکلے ،سے لیکر ٹواین بی تک اور برنارڈ لویئس سے ہنگٹنگٹن تک اور مشرق میں سید قطب سے مودودی تک سے لیکر امریکی جاپانی نسل کے حامل فوکویاپا تک کو ان مسایل کی فکر تھی،محمد قطب کو اس امر کا اتنا احساس تھا کہ انھونے دو کتابیں انھی مباحث کے کئی پہلووں کی عکاسی کے لئے لکھ ڈالیں الحمداللہ دونوں ہی اوردو میں ترجمہ ہوچکی ہیں جنکے نام ہیں جدید جاہلیت اور اسلام ا ور جدید ذین کے شبہات،ایرانی نژاد مدبر و محقق،سید حسین نصر[1] کی کتاب بھی اس ضمن میں پڑھنے کے قابل شہ ہے،باقی نومسلم علما و محققین جو جدیدیت کے معاشرے سے نکل کر جدیدیت کے خلاف جہاد کرنے میں آگے آگے رہے میرا اشارہ محمد اسد،ماما ماڈیک پکتھیال،مریم جمیلہ،گرین،اور جناب ڈاکٹر بلال فلپ کی طرف ہے کی کتب و تقاریر کا مطالعہ و سمع قابل توجہ ہیں۔

جدید علم سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہر افراد و طلبہ میں سے کون ہنٹنگٹن کو نہیں جانتا ہے اسکی کتاب گذرشتہ آدھی صدی کی نمایاں و مقبول ترین فکری کتاب رہی ہے،جسمیں اس نے تہذیبوں کے تصادم کے اپنے موقف کو ٹواین بی اور برنارڈ لوئیس کے علمی خوف سے پیدا کرکے اجمال سے تفصیل میں لےآیا ہے سے واضح ہے کہ اسے مسلمانوں کی بڑہتی آبادی و پھیلاو پر بڑا درد و خوف محسوس ہورہا ہے،اسکے مطابق امریکہ کو اپنی انفرادیت کو یورپی انفرادیت میں رہتے ہوئے قایم کرنا چاہئے،اسکے مطابق جدیدیت و مغربیت الگ الگ شہ ہیں انیں ایک جیسا نہیں جانا جائے،جدید بحث و جنگ اگر چہ ریاستی تہذیبی تصادم کے دایرہ کار میں ممکن ہے مگر اصل انکی دوران خانہ ثقافتیں تاریخی ثقافتوں و مذہبی ثقافتوں سے جوہری روح حاصل کر رہی ہیں اس ضمن میں اسکا درج ذیل اقتباس کتاب کی جان کہا جاسکتا ہے،جسے میں پندرہ سال قبل تو صحیح سمجھ نہیں سکا مگر اپنی نئی اختیار کردی مطالعاتی حکمت عملی کی رو سےکہ فکری کتابیں فوراً ایک سانس میں نا ختم کرو بلکہ آہستہ آہستہ سمجھ کر پڑھو مگر ان سے قبل فلسفہ ،تاریخ،اورعلم کلام میں معقول دسترس ضرور حاصل کرلو لہذا دس سالوں بعد دوبارہ اس کتاب کو پھرموجودہ حکمت عملی سے پڑھنا شروع کیا تو پہلے باب میں ہی یہ اقتباس سامنے آیا جو میری بحث سے کافی میل کھاتا نظر آتا ہے: میری آپ حضرات کو دعوت ہے کہ ذرا غور و فکراور تدبر کے ساتھ اسکی بات کو پڑھیں اور سمجھیں:

[1] **Islam and The plight of the Modern men.**

سموئیل پی ہنٹنگٹن ثقافتی اہمیت و انفرادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

اس نئی دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ سب سے زیادہ غالب ترین اہم اور خطرناک ترین جھگڑے سماجی طبقوں امیر و غریب یا دوسرے معاشرتی اعتبار سے قایم شدہ گروہوں کے درمیان نہیں پائے جاتے ہیں بلکہ یہ جھگڑے درحقیقت محسوس یہی ہوتا ہے کہ ثقافتی اکائیوں سے تعلق رکھتے گروہوں کے درمیان رونما ہونگے[2].

بھی درون خانہ تہذیبوں کے اندر ہی رونما ہونا ممکن نظر آتے [3]قبایلی جنگیں اور نسلی جھگڑے ہیں،تاہم مختلیف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستوں اور گروہوں کے درمیاں تشدد کے فروغ پانے

---

[2] جھگڑوں ،لڑائیوں اور تصادم کی ایک اپنی ذاتی مبادیات ہوتی ہے جنکا تعلق واقعے کی اہمیت،گھرائی اور اثر پذیری سے

ہوتا ہے جسکی بابت قطعیت سے کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے کہ کونسا پہلو یا امر ان جھگڑوں میں شدت پسندی پیدا کرتا ہے،اتنا طے ہے کہ عصبیت ،ناطے نما رشتے چھوٹے بڑے گروہوں اقلیتوں میں اتحاد و وابستگی کی تدبیر کی حکمت عملی راسخ کردیتے ہیں،ہنگٹنگٹن کے اولین تحقیقی مضمون اور اسکی وسعت شدہ کتاب ِمذکورہ بالا میں بہت حد تک اصطلاح ثقافت کو تہذیب کی جگہ استعمال کیا گیا ہے،مصنف کبھی ثقافت کو تہذیب کے معنی و مفہوم میں لیتا ہے اور کبھی تہذیب کو اسکے متبادل سیاسی پہلو میں بیان کرتا ہے،مصنف نے ثقافتوں کا ذکر تو کردیا ہےمگر ثقافت و تہذیب کے باہمی مربوطیت،جز و کل کی تعلق داری ،اسکے اجزائے ترکیبی پر ان مباحث پر محققین کے اختلاف سے بھی پہلو بچا گئے ہیں،وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ ثقافت اگر دیہی ،علاقائی،صوبائی نوعیت کی حامل ہو تو اسکی حدود کافی مختصر مگر تیز واقع ہوتی ہیں،انھونے خود مقامی و نسبتا وسعت شدہ افریقی قبایلی جنگوں کی وسعت کی مثال سے وہی کہا جو میں یہاں بیان کر رہا ہوں ،مگر پھر یہ بھی ماننا پڑے گا سیاسی نظریاتی تہذیب کی مظہر ثقافتیں ہی نظریاتی تصادم نما قوت تخیلہ کو وسیلہ بن سکتی ہیں،انھیں ،یورپ و مغرب کی اصطلاحوں پر بھی کافی اعتراض محسوس ہوئے ہیں،خیر جو تہذیبیں تاریخی ،آفاقی ، طور پر وسعت شدہ ہوتی ہیں انکی ثقافتیں ان کی کل میں موجود ہر سیاسی اکائی بھلے وہ ریاست کی صورت میں پائی جاتی ہو یا ادارے کی صورت میں ملتی ہو میں سیاسی ومذہبی تعلق داری دیکھنے کو ملتی ہے،یہودیت ،عیسائیت و اسلام آفاقی،تاریخی،سامی مذاہب ہیں تینوں کی کلاسک و ہیت اولی میں دین و سیاست کا تلازم صاف مل جاتا ہے،یہودیت نے تو اپنے انبیا کرام کو ہی سیاست چلاتے دیکھا تھا،عیسائیوں نے اپنے ماضی کے یہودی ،بنی اسرایئلی تشخص کی نفی میں پال کی پیروی کی تھی، چناچہ انھونے خدا کو خدا کا حصہ اور سیزر کو سیزر کا حصہ دینے میں عافیت سمجھی،پھر کلیسا شروع شروع میں بس ایک تارک نکاح،عبادت گزاروں کی وحدت کا نام تھا جو پونٹفی سچ سے بڑھ کر پوپ تک جا وسیع ہوا تھا، اس کلیسا نے پھر جڑیں مضبوط کرکے سیاست کو بھی کنٹرول کرنا شروع کردیا،مسلمانوں کا تو شروع سے ہی اصول تھا کہ امیر،امام و خلیفہ کی پیروی و نیابت قبول کی جائے دین و سیاست باہمی تعلق سے ساتھ چلیں گے،عثمان ؓ کا یہ قول برے بڑے علما،محققین و مجتہدین صدیوں سے پیش کرتے آئے ہیں کہ اللہ اس دین کو سیاست سے قوت دیتا چلا آرہا ہے۔لہذا اسلام کی ثقافت و تہذیب ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں ،اصول دین کی شکل میں اسکی موضوعیت بھی راسخ طور پر کلی کو نظریاتی طور پر متاثر کرتی چلی آرہی ہے،جبکہ فروع میں کل امت اجتھاد کرتی رہی ہےجس سے اسلام کی قانونی اسپرٹ اکثر اسکی ثقافت و تہذیب کی رہنما بن کر ابھرتی ہے۔معج

[3] غالباً صاحب تحریر کی نگاہ میں قبایل نابی ایسے منظم ہوتے ہیں جیسی قدیم و جدید ریاستیں رہی ہیں،اور انکی عددی تعداد بھی انکے مقابل کمیت و کیفیت میں کافی قلیل ہوتی ہے، اور وہ مروجہ روایتی و غیر روایتی ہتھیاروں سےاس طرح لیس نہیں ہوتے ہیں جیسے جدید ریاستیں ہوتی ہیں جبکہ انکی جنگجو صفات عموماً کسبی کم وہبی و فطری زیادہ ہوتی ہیں جبھی ان میں سیاسی تدبر،مدبریت،فھم و فراستاور نمٹنے کے لئے سازشی صلاحیتیں وغیرہ بھی ایک حدود و وسعت تک ہی کام کرتی ہیں لہذا وہ درون ریاست یا پھر ایک خاص محدود رقبہ تک جھگڑوں کو وسعت دےسکتے ہیں پھر ایک حد سے زیادہ انکی رفتار و استعداد بھی نہیں ہوتی ہے،مگر صاحب تحریر اپنی جگہ صحیح ہونے کے باوصف یہ امر فراموش کرگئے کہ جب کسی ریاستی

کے امکانات ہمیشہ موجود ہوتے ہیں کیونکہ ان تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی دوسری ریاستیں اور ،جیسے صومالیہ میں ہونے والا [4]گروہ بادی النظر میں اپنے ہم رشتہ ملکوں کی مدد کرتے رہتے ہیں قبایلی خونیں تصادم ظاہراً وسیع تر جھگڑے کا امکان پیدا نہیں کرتا ہے ،جبکہ کچھ حد تک روانڈا میں رونما ہونے والے خونی تصادم دوسری طرف دیگر افریقی ممالک یوگینڈا،زایر اور برونڈی کو کچھ حد متاثر کرنے کے ضمن میں ایک معمولی وسعت سے زیاد کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔

لیکن یہیں اگریہ معاملہ بوسینیا،ققفاز،وسطی ایشیا،یا کشمیر میں رونما ہوانے ولے جھگڑے و ہنگامے، تہذیبوں کے درمیاں خونی تصادم سے بڑھ کر بڑی جنگوں میں تبدیل ہونے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں،جیسا کہ دیکھا گیا تھا کہ یوگوسلاویہ کے جھگڑوں میں روس نے بوسینیائوں کو ہتھیار اور مالی امداد فراہم کی تھی اسکی وجہ میری نظر میں نا تو نظریاتی ہے اور نا ہی سیاسی طاقت و معیشت بلکہ اسکی وجہ ثقافتی رشتہ داری ہے[5].

میں بستے گروہ کی سیادت و قوت کسی بھی طریقے سے ریاست پر غلبہ پالیتی ہے تو وہ قوت دوسری ریاست تک جھگڑا لے جاسکتی ہے اور ساتھ ساتھ کسی ریاست و قبیلہ کو یکجان کرکے یا دونوں میں سے ایک دوسرے کو آلہ کار بنا کر جھگڑے کو بڑے خطے بلکہ دنیا بھر میں وسعت دے سکتی ہے،جیسے افغانستان نے پختون قوم کو نسلی، قبایلی و لسانی رشتہ کے تناظر میں اپنی عملداری قرار دیاتھا ،انھونے ماضی میں بار بار پاکستان کے سرحدی،قبایلی اور شمال مغربی علاقوں پر اپنا حق جتایا تھا جبکہ بھارت نے بھی اسی دعوے میں اسکی پشت پناہی کی تھی یوں دونوں کی پروان کردہ دہشت گردی کی اس لھر نے پاکستان کو بھت نقصان پہنچایا تھا اور یہ سرگرمی اور اتحاد تاحال جاری ہے، عین اسے طرح تحریک طالبان پاکستان نے بھی ماضی قریب میں پشتون عناصر سے سرحد پار امداد حاصل کرنے کے لئے لسانی عنصر کو استعمال کیا تھا،پھر افغانستان میں حقیقی طالبان امارت اگر چہ مذہبی بنیاد پر تشکیل پایی تھی مگر اس پر بھی پشتون اکثریتی عنصر سیادت رکھتا تھا،ایسے ہی شمالی اتحاد کو وسطی ایشیا کے ازبک،تاجک،ہزارہ بلخصوص شیعہ فرقہ سے واستہ عناصر کی پشت پناہی حاصل رہی ہے،اور یہ عناصر شکلیں بدل بدل کر ریاست پر بھی غالب و اثر انداز رہے ہیں، لہذا اس دور تک کچھ تک یہ دعوی صحیح محسوس ہورہا تھا ،مگر بحرحال اقلیتیں اتحاد و وحدت میں عموماً اکثریت کے مقابل عمدہ کارکردگی میں آگے ہوتی ہیں،اکثریت جبتک عقل ،وحدت کو کام میں نہیں لاتی ہیں،جذبات سے لبریز رہ کر اکثریت کے زعم کا شکار رہتی ہیں، تب تک اقلیت اپنی مختصر وحدت سے انکی کمزوری کا اندازہ کرکے کامیابی حاصل کرتی رہتی ہیں اسی قسم کے عصبیتی دعوے ابن خلدون بھی صدیوں قبل کرچکا تھا،یہ عین ممکن ہے کہ امریکی سرخ ہندی چونکہ شمالی امریکہ کے سامنے ایک محدود متروک و ناکام مثال کے طور پر موجود تھے،جبھی ہنگٹنگٹن کو ایسا محسوس ہوا،اسی طرح افریقہ میں بوکو حرام شام عراق میں سنی عربیوں اور شیعہ عربیوں کی جتھے بندی کل مشرق وسطی میں بڑے ریاستی جھگڑوں کا سبب بن رہی ہیں،داعش نے کیسے عراق وشام تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا،عین ایسے ہی کردش عنصر ایران،عراق،شام و ترکی ریاستوں و سیاستوں میں بڑے جھگڑوں کا سبب بن رہا ہے۔معج

[4] **یہ نقطہ کافی مضبوط ہے اگر چہ جدید معقولی ریاست چونکہ ریاستی معاہدوں،بندھنوں،مجبوریوں سے کافی محدود ہوچکی ہیں عالمی طاقتیں اپنے سلامتی کونسل کے جوے کھانے کے ذریعے تاش کے پتے پھینک کر ویٹو بازی کرتی رہتی ہیں،مگر بحرحال زبانی کلامی ہی صحیح ایسے امور اخلاقی و تشہیری طور قوم کے جذبات کو گرماتے رہتے ہیں، جیسے پاکستانیوں کی بڑی تعداد کا افغان طالبان کی طرف جھکاو وانسیت،کشمیری،فلسطینی بھائیوں کے ساتھ ان پر ہونے ظلم پر انکا احتجاج کرنا ریاست پاکستان کا انکی اخلاقی حمایت میں بیاں دینا اس بیان کا ایک عمدہ اظہار ہے ، عین ایسے ہی امریکہ کا برطانیہ سے انیست رکھنا ،دونوں کا قریبی اتحاد،یورپ میں کیتھولک بیلٹ کے ممالک اور پروٹیسٹنٹ بیلٹ کے ممماالک کا فرق اور ان میں باہمی تعلق پھر ایک اجتماعی یورپی ثقافت کے سبب پیدا ہونے والا مشترکہ ورثہ و اتحاد اسکا کافی عمدہ اظہاریہ ہے۔**

[5] **ہم دیکھتے ہیں کہ جب روسی وفاق ٹوٹا اور وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں سمیت وہ ریاستیں بھی آزاد ہوئیں جو روسی قدیم تاریخ سے زار کے دور تک روسی سرحدوں،نظریات،ثقافت ،تمدن سے روابط و تعلقات رکھتی آئیں تھیں،یا جہاں مشرقی راسخ العقیدہ (گریک آرتھو ڈاکس) کلیسا ان میں تاریخی مذہبی وحدت و سانجھے داری قایم کرتا نظر آیا تھا،روس نے ان ریاستوں پر عین ایسے غلبا و اثر و رسوخ قایم کرنے کی کوشش کی جیسے وہ اپنے اشتمالی دور میں مشرقی یورپ کی کمیونسٹ ریاستوں پر**

داکلیو ہیول کا کہنا ہے کہ:

ثقافتی جھگڑے بڑھ رہے ہیں اور تاریخ کے کسی زمانے سے زیادہ آج کے دور میں زیادہ خطرناک ہوچکے ہیں۔

اسی بحث کو ژاک ڈیلورس اس اتفاق کہ ساتھ کو آگے بڑھاتا ہے کہ:

مستقبل کے جھگڑے معاشی یا نظریاتی کے بجائے ثقافتی عوامل کی بنا پر وقوع پذیر ہوں گے۔

کے درمیاں تقسیمی خطوط کے ساتھ [6]لہذا سب سے زیادہ خطرناک ثقافتی جھگڑے وہ ہیں جو تہذیبوں
ساتھ پائے جاتے ہیں،سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں ثقافت فیصلہ کن اور اتحاد پیدا کرنے والی فیصلہ
نے انھیں یکجا و [7]ساز قوت بن چکی ہے،بھلے لوگ نظریاتی بعد کا شکار ہوئے ہیں مگر بلآخر ثقافتوں
مربوط کردیا ہے جیسے دونوں جرمن حصے یکجا ہوگئے۔دونوں کوریائی حصے اور چینی منقسم
،معاشرے نظریات یا تاریخ کے ہاتھوں متحد ہوتے ہیں لیکین [8]علاقے ایک ہونے کے لئے کوشاں ہیں
تہذیب انھیں منقسم کردیتی ہے،جیسا کہ سویت یونین یوگوسلاویہ ،بوسینیا جیسے علاقوں میں تناو کو

قایم کرتا رہا تھا ،تو اسی تناظر کو اس نے دوبارہ نئی روح دینی چاہی چناچہ جب یوگوسلاویہ کے بعد چیکوسلاویہ،بوسینیا وغیرہ میں اس نے عیسائیوں کی مدد کرنا شروع کی جسکے سبب بوسینیا میں مسلمانوں کا جو اسلام سے ویسے بھی زیادہ واقف نہیں تھے کا کھلا قتل عام و نسل کشی شروع کی گئی،اس ضمن میں داغستان تک اس نے مسلمانوں کے خلاف قوتوں کی بلکل ایسے پشت پناہی کی جیسے آج وہ مشرق وسطی میں شام و ایران کی ریاستی پشت پناہی کرکے بلواسطہ اور بلاواسطہ مسلمانوں کے خون پر سیاست کررہا ہے،خیر یہاں جو روس کو سرحدی ،جغرافیائی،قربت و اثر و نفوذ حاصل تھا اسکے دم پر اس نے کبھی بھی وسطی اشیا اور مشرقی یورپ میں مسلمان راسخ العقیدہ گروہوں جماعتوں کو طاقتور ہونے نہیں دیا تھا،کیونکہ یہ زار کے دور سے آجتک کی اسکی مسلسل حکمت عملی کا حصہ ہے،چناچہ ہنٹنگٹن نے جو یہ اشارہ کیا کہ سعودیہ،ایران و ترکی نما ملکوں کی مدد میں انکا ثقافتی تعلق نمایاں کردار ادا کرہا تھا،یہاں کچھ چیزوں کو واضح کرنا ضروری ہے کہ اسلام کی ثقافت اسکی تہذیب یعنی اسلام کے اصول دین اور سیاست شریعہ کے تابع ہے،اسلام میں ثقافت و تہذیب میں کوئی ایسی دوئیت و تغیر نہیں پایا جاتا ہے جیسے جدید مقامی یا علاقائی ثقافتوں میں بعد پایا جاتا ہے،اسلام یورپ کے کلچر ڈایورسٹی ڈسکورس کو قبول نہیں کرتا ہے،اسلام ملت کی وحدت و اجتماعیت کو مد نظر رکھتا ہے،لہذا یہاں اسکی مراد ثقافت سے غالباً تہذیب ہی ہوتی ہے،ورنا یہ جنگی عالمی ڈسکورس اس فلاسفی میں چار خانے جڑاو نگینے کا کام نہیں کرپاتا ہے،اسکے علاوہ اسلام میں اصول دین اور فروع دین کے مابین جو اصول کی اہمیت ہے وہ اسلام کو نظریاتی و عقایدی جنگ و جھاد کی بحث سے لاتعلق نہیں رکھتا ہے ،لہذا آج کی اصل جنگ ہی نظریہ و عقیدہ کی ہے باقی سب تو اسی کے تابع ہیں۔معج

[6] اس مقام پر وہ بھی ثقافت کے ذیل تہذیب کے مدے کی طرف رجوع کرتا ہے اور پھر دونوں اصطلاحوں کو بڑہتی ہوئی بحث و حوالوں کے ساتھ نعم بدل کے طور پر بروئے کار لاتا رہتا ہے۔معج

[7] یہاں وہ نظریات و فروعی مسایل کو ثقافت کا ذیل بتاتا ہے جس سے ابہام بازی کی گنجایش پیدا ہوکر کسی معاملے کو دھندلا تو سکتی ہے مگر مسلک بازی کی کرشمہ سازی کو اسکے مطابق بالاتر تہذیب و ثقافت دوری و بعد کے باوجود دباکر ثقافت کے ذریعے جوڑ دیتی ہے،اسکی کل تحریر سے عیاں ہے کہ وہ روس سے کافی خوفزدہ ہے اسے لگتا ہے کہ روسی سیاست بازی نئی شکل میں اسکی عالمی قوت کی تشکیل سازی میں حصہ لیگی،چناچہ سقوطِ وفاق کے بعد بھی روس مسلسل اپنی سیاسی ،حربی استعداد میں اضافہ کرکے غلبہ کی سیاست کو پروان چڑھا رہا ہے،اور آزاد ریاستوں کو جسمی آزادی کے باوجود سیاسی و حربی غلامی میں لینا چاہ رہا ہے۔معج

[8] ہنٹنگٹن کی یہ پیشن گوئی قریباً تیس سال بعد بھی پوری نہیں ہو پائی ہے بلکہ اس معاملہ پر الٹی کشیدگی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے

پروان چڑھاتا رہتا ہے،اور جیسا معاملہ یوکراین،نایجیریا،سوڈان،ہندوستان سری لنکا اور کئی دوسرے معاشروں کے معاملے میں ہوتا ہے[9]۔

چونکہ میری اصل بحث تہذیب و ثقافت نہیں ہے ،انکا ذکر انکی اہمیت و افادیت اور بحث کے تناظر میں برسبیل تذکرہ آگیا ہےجب اس موضوع کا اصل مقام آئیگا وہیں اسی اجمال کی تفصیل پر مفصل کلام کیا جائیگا،یہاں اس گفتگو سے بحرحال اتنا تو ایک ہوشمند انسان کو سمجھنا چاہئے کہ ہر قوم و ریاست کچھ اجزائے ترکیبی سے متشکل ہوتی ہے،ہر قوم و ریاست کی ایک واحد تہذیب و ثقافت ہوتی ہے جو انھیں دوسروں سے منفرد بناتی ہے،جبکہ اسکے ذیل کئی نچکی سطح کی نسلی،لسانی وحدتیں و ثقافتیں بھی پائی جاسکتی ہیں ،یہ نسبت تعلق و رشتہ داری کی بحث اپنی جگہ مگر ہوسکتا ہے کہ ایک قوم پرست مقامی ثقافت والا اپنی ثقافتی فرد کو کچھ رعایتیں دیتا نظر آتا ہو،مگر اتنا بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ایک ہی دیہی،صوبائی مقامی ثقافت والا دوسرے فرد کو جو اس سے سارے معاملات میں ثقافتی رشتہ و ناطہ رکھتا ہو جب اس لئے قتل کردے کہ وہ اسکے دین و مذہب سے الگ ہو اور اسکے دین و مذہب کا دشمن و مخالف ہو تو یہاں ایسا بھی ممکن ہے کہ دوسرے قوم پرستانہ رجحان والے کے لئے اسکے دینی خصایل وفضایل دوسرے دنیاوی ،مفاداتی امور سے کم اہم ہوسکتے ہیں مگر انھیں اول الزکر وجوہات کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب و ثقافت کے محققین نے چاہے وہ بکلے،اسپلنگر،ٹواین بی ،لیوس یا ہنتنگٹن ہوں یا پھر ،یعقوبی،مسعودی،البیرونی،اور خلدون کیوں نا ہوں عصبیت کی مقامیت و قوت کے ساتھ ساتھ مذہب کی برتری و بالاتری کو تسلیم کیا ہے، جبکہ کلاسیکل ابن خلدون نے تواپنے مقدمے میں اس بابت کافی نفیس بحثیں کی ہیں۔

مسلہ یہ نہیں ہے کہ تم کیا چاہتے ہو مسلہ یہ ہے کہ تم مذہب میں رہ کر کیسے مذہب اور اپنی خواہش نفس دونوں کے ساتھ کیسے سانجھے داری کرسکتے ہو کیسے دونوں کو منافقت سے باہم ساتھ لیکر مخلوط تصور سے اپنی حیات کی تشکیل کرسکتے ہو،ندرت طبع کا مطلب یہ نہیں ہےکہ مذہب کی یا آبائی تہذیب کی نفی بھی کرو اور اس سے فواید بھی حاصل کرو،پھر ساتھ ساتھ اپی مرضی اور ورژن کا مذہب پانے و قایم کرنے کے لئے باولے بھی ہوتے جاو،ہنٹنگٹن کے مطابق مذاہب کا تشکیلِ تہذیب میں بہت اہم حصہ ہے،اس سے قبل مطالع تاریخ میں ٹواین بی نے جو تہذیبوں کی درجہ بندی بیان کی تھی اسکے ضمن میں پھیلتے مباحث بھی کچھ اس کیس کی مضبوطی کو پایہ دوام فراہم کرتے رہے ہیں،ول ڈیورانٹ جس کا رواں صدی میں بہت حوالہ جاتی اثر و نفوذ قایم ہے وہ بھی اسکی نفی نہیں کر پاتا ہے۔

اتنا طے ہوگیا کہ نشاط ثانیہ کے بعد کئی تہذیبی پراجیکٹوں نے انسان کے دور روشن خیالی،منطق و عقل کی پیمایش و افزایش پر بحث کو نیا دوام دیا جس سے انسانی الوہیت کی وسعت کو نئی روشنی اور نئی نمو ملی ،مگر اس تہذیبی ڈسکورس نے بحر حال کسی طرح مذہبی کرداریت کی نفی نہیں کی

---

[9] ہنٹنگٹن،سیمویل پی۔تہذیبوں کا تصادم۔مثال۔لاہور۔ ۲۰۰۳۔مترجم:محمد احسن بٹ:صہ:۳۸،۳۹)

(اسکے ساتھ میں نے اصل کتاب سے دیکھ کر اس ترجمہ کو بامعنی بنانے کے لئے دوبارہ ترجمہ کیا ہے)

ہے،حالانکہ جس مذہب کے خلاف یہ باتیں کی گیئں ،اس مذہب اور اسلام کی اساس و بنیاد باہم بہت کم مماثلت علمی رکھتی نظر آتی ہیں۔

معلوم پڑتا ہے کہ فرد و ثقافت ایک خاص انفرادیت کو پسند کرتے ہیں، ویسے ہی یورپی،مغربی ڈسکورس بھی ایک خاص جدید متبادل انسانیت پرست عقلی ثقافت میں وسعت پیدا کرکے کل دنیا کو اس کی آفاقیت کا قایل کرواکے اسکا پیروکار بنانا چاہتا ہے،لہٰذا انھونے بھی جو متبادل نمونہ و معیار قایم کیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا عورت مارچ جیسی فکر والیاں کیا اسی تہذیب کی آفاقیت میں اپنی خودی کو فنا کرکے اس بھاڑے کی خودی میں ہی ڈوب کر بے خود ہونا عمدہ جانتی ہیں؟ تو جانیں اسکے لئے جلد اور فوری طریقہ یہی بھتر ہے کہ اس مطلوب تہذیب کے ارض مقدس کی طرف ہجرت کرجائیں تاکہ وہاں انکو کوئی روک ٹوک نا سکے عین اس حیدر آباد کی خاتون کی طرح جسکی پیرس ڈایری انگریزی میں آن لاین خوب ڈاونلوڈ ہوکر معروف ہوچکی ہے جس میں موصوفہ نے پیرس میں اپنے میاں اور اسکے مشترکہ جنسی معرکوں میں اسکی شریک بن کر جن جنسی معاشقوں کا حال کھل کر بیان کیا ہے اس کتاب سے تہذیبی غداری ،غیر تہذیب کو اپنا کر جنسی فواید کا حاصل کرنے حال جیسے اس نے بیان کیا مانو ایسے معلوم ہوگا جہ جیسے کوئی بیوی بدل پورن فلم دیکھ رہا ہے۔

خیر اتنا تو بحث اشارہ فراہم کرچکی ہے کہ اپنی تہذیب و انفرادیت کی خاص علمی اہمیت ہوتی ہے دوسری تہذیب کے دلدادہ خود سے بیگانے ہوکر جسمانی و ذہنی خودکشیوں پر مجبور ہوجاتے ہیں نتیجتاً پھر وہ سشانت سنگھ راجپوت جیسی ذہنی بے قراری کا شکار ہوکر کم عمری میں ہی زندگی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں،غیر اقدار کی پیروی جہاں کچھ کو سکون و خوشی عطا کرتی ہے وہیں عصری اقدار میں پنہاں مادیت و ترقی کی اس سفری خطا کا شکار ہوکر کچھ لوگ خود کو جب جدید عصری معیارِ تہذیب و تمدن کے مطابق قایم کردہ خود ساختہ معیار کی پیروی سے جب خود کو مجبور و قاصر پاتے ہیں تو سمجھو ثقافتی شاک کا شکار ہوکر خود کو ہی فراموش کرنے لگتے ہیں،لہٰذا آج کی دنیا میں عشق و محبت کے لئے جان قربان کرنے کے قصص سے زیادہ قابل توجہ جاننثاری لوگ کاروبار،دشمنی،شہرت،امارت ،عہدے اور امتحانات میں اعلی اعداد کے حصول میں ظاہر کررہے ہیں،چناچہ دو تین سالوں سے گلگت بلتستان و سوات کے طلبہ و طالبات پسند کی شادیوں،امتحانوں میں مطلوبہ خواہش سے کم اعداد حاصل کرنے میں خودکشیوں کے لگاتار مظاہرے کر رہے ہیں،اسی طرح جامعات کی خواتین طالبات کی بابت یہ بڑی مشہور و محقق بات ہے کہ وہ امتحانات میں کامیابی کے لئے،یا اعلی پوزیشن کے حصول کے لئے اپنے عزت و وقار کا سودا کرنا کوئی بھاری شہ تصور نہیں کرتی ہیں۔۔

تہذیب،و ثقافت ہو یا مذہب یہ ہم سب کو اقدار کی لڑی میں پرو کر رکھتے ہیں رشتوں ،ناطوں،تعلقات و روابط میں وسعت و اخلاقیت قایم کرتے ہیں بلکہ ایک نطم و ضبط قایم کرتے ہیں جو کل وحدت کی بھلائی و حفظ کے لئے سازگار ماحول قایم کرنے میں ممد و مددگار ثابت ہوتے ہیں،یہ تعلقات عموماً دیرپا،خوشگوار ،اور مطلب سےعاری ہونے کی زیادہ صلاحیتوں سے لیس ہوتے ہیں جبکہ بیگانی تہذیب سے تعلق اپنی خودی،اور اپنی ثقافت و تہذیب سے دوری کے ساتھ ساتھ فرد کو اجماع سے بیگانہ کرکے نئے اجتماع کا دیوانہ بنا دیتا ہے۔

چناچہ عورت مارچ والے ہوں یا پھر نسائی ڈسکورس کے مداح ہوں یہ سب قدامت پرستی ،بنیاد پرستی کو رد کرکے کسی معیاری اقدار اور ان سے متعلقہ علمیاتی اقدار کی بحث سے اپنا روحی و فکری تعلق ٹوڑ کر اس سے خارج کسی غیر خارجی تہذیب کے معیار و اقدار پر اپنے تشخص کی بنیاد کھڑی کرتے ہینمگر ہوتا کچھ یوں ہے کہ کچھ عشروں و صدیوں بعد انکے جواب دعوی کرنے والوں کی نگاہ میں وہ بھی کلاسیکل ،متروک ،آوٹ ڈیٹیڈ یا پھر بنیاد پرست ٹھرنے لگتے ہیں۔

ویسے بھی کچھ ہی نظریاتی اقدار اتنے محکم و مضبوط ثابت ہوتے ہیں جو صدیوں کی کشمکش میں مسلسل پیھم جدوجھد کرکے اپنی مقبولیت کا معیار و درجہ قایم رکھ پاتے ہیں،چناچہ جدید ریاست،بین الاقوامی معاشرہ،سامراجیت،جدیدیت و مغربیت کی استعماریت کے سیاسی ،معاشی و نظریاتی غلبہ کے باوجود اگر اسلامی ڈسکورس مغرب سے ہی اپنے حامی وناصر مریم جمیلہ جیسوں کی صورت میں پیدا کر رہا ہے تو اسکا تجزیہ کرنے کے لئے ہمیں طارق علی،طارق فتح ،مبارک علی یا ضیاالدین سردار کے تجزیوں سے زیادہ جان اسپزیٹو ،برنارڈ لیوس ،کیرن آرمسٹرانگ،جیسوں کے تبصروں کو سمجھنے و پرکھنے کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے ،کیونکہ ایک تو یہ سب غیر مسلم مگر استشراق کے ماہر فن مانے جاتے ہیں دوسرے اپنی رائے قایم کرنے میں یہ اتنے کنفیوز نہیں ہیں جتنے مغربی فکر و تہذیب کے دلدادہ اول الذکر گروہ کے مسلم ہیں جو اپنے بنیادی ڈسکورس سے غداری کے مرتکب رہے اور ،اپنے اسلاف کی تہذیب سے اپنے من چاہے اصولوں کے تحت روابط قایم رکھنے کے لئے کام کر رہے ہیں جن میں سے سلمان رشدی ہو یا طارق علی ہوں انکی کم ازکم یہ یہ بات قابل مشرق و مغرب کے باہمی ڈسکورس کے تناظر میں عین درست حالت کی حامل نہیں ہے کہ مغرب نے مشرق کو سمجھنا چھوڑدیا ہے ،یا مشرق نے مغرب کو پرکھنا چھوڑدیا ہے،اور یہ کہا جانے لگے کہ ایڈورڈ سعید کا ثقافتی و استشراقی نمونہ علمی طور پر متروک و فنا ہوچکے ہیں درحقیقت کم از کم پاکستان کے تناظر میں تو یہ مسلہ اب زیادہ آب و تاب سے سمجھا جانے لگا ہے جس کا بین ثبوت ان مباحث کی ترجمہ ہوتی کتب اور وہ طبع زاد کتب ہیں ،جنکا مطالبہ آن لاین یا واٹس ایپ گروپس پر خریدار اپنے کتب فروش سے روز کرتے نظر آتے ہیں۔

انھی مباحث کے ذیل ہمارے آج کے جنوبی ایشیا کے لوگ اپنے اقدار و تشخص کی علمیاتی جنگ و جدل کو پروان چڑھاتے نظر آتے ہیں،لہذا نسائیت کا مشرقی ڈسکورس میڈیا پر جتنا پر قوی،مشہور و پھیلا ہوا نظر آتا ہے،وہ اپنی قوت کے اظہار کے دعووں کے باوجود آٹے میں نمک تعداد سے بھی کم خود تقویت دیتے نظر آتے ہیں،بلکل عین ایسا ماجرا ہمیں عورت مارچ میں عددی اظہار کی سیاست میں بھی نظر آتا ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو واضح ہوجاگئیا کہ ہم مذکورہ بالا بحث کے عدد تین تک کل دس اعتراضات کا کچھ نا کچھ رد کر چکے ہیں،جیسا کہ یہ اعتراض بھی وہاں بمع رد بیان کردیا گیا ہے کہ ظلم کی چکی میں صرف عورت آذاد شکل میں یا کنیز و باندی کی شکل میں نہیں پستی ہے بلکہ اس چکی میں مرد بطور آزاد تشخص کے اور بطور غلام اسکا ہمیشہ ہمسفرو سہیم رہا ہے،عمار بن یاسرؓ ،ہوں یا انکے والد یاسر ؓہوں یا والدہ سمعیہؓ تینوں قطع نظر جنس و عمر ظلم کو جھلتے رہے تھے،بلال حبشیؓ ہوں یا سلمان فارسیؓ ان سب ہی نے گورے و کالے کے اختلاف کے باوجود ظلم کو برداشت کیا

تھا،وہیں دوسری طرف آزاد لوگوں میں جو اسلام و دین کے لئے اذیت رسانی ابوبکرؓ نے نبی اکرمؐ کے ساتھ برداشت کی تھی ویسی علیؑ ،عباسؓ یاابو طالب نے برداشت نہیں کی تھی ،یہ سب تقدیر ،و تاریخ کے کھیل و مقام ہیں جن سے باہر نکلنا کوئی اتنا آسان نہیں کام نہیں ہے کہ جتنی آسانی سے معترضین نے اعتراض وارد کردیا ہےاور جتنی آسانی سے ہم نے جواب دے دیا ہے،یہ دراصل حقایق کے محاکمہ کا معاملہ ہے اسی طرح جنابہ خدتیجہؓ بھی زمانہ قدیم از اسلام کی باوقار،ثابت قدم اسلام لانے والی اولین خاتون تھیں ،انھونے کتنےہی غلاموں پر رحم کیا تھا ،کتنوں کو زید بن حارثہؓ کی طرح نبی اکرمؐ پر وار دیا تھا،جبھی تقدیر میں ہر فرد اپنے مقررہ مقام و رتبہ سے جبتک تبدیلی کا وقت و مقام لکھا نا گیا ہو آگے پیچھے ہو نہیں سکتا ہے جیسا کہ عایشہؓ نبی اکرمؐ کی محبوبہ ہوتے ہوئے بھی ان پر رشک فرمایا کرتی تھی اور یہ بیان کیا کرتی تھیں کہ نبی اکرمؐ کے دل میں انکا کیا مقام تھا کتنا آپؐ انکا ذکر خیر کیا کرتے تھے اور کیسے انکی سہیلیوں کو دینے دلانے میں یاد رکھا کرتے تھے ختیجہؓ تمام نسا کے لئے ایک قربانی و ایثار کا عملی نمونہ ہے،شرف،دین،کردار،قربانی،اور کسب سب آپ میں مجتمع ہوگیا تھا۔

نبی اکرمؐ کی یہ زوجہ محترمہ بھی ایک خاتون ہی تھیں وہ بھی زمانہ قدیم میں سے مکی دور کی خاتون تھیں مگر کیا انکا اس دور میں بھی ایک معاشی و خاندانی تشخص ایک عورت ہونے کے باوجود تسلیم نہیں کیا جاتا تھا؟، اسی طرح نبی اکرمؐ کی رضاعی والدہ کا معاملہ دیکھو کہ کیا یہ عام بات تھی کہ ایک اعلی خاندان کی عورت کا بچہ دور رضاعت میں ایک بدو و غریب دودھ پلانے والی کی چھاتی سے لگا دودھ پیتا تھا اور اس رضاعی رشتہ کا پاس وخیال کا یہ حال تھا کہ ایسی رضاعی وآلدآوں کا عزت و احترام عرب کا ہر ایک عام و خاص کیا کرتا تھا،نبی اکرمؐ کی مثال کیوں اس ضمن میں فراموش کردی جاتی ہے۔

اب ذراعایشہؓ کو مدنی دور کے تناظر میں دیکھیں یا وفات نبیؐ کے بعد تک دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ لوگ نبی اکرمؐ کے قول ،فعل اور معمول زندگی پر انکو اتھاڑتی مانتے تھے،صحابہ کرام بڑے ہوں یا چھوٹےسب ہی ان سے رجوع کیا کرتے تھے،انکا رتبہ ایسا تھا کہ ہر ایک انکی بات کو ترجیح دیتا تھا،انکے مخالفین بھی دل پر ہاتھ رکھ کی کر اس بات کو سچا جان کر انکار نہیں کرسکتے ہیں کہ جمل کی جنگ میں علیؑ اگر خلیفہ وقت تھے اور اسکے دعوے دار تھے،یا پھر طلحہؓ یا زبیرؓ جو عشرہ مبشرہ سے تھے اور جرات،شجاعت اور بہادری کے پہاڑ جانے جاتے تھے، انکا مقام لوگوں سے اوجھل ہوگیا ورنا مستند آثار سے ثابت ہے کہ ان دونوں کا صحابہ میں یہ رتبہ و مقام تھا کہ عثمانؓ کے بعد لوگ علیؑ کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو بھی خلافت کا اہل امیدوار تسلیم کیا کرتے تھے۔

اہل بصرہ نے جنکے پلڑے میں اپنے جوان ڈال دیے تھے یہ دونوں خود ایک خاتون(عایشہؓ) جو ان سے کافی کم عمر تھیں کے مقابل خود کو بطور رہنما کم وقعت محسوس کررہے تھے،وہ خارجی جنھونے علیؑ کی بعیت میں اہم کردار ادا کیا تھا اور جنھونے عثمانؓ کو شہید کیا تھا وہ بھی شہادت سے قبل علیؑ کے ساتھ طلحہؓ و زبیرؓ کو خلافت کا اہل اور مضبوط امیدوار جانتے تھے،چناچہ مصر،کوفہ و بصرہ ان تینوں اصحاب رسولؐ کی حمایت میں منقسم تھے ،مگر جب طلحہ و زبیرؓ نے انکار خلافت کردیا تو علیؑ ہی واحد امیداوار مانے گئے تھے واضح رہےکہ معاویہؓ اور علیؑ کے

باہمی معرکہ اجتہادی نوعیت کے تھے ورنا امیر معاویہؓ نے ان میں خود کو نا خلیفہ قرار دیا تھا اور نا اس کے لئے کوئی بیعت لی تھی ،اس تمام شہرت کے باوجود جب طلحہؓ و زبیرؓ کو قصاص عثمانؓ کے لئے لوگوں کو جمع کونے کی ضرورت محسوس ہوئی اور جسکو ان سب نے قاید اور مرکزی قوت کے طور پر اپنا بڑا مانا وہ عایشہؓ تھیں،کون عایشہؓ جنھونے عدل و انصاف ے فاطمہؓ کی بابت صحیح آثار من وعن امت تک منتقل کردیے ہیناور اس ضمن میں کوئی ڈنڈی نہیں ماری ہے، انکی صداقت و ایمانداری کا یہ حال ہے کہ علیؓ کے فضایل میں روایتیں بیان کردیں،حلانکہ روافض اور بد عقیدہ انکے انکے والد محترم کی طرح سخت مخالف ہیں انکی فقاہت و قابلیت ایسی معیاری جانی جاتی کہ ابن عمرؓ،ابن عباسؓ،اور ابو ہریرہؓ جیسے حدیث کے بڑے جاننے و نقل کرنے والوں کے فتاووں کی اصلاح قران وحدیث سے فرما دیا کرتی تھیں،کون عایشہؓ جنکی شان میں ہلکی سی گستاخی پر لوگوں نے جنید جمشید کی ایسی تیسی کردی تھی،انھی عایشہؓ کا حال دیکھو کیا عشق تھا لوگوں کو ان سے کہ نماز پڑھنے کے دوران طلحہؓ و زبیر ؓشہید ہوچکے ہیں،سامنے حیدر کرار علیؓ مرتضی کھڑے ہیں،محمد بن حنفیہؒ حسنؓ و حسینؓ مقابل موجود ہیں مگر بلا سپہ سالار ہونے کے باوجود عایشہؓ کے امہات المومنین ہونے کے سبب،نبی اکرمؐ کی محبوب زوجہ ہونے کے سبب،ابو بکرؓ کی دختر ہونے کے سبب بھاری ہوئی ،بلا سپہ سلار جنگ،خارجیوں کی بھڑکائی ہوئی جنگ جاری و ساری تھی ، لشکر علوی میں مالک بن اشتر جیسے شیطان نما برتمیز فرد جو خوارج کے ساتھ ساتھ انکی جان و عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے کہ سامنے ان عایشہؓ ایک خاتون ہوکر ڈٹی ہوئی تھیں کی حفاظت و تحفظ کے لئے عاشقان رسول کانکے اونٹ کے سامنے سینہ سپر ہوکر جانیں نثار کررہے تھے،کٹ کٹ کر مر رہے تھے،یہ تو علیؓ کی عقل کو سلام کہ پہچان گئے کہ انکا ہودج اگر یوہیں استقامت کے ساتھ کھڑا رہا تو سامنے کوئی بھی زندہ باقی نہیں بچے گا انھونے اس اونٹ کو زخمی کرواکر بٹھادیا،ورنا بنا رہنما کے اس لشکر کو ختم کرنے کے لئے کوفہ،عراق کے خوارج ایڑھی چوٹی کا زور لگا چکے تھے علیؓ نے حکمت و تدبر سے کام لیا تو یہ جنگ رکی،اسی طرح دنیا کے کتنے ہی قبایلوں سے سے پوچھو کہ وہ کیسے اپنی عورتوں کی عزت و وقار کے لیے غیر مختتم جنگیں لڑ لڑ کر ختم ہوجاتے ہیں یہی عورت جب دوپٹہ کسی مرد کے قدموں پر رکھتی ہے توغیرت کے مارے بڑے بڑے دشمن جان بخشی کر نے پر خود کو مجبور پاتے ہیں لہذا اکثر،تصاویر جو ظلم دکھارہی ہوتی ہیں عموماً یک رخی حقیقت عیاں کر رہی ہوتی ہیں لہذا تصویر کا یہ دوسرا رخ بھی خدایا دیکھا کریں؟ ۔

اس فکر سے باہر نکلو کہ اسلام غلامی کو رواج دینے والا ہے ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام غلامی کو قایم کرنے والا نہیں بلکہ اسکی اصلاح کرکے بتدریج کمزور و ڈھیلا کرنے والا دین ہے،اسلام کا نظامِ کفارہ غلامی کے بندھنوں کی قید سے وجود انسانی کو باوقار طریقے سے آزاد کرنے کا نظام تشکیل دیتا ہے۔

غلامی جتنی ابتر ،بیہودہ طریقے سے زمانہ قدیم بلخصوص ،روم،یونان،مصر،شام،و یورپ میں موجود تھی اسکا اندازہ کوئی تاریخ سے ناواقف جدید الخیال مسلم فرد وغلام لگا ہی نہیں سکتا ہے،انکی تصویر کشی کے ضمن میں ہالی ووڈ و یورپ نے کتنی ہی فلمیں ممد و معاون ثابت ہوسکتی ہیں مشہور

زمانہ ڈرامہ سیریلز،اسپارٹکس ،وائی کنگ اور دی لاسٹ کنگڈم دیکھ لیں شاید یہ فکشن ہی آپکی ماڈرن لایف کی کچھ آنکھیں کھلوادے ۔

زندگی کو اور تاریخ کو صرف جنسی نقطہ نظر سے یا جنسی پیراڈیم میں دیکھنا کوئی معقولی حرکت نہیں ہے، یکونکہ برابری کی مطلق حقیقت سرے سے کوئی عقل و تاریخ سے ثابت شدہ شہ ہی نہیں ہے ،جس طرح عدالت میں انصاف حقدار کو اسکا جایز حق عطا کرنا صحیح سمجھا جاتا ہے ناکہ برابری کی بنیاد پر قاتل و مقتول،قابض و متاثرہ فرد کو خوش کرنے کو انصاف کہا جاتا ہے،جس طرح کسی مرد کی بیوی اور اسکی رکھیل برابر نہیں ہوتیں ہیں اور نا ہی کوئی منصف مزاج عورت انصاف کے پیرائے سے متاثر ہوکر کبھی یہ مان سکتی ہے کہ اسکے خاوند سے تعلق قایم کرتی کوئی طوایف یا اسکی گرل فرینڈ اسی تشخص ،احترام اور حق کی مستحق قرار پائے جیسی وہ جانی جاتی ہے،عین جس طرح ایک پانچ سو روپے چارج کرنے والی طوایف اور لاکھ روپے لینے والی طوایف یکساں جنس اور یکساں کاروبار میں شراکت کے باوجود اپنے معیار کی رو سے خود کو ایک دوسرے کا مساوی اور برابر ماننا بطور انصاف تسلیم نہیں کرسکتی ہیں ویسے ہی جنس مرد اور جنس عورت وظایف ،سیادت،حکومت،اہلیت،قوت، دانش،حرب و فن میں برابر نہیں ہوسکتے ہیں،بلکہ ایک ہی جنس کے مرد اپنی مردانہ جنسی دایرہ کار میں یکساں مقام،صلاحیتوں ،رتبہ میں ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوتے ہیں اسی طرح مذہبی بنیادوں پر کوئی بھی مسلمان عیسائی یا یہودی اشتراک جنس و نسل کے باوجود کبھی محمدؐ،عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کے برابر مرتبہ،سیادت،مذہبی مقام ،رتبہ یا کسی بھی پیرائے میں برابر ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔

جدید فلسفہ کو بھی اگر من حیث المجموع حقیقی تناظر میں دیکھا یا پرکھا جائے ،نالایق و قابل ،اہل و نااہل کو یکساں نہیں جانتے ہیں حد یہ کہ کانٹ جیسا فلسفی سچ و جھوٹ کی اخلاقیات کو یکساں تسلیم نہیں کرتا ہے وہ اس جھوٹ کو بھی نیکی ماننے سے علمیاتی تناظر میں گریزاں نظر آتا ہے جو کسی کے بھلے کے لئے بولا جائے،اسی طرح انصاف جدید نظیامتی فلسفہ میں یہ ہے کہ سب کو مواقع کے حصول کی جدو جہد میں برابر جانا جائے،کسی کو ملازمت یا کسی عہدے کے لئے مقابلے کرنے کےلئے می برابر مواقع حاصل ہوں ناکہ چن لئے جانے کے بعد غیر رسمی ملازم اور رسمی ملازم دونوں ہی یکساں طور پر دیکھے یا پرکھے جائیں،جان رالز نے بھی اپنے منصفانہ طریقہ کار کے نظریے میں کافی حد تک ایسا ہی تسلیم کیا ہے بس اس بات پر زیادہ توجہ دی ہے کہ متاثرہ،محکوم،افراد کو بھی اس طرح اعلی مواقع دئے جائیں جیسے مستفید افراد کو حاصل ہیں۔

ایک مثال دیکھیں بے نظیر ایک سیاسی جماعت کی سربراہ تھی جو اپنی حیات میں دو دفعہ وزیر اعظم بنیں،انکی جماعت کے مردوں کو جو انکے جاں نثار تھے کو کچھ دیر کے لئے فراموش کردیں کیا اسی جماعت کی ایک وارڈ کی کارکن سے لیکر ایک خاتون رکن اسمبلی تک کوئی بھی کیا خود کو انکے برابرتسلیم کرتی تھی، جبکہ کیا وہ خود برابری برابری،انصاف یا حق کی بات کرتی تھیں مگر وہ اور انکا خاندان جو نسلی پس منظر پر اپنی جماعت اور پاکستانی سلطنت پر قابض رہا کیا ان لوگوں نے خود کبھی پارٹی الیکشن کا چلن ڈالا؟ پاکستان و ایشیا کی ہر دوسری،تیسری ،پارٹی نے نسل پرستانہ ،خاندانی پس منظر پر ہی اپنی سیاست ،سیاددت اور ریاست کھڑی کی ہے، لہذا آج کل انصاف ہو یا

برابری بس نعروں،فلسفیانہ موشگافیوں اور دل بھلانے کا معاملہ بن کر رہ گیا ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ ایک نعرہ جاتی سیاسی پراڈکٹ بنکر رہ گیا ہے،یہی چلن بعد ازاں مسلم لیگ ،اے۔این ۔پی نما جماعتوں نے بھی اپنایا ہے۔

معذرت کے ساتھ ہم سب ہی لوگ عروج اسلام سے زوال تک آج تک نسل و خون کے احترام پر جان لٹاتے ، اور انصاف کو برباد کرتے رہے ہیں،میں زیادہ بات نہیں کرونگا لوگ بحث کو فرقہ وارانہ پس منظر سے آلودہ کرنے کے بھتان سے لبریز کردینگے،مگر سچ یہی ہے کہ بادشاہتیں رخصت ہوگئیں مگر سیاسی جماعتوں اور جمہوری کلچر نے نیی قسم کی سیاسی رہنمائی کرتی لاکھوں ،کروڑوں بادشاہتوں کو وفاق سے دیہی سطح تک قایم کرکے رکھ دیا ہے۔

لہذا جمہوری سرمایہ دارانہ ثقافت سے پروان شدہ فکری مباحث نے ایسی ایمانیات کو جنم دیا ہے جو فرد کو اول انسان کی خدائی کا نشہ چڑھواتی ہیں،پھر خدا و مذہب سے دور لے جاکر انسانوں کو مخصوص خاندانوں ،جماعتوں اور گروہوں کا غلام بنا دیتی ہیں،ہم کتنے ہی بڑے عالم فاضلکیوں نا بن جائیں ،کتنا کچھ زندگی بھر پڑھ لیں ایک مقلد یہی کہتا ہے تمہارا انکا کیا مقابلہ،اس ثقافت نے ایسی ایمانیات کو پروان چڑھایا ہے کہ جو شخصیت پرستی کو درون خانہ تسلیم کروالیتی ہے،آپ جتنے ایماندار ہونگے اتنے ناکام ہونگے،یہ معاشرہ اتنا منصف مزاج ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے سیاسی عہدوں تک اقربا پروری کو ہی درجہ قبولیت حاصل ہے،جو عورت ہو یا مرد سب کو یکساں طور پر متاثر کررہے ہیں اور انکے تشخص و وقار کی تذلیل کررہے ہیں،ہماری انا خودی پرواز کیا کریگی جو حالات دیکھ کر رینگنا بھی چھوڑ چکی ہے،اور الٹا اس جہاں میں مساوات جنسی کی باتیں کی جارہی ہیں۔

جنسیات،نسائیات،یا جنسی مساوات کی مباحث جنگ عظیم اول سے قبل کچھ رخ بدلنا شروع کرچکے تھے جنگ عظیم دویم کے بعد جب سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت میں سرد جنگ کا آغاز ہوا تو دونوں کی اس سرد جنگ نے آزادی کی حدود کے فلسفے کو نئی جدید توسیع شدہ جدت عطا کی،اتنا تو خیر مسلمہ نتیجہ خیز امر سامنے آیا کہ دونوں نے ہی کم از کم فیکٹری سے کھیت تک،اسکول سے آفس تک عورت کی آزادی کی حدود مرد کے مساوی لانے میں اتحاد و یکجہتی دکھائی تھی ۔

اس اجماع کا نتیجہ بعد ازاں گھر سے اسکول تک اور وہاں سے کالجز و جامعات تک وسیع کر دکھایا،ہماری آج کل کی دنیا کمیرہ فون کے سبب ایک ورچوئیل چکلے خانے میں بدل چکی ہے،جو کبھی خود سے بھی چھپانے کی باتیں ہوا کرتی تھیں وہ اب اکیلے یا کسی کے ساتھ میں کمیرہ کے ہاتھوں نکل کر آن لاین ہوچکی ہیں ،آج ایک ایسی پورن صنعت قایم ہوچکی ہے جو قریباً دو کروڑ تک ویب سائیٹوں تک وسعت پاچکی ہے ، جس میں ہر روز ان خود ساختہ ویڈیوز کا پھاڑ آن لاین جمع ہوتا رہتا ہے، آج ایک مکروہ الشکل مرد و عورت بھی جنسی نظارے سازی کی سرگرمی کو وسعت دینے میں اس بنیاد پر داخل کاروبار ہوچکے ہیں کہ جسم و جنس ہوں تو انکو کوئی نا کوئی ضرور سراہ لیگا، ہمار اپڑوسی ملک بھارت اس صنعت و شوق میں مغرب کو کئی گنا پیچھے چھوڑ چکا

ہے،سیکولر ترکی اس مہم و کاروبار میں ستر کی دھائی سے آگے تھا۔ہمارے قومی کارنامے بھی ڈھونڈھنے سے میسر آجاتے ہیں۔

اب ذرا آج کی اس جدید جنسی انارکی کی بحث سے جس سے نئی پود خوب واقف ہے سے پیچھا چھڑا کر ذرا ماضی میں چلےجاتے ہیں کہ تاکہ دیکھ سکیں کہ ماضی میں کیسے مغرب کے لوگ اس جنسی انارکی،جنسی آزاد خیالی میں نسائی آزادی کی حدود میں کمی کے سبب پریشان تھے، کسی معاشرے کے اسکول ،کالجز اور جامعات اس تجربہ میں بنیادی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں اب آئیں ذرا ذیل میں اسکا کچھ ہلکا پھلکا اندازہ قایم کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

ہم دیکھتے ہیں کہ ملک لبنان عرب آزاد خیالی میں مصر ی ٹکر کا حامل ملک رہا ہے اس ملک میں عیسائی،و یہودی بھی مسلمانوں کے ساتھ مناسب تعداد میں بستے نظر آتے ہیں حد یہ کہ وہاں یہ فارمولا طے ہوچکا تھا کہ ایک عیسائی اگر صدر ہوگا تو مسلمان وزیر اعظم ہوگا،یہاں فلسطین کی تحریک آزادی کے گڑھ ہونے سے قبل یعنی ساٹھ کی دھائی اور ستر کی ابتدا و وسط میں آزاد خیالی عروج پر تھی،یہاں کی عورت کا حسن مانی ہوئی حقیقت جانا جاتا ہے،لوگ کہتے ہیں کہ وہاں کی عورت ایسی خوبصورت ہوتی ہے جیسے کوئی حور زمیں پر بستی ہوں،مغرب و امریکہ نے یہاں کی اہمیت کے تناظر میں یہاں اپنی جامعات و کالجز کے بیرون ملک کیمپسز قایم کئے ہوئے تھے ،اسی لبنان کی میوزک ویڈیوز آن لاین چیک کرلیں ہلکا سا ٹچ آپکے ہاتھ آجائیگا۔

خیر اسی لبنان کے ایک اخبار الاحد کو ماضی میں امریکی جامعات میں پھیلی جنسی بے راہ روی پر تحقیق کا شوق چرایا تو اس نے اس معاملہ کی بع از تحقیق تصویر کشی کچھ اس طرح کی کہ :

دیکھتے ہیں کہ امریکی جامعات اور کالجوں کے طلبا و طالبات میں رسوا کن جنسی واقعات میں ہم روز بروز اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے،اب تو معاملہ اس سطح پر آگیا ہے کہ امریکی جامعات میں طلبہ یہ نعرے بڑی آزاد روی سے مظاہروں و مطالبوں کی صورت پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ ہمیں دوشیزائیں دو تاکہ ہم اس جنسی گھٹن سے نبرد آزما ہوکر سکون و فرحت پا سکیں۔

اس واقعہ کی بابت یونیورسٹی کے سربراہ کو ایک مراسلے (رپورٹ) میں یہ بیان رقمطراز کرنا پڑا کہ:

ہمارے اکثر طلبہ و طالبات نہایت خطرناک قسم کی جنسی بھوک کا شکار ہوچکے ہیں ،حقیقیت بھی یہی ہے کہ موجودہ دور کی ہماری آزاد زندگی کا طلبہ کے ان انحرافات و تشکیل میں اور نازیبا حرکات و سکنات میں بہت گہرا ہاتھ رہا ہے۔

ریکارڈ سے نظر میں **لاکھ بیس ہزار ایسے بچے** مذید براں اخبار کا یہ تبصرہ قابل غور ہے کہ ایک آئے ہیں جنھیں ایسی دوشیزاوں نے حرام کاری سے جنم دیا ہے جنکی خود کی عمر بیس برس سے زاید نہیں ہے اور یہ طالبات زیادہ تر کالجز و جامعات میں زیر تعلیم ہیں۔

<u>اسی طرح ولایات پرویفیڈنس کی پولیس رپورٹ آنکھ کھولنے کے لئے کافی ہے جس کے مطابق:</u>

چھاسٹھ طلبا و طالبات نے گزشتہ ماہ مئی کے آخری ہفتہ کی چھٹی آئی لینڈ میں گزاری جہاں سے یہ بجائے اس کہ اپنی جامع واپس آتے الٹا علاقہ کی جیل کی زینت بنتے کیونکہ انھیں نہایت مشکوک،نازیبا ہیت میں گرفتار کیا گیا تھا،حد یہ کہ منشیات جیسے ناجایز استعمال میں بھی یہ آگے آگے تھے۔

<u>ایک سوشل ورکر مارگریٹ اسمتھ کے ایک تبصرہ نے اخبار میں جگہ بنائی کہ جس میں وہ فرماتی ہیں کہ:</u>

آج کی طالبات کو ہر وقت اپنے جذبات و خواہشات کی فکر لگی رہتی ہے اور وہ ان وسایل کے درپے رہتی ہیں جو انکے جذبات کا ساتھ دے سکیں ،حد یہ کہ ساٹھ فیصد سے زیادہ طابات امتحانات میں ناکام ہوگئیں اور انکی ناکامی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اپنے اسباق و مستقبل سے زیادہ جنس کے سلسلہ میں سوچتی رہتی ہیں ان میں سے مشکل سے دس فیصد لڑکیاں ہی ایسی ہونگی جو اپنی عزت و آبرو کو محفوظ رکھتی ہونگی۔[10]

ماضی کےب اس جنسی رجحان میں پہلے کے مقابل کئی گنا اضافہ دیکھنے کو ملا ہے چناچہ اس بابت آن لاین ریسرچ کے دوران کئی فلمیں اور ڈرامے ان رجحانات کی بابت کچھ تاثر فراہم کرتی دیکھنے میں آئی ہیں :جیسے نیٹ فلکس سیریل سیکس ایجوکیشن،سیکس اینڈ سٹی ،دی بولڈ اینڈ بیوٹی فل فلمیں دی پرفیوم،امریکن پائی وغیرہ۔

درحقیقت یورپ کی مغربیت کوئی نئی شہ نہیں تھی،چرچ نے عامتہ الناس پر جو غیر فطری جنسی پابندیاں عاید کی تھیں، جس نے انکی نگاہ میں نکاح کو ایک قید بنادیا تھا،اور اسکے عدم وقوع کی جیسی تعریف کی جاتی تھی اسکا اثر یہ ہوا کہ دورن خانہ دینی مدارس،کلیسا،مراقبہ خانے اور عبادت خانوں سے لیکر محلات تک،اور عوام تک جنسی کج روی عام تھی چونکہ طلاق پر کلیسا کی اجارہ داری تھی، لہذا کلیسا نے نکاح کو ایک شادی ایک وقت کے کلیہ تک مقید کرکے رکھدیا تھا لہذا،محرمات سے غیر محرمات تک جنسی آوارگی عام تھی،ہر جگہ وہی اصول تھا جو ہمارے ہاں عام ہے کہ طاقتور کو چھیڑو نہیں کمزور کو چھوڑو نہیں،جو ہاتھ چڑھ گیا پکڑ لو ورنا نظر انداز کردو۔اطالیہ میں پوپ کا بورجیا خاندان جس کے پوپ کے ناجایز طریقے سے پوپ بننے اور گھریلو جنسی معاملات کی آزادی کی گواہی تاریخ سے فکشن تک ملتی ہے کا کیسے انکار کرنا ممکن ہے،ڈیورانٹ سے سیزر بورجیا ڈرامہ سیریل تک میں اسی تاثر کی بازگشت سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔

---

[10] **الاحد:اشاعت عدد: ۶۵۰:**

خانقاہ[11] نامی ایک ناول(۱۷۹۶) یورپ میں ایک صدی تک معیوب و ممنوع رہا جس میں خانقاہ میں ہونے والے جنسی معاملات کی تصویر کشی کی گئی تھی بلکہ رواں صدی تک کلیسا کے عہدیداروں کی جانب سے بچوں سے بد فعلی کے معاملات پر پوپ و کلیسا کو معافی مانگنی پڑی ہے،فرانس جہاں جنسی آوارگی کی کوئی حدودو قیود متعین نہیں تھیں اور آج بھی وہاں کی آزادی و جنسیت کی توسیع معروف امر جانی جاتی ہے، وہاں کے شاہی دربار میں علما اور فلاسفہ تک میں کج روی عام تھی،لوئی چودہ (۱۶۳۸ تا۱۷۱۵)اور اسکے جانشینوں میں جنسی آزادیوں کا یسا چلن عام تھا کہ اکثر ،کنواریوں کو چھوڑ کر شادی شدہ عورتوں سےجنسی تعلقات قایم کرتے رہتے تھے جس کو زیادہ شوق ہو تاریخ پڑھے یا ورسائی ڈرامہ سیریل کےدو سیزن دیکھ لے،اسی فرانس کو جو جنسی ورثا منتقل ہوا اسکے سبب فرانس عروج و زوال کا وقفہ وقفہ سے شکار ہوتا رہا،جرمنی نے اسکی آزاد روی ،داخلی کج روی و جنسی انتشار کا ایسا فایدہ اٹھایا کہ ۱۸۷۰ کی سیڈان جنگ میں فرانسیسی بلکل پھس ثابت ہوئے اسی طرح مابعد ہم دوسری جنگ عظیم میں دیکھتے ہیں کہ کیسے اپنی عمارتوں عورتوں،سڑکوں اور پر آسایش زندگی کے تحفظ کے نام پر تربیت یافتہ،ہتھیاروں سے لیس فرانسیسی دل ہارتے گئے ،پسپا ہوتے گئے اور بلاخر جرمن فوجیں وہاں آکر تخت نشین ہوگئیں۔

جنسی آزادی و آوارگی مرد و عورت کی جنسیت میں مشغولیت اور ان آزادیوں کی قیمت قومی تشخص کی بربادی و تباہ حالی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے،عین یہی حال ماضی میں روس کا تھا جسکی تصویر کشی ٹاسٹائی نے وار اینڈ پیس میں کی ہے،آزادی کی ہمیشہ کچھ حدود ہوتی ہے ،کبھی بھی مطلق آزادی انسانی تمدن کے لئے شافی ثابت نہیں پائی ہے۔

<u>جدید ٹیکنالوجیکل تمدن کے عروجی سرمائے ریاست امریکہ کی بابت محمد قطب فرماتے ہیں کہ:</u>

جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے تو اسکی پر فریب زندگی کا پردہ چاک کرنے کے لئے خود امریکی حکومت کے فراہم کردہ اعداد و شمار کافی ہوتے ہیں،جن کے مطابق امریکہ کے ثانوی اسکولوں کی ۳۸ فیصد لڑکیاں حاملہ پائی گئی ہیں؛یونیورسٹی کے نچلے درجات کی طالبات میں یہ تناسب نسبتاً بھت کم ہے،کیونکہ وہاں کی لڑکیاں انکی نسبت ذرا ہوشیار و تجربہ کار ہیں وہ مانع حمل ادویات و تدابیر سے بخوبی واقف ہیں[12]۔

مشرق کی عورت جب مغرب کی عورت کو رول ماڈل بنا کر اسکے جتنے حقوق مانگتی ہے تو کیا ،مغربی عورت کی اس حیات کے پس پیش محرکات،اسکی مجبوریوں،تہذیب،تمدن،ثقافت،اقدار کی تفریق کو مد نظر رکھتی ہے یا بنیاد اڑا کر صرف چھت و کمروں کو مطالبہ کرنے لگتی ہے،اس پر دروازہ ٹھوکتی ہے یا دروازہ ہر ایک لئے کھولے رکھتی ہے۔

---

[11] ***(The Monk: A Romance*** **is a <u>Gothic novel</u> by <u>Matthew Gregory Lewis</u>, (** **ایم‌جی‌لیوس:خانقاہ:اوردو مترجم :،ظہر الحق علوی**

یہ اصل کامل ناول کا ترجمہ نہیں بلکہ اسکا اختصار ہے اس میں چرچ میں پائی جانے والی جنسیت کو نشانہ بنایا گیا ہے

[12] **قطب،محمد۔اسلام اور جدید ذہن کے شبہات‌ٔالبدر پبلی کیشنز ۔لاہور۔۲۰۱۸ ۔صہ:۲۵۸،۲۷۔**

اہم سوال تو یہ ہے کہ مغرب کی عورت جیسی بنکر اسکو حاصل کیا ہوگا اور اسی مغرب کی عورت اسی تمدن وتہذیب کو چھوڑ کر مشرق کے عام فرد کی رفیقہ حیات بننے کے لئے کیوں آمادہ ہوجاتی ہے؟

ہمیں ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ نسائی بحثوں اور برابری کے مسلہ کے نتایج کیا نکلےہیں تو سنیں ژی ژیک ایک بد تمیز منہ پھٹ قسم کا مغربی مفکر جانا جاتا ہے اس نے ایک جگہ ایک ایسی بات لکھی ہے جو کہنے کو مغربی جنسی نفسیات و آزادی کی آئینہ دار ہے مگر جس سے صاحب نظر یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کہیں موصوف اپنے گھر کا قصہ دوسرے کے سر تو منڈھ نہیں رہے ہیں،وہ کہتا ہے کہ:

حال کا قصہ ہے ایک صاحب حسب معمول کام کے لئے گھر سے نکلے،کسی کام سے جلد واپس آنا پڑا تو دیکھا ایک مرد گھر میں موجود ہے ،بیوی کی حالت بھی عجیب عجلتی قسم کی دکھتی تھی قبل اس کے وہ پوچھتا یہ کون مرد ہے اور گھر میں میرے پیچھے کیا کررہا ہے اسکی بیوی بولی کہ تم بے وقت کیوں گھر آگئے ہو اور میری پرائیوسی کیوں متاثر کررہے ہو؟

کون نہیں جانتا کہ گزشتہ سو ڈیڑھ سو سالوں یورپ و امریکہ میں عورتوں کو برابری کے نام پر زیادہ سے زیادہ روزگار ،عہدوں اور دیگر مواقعوں کو مردوں کے مقابل نا صرف بڑھانے کی حکمت عملی جاری و ساری ہے بلکہ کئی ملازمتیں مردوں پر صاف بند کردی گئیں ہیں،دوسری اور تیسری دنیا کو بھی عالمی معاہدوں ،مطالعاتی دوروں،تعلیم و تعلم اور غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعے اسی روش کو اختیار کرنے پر آمادہ کیا جارہا ہے،مگر اسکے باوجود انکا مسلسل سو سال سے یہی کہنا ہے عورت و مرد میں اتنی زیادہ تفریق موجود ہے اور انکو مطلوب برابری کا عدد و تناسب تاحال حاصل نہیں ہو پایا ہے ،ان امور پر ہم مغرب کے کچھ ماہرانہ تاثرات اہل مشرق کے سامنے گوش گزارنا پسند کرینگے۔

سیلویا ہیلٹ[13] برطانیہ کی ایک جنسی امور کی ماہر ہے خصوصا مرد و زن کے مباحث اسکی دلچسپی و تحقیق کا خاص محور ہیں وہ کہتی ہے کہ:

مجھے اس امر پر انتہا کا افسوس ہے کہ جاب مارکیٹ میں مرد و زن کی تفریق کا خواب ایک خوفناک خوب میں بدل چکا ہے۔

[13] **Sylvia Helwett.**

پھر کہتی ہیں کہ:

اس صدی کا ایک خاص جذباتی نعرہ یہ رہا ہے کہ مرد و زن میں کوئی فرق نہیں ہے،جبکہ ابھی ہمارے پاس جو اعداد و شمار ہیں وہ اس امر کے غماز ہیں کہ آج پہلے کے مقابلے مین کئی گنا خواتین گھر سے باہر کام کررہی ہیں جبکہ بہت سے عورتیں اونچے عہدوں تک پر براجمان ہوچکی ہیں،لیکن اس تمام ترقی یافتہ تبدیلی کے نعروں کے باوجود یہ عورتیں اپنی ماووں کے مقابل کم خوشحال نظر آتی ہیں۔[14]

این موییر[15]: اپنے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

جانے کہیں ایسی کونسی غلطی ہوگئی ہے کہ (مغربی) عورت کی آزادی راہ میں رکاوٹ ڈال دی ہے آخر کیا وجہ ہے کہ مساوی تعلیمی مواقع ملنے کے باوجود،مردوں و عورتوں کے یکساں تعلیمی نتایج کے باوجود جاب مارکیٹ میں دونوں جنسوں کے کامیابی کے مقابلے میں نمایاں تفریق ملتی ہے۔[16]

مشرق کی عورت مغرب کی عورت کی ظرح بننا اور اسکے جیسے حقوق مانگتی ہے حلانکہ دونوں کے فکر،تہذیب،ضروریات و مجبوریوں میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے،مشرق کی عورت سے مرد یہ نہیں کہتا کہ اج کما خود بھی کھا ہمیں بھی کھلا چند نالایق بے غیرتوں سے ہٹ کر مشرق کا مرد اپنے پورے خاندان اور بیوی بچوں کو حسب اسطاعت روٹی ،کپڑا اور مکان دینے کے لئے کولہو کا بیل بن جاتا ہے جبکہ مغربی عورت کو اپنی چھت،ذمین،روزگار و عزت سب کما کر حاصل کرنے ہوتے ہیں۔

وہاں جو خوش نصیب اولاد رکھتے ہیں ایک عمر بعد انکی اولاد بھی گھر سے نکل کمانے میں مشغول ہوجاتی ہے ،خاندان و ماں باب ان سے دور ہوجاتے ہیں،سالوں ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ پاتے ہیں،ماں کہیں کسی اور بوائے فرینڈ کے ساتھ ہوتی ہے ،باپ کہیں اور اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ہوتا ہے،اکثر و بیشتر بچوں کی کم عمری میں ماں باپ الگ ہوجاتے ہیں ،اولاد رل جاتی ہے اور عموماً ماں یا باپ کی موت تک انھیں دیکھ نہیں پاتے ہیں،مشرق میں اسکے مقابل زمانہ قدیم سے ایک مضبوط اشترک ذمہ داری پر استوار رشتوں ناطوں کا حسین تعلق صدیون سے موجود رہا ہےجسے عورت مارچ کے چوہدی تباہ و برباد کرنے کے درپے ہوگئے ہیں۔

---

[14] **Hewlett,Sylvia ,A.A lesser life.michael Joseph.london.1987.**

[15] **Anne Moir.**

[16] **Moir,Anne&jessel,David.Brain sex:The Real Difference Between Men And women.1991.**

<u>امریکی ماہر بشریات پروفیسر لائیونیل ٹایگر کا کہنا ہے کہ:</u>

ہمارے معاشرے بنیادی طور پر مردوں کے موافق آتے ہیں،کیونکہ(گھر سے باہر)معاشرے میں کامیابی کے لئے ہماری عورت کو اپنی نسائیت کی قربانی دینی پڑتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مساواتِ مرد و زن کے نتیجے میں سب سے زیادہ نا انصافی عورتوں کے ساتھ ہی ہوتی نظر آتی ہے ،کیونکہ کامیابی کے لئے عورت کو اپنا آپ یعنی اپنی خودی کی قربانی دینی پڑتی ہے جب ان سے مردوں کا مقابلہ کرنے کا کہا جاتا ہے جسکا نتیجہ عورتوں کی مسلسل محرومی اور حالیہ بڑھتی ہوئی نفرت و بے چینی کی صورت میں برامد ہوتا ہے[17]۔

تحریک نسواں کی حمایت کرنے والے مردوں کو جنسی اختلاف و تفریق کی بحث سے زیادہ زنانہ جنس سے زیادہ عملی مطلب ہوتا ہے،ہوسکتا ہے کہ کچھ کم علم یا غبی الذہن جدید الخیال مرد اسکی کچھ جذباتی یا آزاد روی کی ذاتی فطرت و میلان کے سبب اسکی حمایت کررہے ہوں مگر درون خانہ حقیقت یہ ہے کہ مرد و عورت کی برابری کے فلسفے کا فایدہ عورت کی جگہ مرد کے فایدے کی صورت میں زیادہ نکلتا ہے ،جس کی وجہ سے کچھ مرد حضرات اپنی اس سیاست سے بڑی تعداد میں ایسے مردوں کو بھی روزگار سے محروم کردیتے ہیں جو کسی موقع ،مقام،عہدے یا رعایت کے زیادہ حقدار ہوتے ہیں،مگر سرمایہ دار کو چونکہ عورت کو ذینہ بنا کر دولت میں اضافے کا شوق ہوتا ہے ۔

جو،صارفانہ سیاست کی تشفی کا بھی بخوبی سامان پیدا کرتا ہے ساتھ میں کام کرنے والے مردوں اور خود سرمایہ کار کے لئے بھی حسین ماحول اور مواقع پیدا کرتے ہیں ساتھ ساتھ ایک کمزور اور کم قیمت محنت کونے والی مخلوق بھی دستیاب کرلی جاتی ہے،اگر یہ کہا جائے کہ میری سوچ و فکر چھوٹی ہے جیسا کہ اس طرح کے لوگوں کو عامر لیاقت حسین سے حسن نثار تک یا وقار ذکا جیسے جدید ماڈرن میڈیا پرسنز ان ناموں و تاثروں سے نسبت دیتے ملتے ہیں مگر وہ شاید یہ بات فراموش کرجاتے ہیں کہ اس بات کو اہل یورپ کے جنسی مباحث (جینڈر اسٹڈیز) کے محققین بھی ڈھکے چھپے انداز میں مانتے ہیں،جیسا کہ متعلقہ حوالے اس امر کی شہادت مذکورہ الذکر سطور میں پیش کردی گیئں ہیں، حلانکہ اہل مشرق خود اپنے مقامی لوگوں کے مطابق زیادہ جنسی حبس زدہ ماحول کے مالک ہوتے ہیں ایسوں کو ٹھرکی کے نام سے عامیانہ زبان میں یاد کیا جاتا ہے۔

ستر کی دھائی میں جنسی مباحث و تنقید کی ایک کتاب جو کافی متنازعہ بھی تھی اس موضوع کے لوگوں میں زیر بحث رہی تھی جسکا نام :زنانہ ہیجڑا[18] تھا۔ایک جرمن آزاد طبع حقوق نسواں کی علمبردار خاتون جرمین گرئیر[19] جنکا جرمنی سے تعلق تھا نے اس کے تشنہ طلب امور کو مذید وسعت

---

[17] **Lionel,Tiger.The possible orgins of Sexual Discrimination :The Impact Of Science On Society.XX.No:1.**

[18] **The female Eununch.**

[19] **Germaine Greer.**

عطا کی اور تیس سال مباحث کی تبدیلی کے بعد نئے جدید مباحث سے اسکی تکمیل سرانجام دی اسکا تھا اس میں جرمین نے ان امور اور وجوہات پر روشنی ڈالی ہے جو عورت کی [20]نام مکمل عورت ترقی ،برابری اور رفعت کے آگے دیوار بنے کھڑے ملتے ہیں موصوفہ ایک جگہ اعتراف کرتی ہیں کہ:جنسی آزادی مرد کے حق میں ہی مفید ثابت ہورہی ہے۔ جیسا کہ وہ کہتی ہے کہ:

Sexual Liberation Harms Women more Then men:women Continue to Experience the momentous Consequences Of Pregnancy ,While the men body is un effected.[21]

جنسی آزادی کے ضمن میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اسکا نقصان مرد کے برخلاف عورت کے نقصان کی صورت میں زیادہ نکلتا ہے،کیونکہ چونکہ وہ نتیجتاً حاملہ ہوجاتی ہے اور مرد کی صحت پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

اسے اس بحث کے اس پہلو پر بھی تشویش لاحق ہے کہ مرد چاہے شادی کرے یا جنسی بوائے فرینڈ بنے وہ بعد میں طلاق یا تعلق توڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے جبکہ عورت کو ماں کی ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے نتیجتاً اس تہذیب جدید کو معاشرتی تناظر میں سنگیں بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

<u>جیسے کہ جرمین ہمیں باور کراتی ہے کہ:</u>

۱۹۷۱ میں ہر بارہ میں سے ایک خاندان تنہا والدین پر مشتمل تھا ، یہ تعداد مابعد ۱۹۸۸ میں سات میں ایک اور ۱۹۹۲ میں پانچ میں ایک تک جا پہنچی ہے۔

<u>وہ مستقبل بینی کرتے ہوئے کہتی ہے کہ:</u>

۲۰۲۰ تک ایسا معلوم پڑتا ہے کہ برطانیہ کے ایک تہائی گھر (۳۳ فیصد) صرف ایک فرد پر مشتمل ہوا کرینگے جن میں بڑی تعداد عورتوں پر مشتمل ہوگی۔

مغربی محققین کو اپنے فلسفہ زندگی سے آنے والی تبدیلیوں اور طوفانوں کا بخوبی اندازہ ہے اور اسکی تباہ کاریوں میں ایسا جنسی ماحول پیدا ہونا شامل ہے جو خود اپنے ماننے والوں کو ڈسنے لگتا ہے،یورپ و امریکہ میں جنسی جبر کی شرح تباہ کن حد تک تیز چلی جارہی ہے کئی جگہوں پر یہ پچاس فیصد تک جا پہنچتی ہے ،اور ان مواقع پر وہ عورت جو جبر کا شکار ہوتی ہے اور وہ جو اس

[20] **The Whole Women .**

[21] **Greer,Germaine.The Whole Women.Anchor Books.NewYork.2000.**

پرجبر کرتا ہے دونوں ایک دوسرے سے نا صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ ان میں ماضی میں کافی گھرے مراسم بھی پائے جاتے ہیں ،نا سننا اس معاشرے میں قتل تک نتیجہ ظاہر کردیتا ہے،ویسے تو عورت کو اپنی مرضی شادی کرنے میں استعمال کرنے کا جایز حق حاصل ہے ،مگر جب وہ یہاں تعلقات کے ضمن میں اپنی مرضی سے کسی کو مسترد کرتی ہے تو وہ نفسیاتی فرد اس نا صرف اس کو اپنی توہین جان کر اس پر حملہ آور ہوجاتا ہے، بلکہ انکے مثل اسی طرح کبھی کبھار عورتین بھی مرد کی آبرو ریزی کرتی پائی جاتی ہیں نئے سے نئے جنسی انداز ومواقع پیدا کرنا عام بات جانی جاتی ہے۔

ہالینڈ و جرمنی کے ساتھ یورپ میں ایسے ساحل موجود ہیں جہاں کامل برہنگی و جنسی اختلاط کی کھلی اجازت ہوتی ہے اور اسکی ویڈیوز آن لاین موجود ہے، اس طرح کے ساحلوں پر ننگی سیر خوری اور جنسی اختلاط سر عام ،کھیل کھیلے جارہے ہیں۔

بھارت جو جنسی فلموں کا بڑا گڑھ ہے وہاں ایسی مغرب زدہ جنسیت عورتوں کی قلیل الباسی اور کھلے عام معاشقوں کے سبب پھیل چکی ہے کہ وہاں انفرادی آبرو ریزی سے اجتماع آبرو یزی عام بات بن چکی ہے۔

<u>**امریکی خاتون ،سماجی کارکن و ماہر نفسیات میری پایفر[22]: کہا کہنا ہے کہ**</u>

ماضی کی نسبت آج کی لڑکیوں کو زیادہ مشکلات کا سامنا درپیش ہے،مجھے یاد ہے کہ میں جب تیس سال قبل خود ایک نوجوان لڑکی تھی ، مگر مجھے آج کی لڑکیاں جب سے زیادہ مظلوم اور زمانے کی ستائی ہوئی دکھتی ہیں،کیونکہ وہ ایسی ثقافت کی پیداوار ہیں جہاں جنسی نراج و تصاویر عام بات ہیں انھیں ایسی دنیا میں چلتے پھرتے کیسے تحفظ حاصل ہوسکتا ہے[23]۔

اگر تم عورتوں کی بری حالت کو دیگر سابقہ ادیان کی روشنی میں دیکھتے ہو جن سے اہل یورپ اور انکے مقلدوں کو سابقہ رہا ہے یا انکو اسکا کبھی ذاتی تجربہ رہا ہے اور جنھونے مذہب کی جن اصولیات،فروعیات اور انکی تعبیرات کو طعن و تشنیع کا محل جانا ہے ان مغربی اہل مذہب کو بہت حد تک ایسے ظالمانہ احکامات پر تنقید کا حق جایز طور پر فلسفہ مذہب کی اجتماعی آدرش سے فراہم کیا جاسکتا تھا مگرجب ایمانیات کی اقدار قایم و دایم ہوکر قلوب میں راسخ ہوجاتی ہیں تو ظلم اطاعت کے نقطہ نظر میں متبدل ہوکر قلب ماہیت کا سبب بن سکتا ہے،مگر اسلام کو جبکہ وہ صدیوں سے عورتوں کے جایز فطری حقوق میں آگے آگے رہا ہے کو بھی اسی لاٹھی سے ہانکنا قطعاً غیر علمی،اخلاقی اور غیر مہذب طریقہسمجھا جانا چاہئے اگر چہ میں اسلام اور دیگر ادیان میں عورتوں کو حاصل حقوق کی

---

[22] **Mary Pipher.**

[23] **Pipher,Mary. Reviving Ophelia :Saving The Selves of Adolescent Girls.Ballantine Books.Newyork.1994.**

تفریق پر کافی اشارے سابقہ سطور میں بیان کرچکا ہوں مگر پھر بھی دوبارہ عود کر یہ دکھانا ضروری محسوس کرتا ہوں کہ عیسائیت اور دیگر ادیان عورت کی بابت کس پیچیدگیت کا شکار تھے ۔

آگسٹاین نے آدم و حوا کے جس اذلی گناہ کی فکر عیسائیت میں راسخ کی تھی وہ روح و فکر اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ پال (ساول) آف ٹارسس،پیٹر،جیمز ،یوحنا اور فلپ کے بھی اذہان میں ایسے موجود نہیں تھی،مگر اس فکر کے سبب بعد ازاں سینٹ آگسٹاین عیسائی کلیسا کی رہبانیت کے جواز کو ایک نظریہ فراہم کرکے فکری طور پر عیسائیت کا صدیوں بااثر رہنے والا مفکر بن بیٹھا۔

آگسٹاین کے بعد عورت کی جنسی مبادیات سے روحانی مبادیات تک پر بحث و فکر کا آغاز شروع ہوا جس وقت مدینہ میں اسلام عورتوں کو نبی اکرمؐ کی رہنمائی میں بتدریج شرعی مشروط و جایز آزادی کے ساتھ ساتھ فرایض کی بجا آوری کے مطالبہ کے ساتھ بتدریج حقوق عطا کرہا تھا عین اسی دوران عیسائی یورپ میں عورت کی جوہریت پر گفتگو جاری تھی۔

عین اسی دوران عیسائی علما میکون میں ۵۸۵ عیسویں میں اس بحث میں مشغول تھے کہ آیا عورت جسد و روح کے اختلاط سے متشکل ہوئی ہے یا خالی خولی جسد کا نام ہے،معلوم پڑتا ہے کہ اس میکون مجلس میں مباحثہ انکے ہاتھ رہا جو اسے خالی جسد جانتے تھے اور اسکی روح کو اسکا غیر سمجھتے تھے صرف عظیم باکرہ مریمؑ اس معاملہ میں ایک استثنائی کلیہ کا درجہ رکھتی تھیں۔

یہ بحث اسکے علاوہ فرانس تک میں جڑیں پکڑ چکی تھی،جہاں اسے روح سے اختلاط پذیر ماننے کا تصور ۵۸۶ میں آگ پکڑ رہا تھا ،اب اس فرانسیسی مجلس کے مذاکرہ کار اس ندرت کو شامل بحث کرچکے تھے کہ چلو مان لیا وہ ایک روح رکھتی ہے کیونکہ روح نجات ،حمل،جزا و سزا ،جنت و دوزخ کے لئے ناگزیر ہوتی ہے،مگر اسکی روح ہے کس نوعیت کی حامل ؟جانور کی مشابہ روح بھی اس میں ممکن ہے مگر خیر انکو اتنی عقل تو تھی کہ اس روح کو انسانی توروح مانا گیا مگر اس پر یہ اضافہ کیا گیا کہ ایسی روح جو مرد کی خدمت گزار روح ہوتی ہے، ان مباغث کے برخلاف اسلام ایسی بحثوں میں بہت سادہ اور واضح ہونے کے ساتھ ساتھ اعمال میں عورت و مرد کی تفریق کا دعوے دار نہیں ہے رسل کو عیسائیت کی ان بحثوں کا تمسخر اڑانے میں خاصی فرحت محسوس ہوئی جب اس نے اپنی کتاب: میں عیسائی کیوں نہیں ہوں میں انکا تذکرہ فرمایا ۔

ارسطو کی علمیت و سیادت عموماً ملحد وغیر ملحد سبھی مانتے ہیں اس طرح سائینس والوں کو بھی وہ کچھ حد تک سائینسدان دکھتا ہے ، بعد ازاں اسکی قیاسی منطقی منہج کو عیسائیت سے لیکر اسلام تک میں رسوخ حاصل ہوا بلخصوص عراقی فقہ یا فقہ حنفی میں اسے اہم ماخذ گردانا گیا اسکی اپنی تحقیق بقول رسل اتنی گھری دیرپا اور پر تجربہ نہیں تھی کہ وہ ایک قریبی مشاہدے یعنی دانتوں کی تعداد پر کچھ زیادہ محققانہ کہہ پاتا خیر دانت تو ہم میں سے کسی نے خود سے کسی دوسرے کے نہیں گنے ہونگے مگر ہمارا کوئی دعوی دانتوں کی بحث میں کچھ نہیں ہے۔

خیر چچا ارسطو عورتوں اور غلاموں کو مردوں سے کمتر جانتا تھا ،اسکے لیے اسکے پاس جو جواز تھے ان میں یہ سے ایک دلیل یہ بھی موجود تھی کہ عورت کی عقل تو مرد سے کم ہوتی ہی ہے کیونکہ اسکے دانتوں کی تعداد بھی اس سے کم ہوتی ہے۔[24]

رسل کی اس پر یہ تنقید ہے کہ اگر چہ اسکے پاس دو بیویاں موجود تھیں مگر اس نے کبھی انکے دانت گن کر اس مفروضہ کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ،شاید رسل نے تجربہ کرنے کے لئے گنے ہونگے یا اس نے طبیبوں اور جراحوں کی کتابی خبروں پر صغری قایم کیا ہوگا؟،ایا خود کسی کو روشنی میں داخل کرکے اس مفروضہ کو غلط ثابت کیا ہوگا اتنا تو طے ہے کہ اہل مذہب کے ساتھ ساتھ اہل سائینس اور فلاسفہ بھی ٹھیٹ مقلدیت کے اسیر ہوتے ہیں،بھلا گھر کی چیز کے دانت نا گننا صدیوں کا ظلم ہی کہا جاسکتا ہے۔

اگر ایک طرفآج کا مشرق مغرب کو دیکھ رہا تو ساتھ ساتھ یہ ذہنی غلام مشرق یہ بھی دیکھ لیتا کہ انکا پیارا مغرب اپنی جدیدیت ،مغربیت اور نشاۃ ثانیہ کی تباہ کاریوں سے خود بڑا پریشان ہوچکاہے جیسا کہ ہنٹنگٹن کو اصرار ہے کہ مغربیت و جدیدیت کو علیجدہ علیجدہ علیجچہ رکھا جائے،اسکے مطابق یہ جدیدیت شروع شروع کی اقدار بدلی کا کھیل ہے مابعد اس میں اپنے ماضی اور ثقافت کی انفرادیت اور اسکے طرف رجعت کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، ویسے بھی اسی مغرب کے لوگوں کا خود کے بارے میں اور اپنی عورت کے بارے میں اب نسبتاً ذرا ایک مختلیف موقف تشکیل پانے لگا ہے ۔

<u>الیکس کیریل کا کہنا ہے کہ:</u>

موجودہ سماج کی دیگر غلطیوں کی طرح اسکی نمایاں غلطیوں میں یہ بھی شامل ہے کہ اس نے اول تو تربیت کی اہمیت کو فرموش کردیا ہےاور اگر اسکو کچھ اہمیت دی بھی ہے تو صرف اتنی کے خاندان کے جگہ اسکولوں کو اہمیت دینے لگے ہیں،آج کی ماں اپنے بچوں کو نرسری میں اس لئے چھوڑ کر جاتی ہے کہ وہ اپنی معاش کے لئے ،اپنی شہوت رانی کے لئے،فضول قسم کی فنون پرستی کے لئے،برج کھیلنے کے لئے ،سینما جانے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت بچانا چاہتی ہے،اس طرح خود کو بے کار اشیا میں مشغول کرنے کے درپہ ہے،اس طرح کی حرکات و سکنات نے خاندانی نظام جو تربیت کے لئے ناگزیر ہوتا ہے کو تتر بتر کرکے رکھ دیا ہے۔

<u>مسز ہٹسن شا نامی طبیعات دان کا کہنا ہے کہ:</u>

ہماری تہذیبی بنیادیں تباہ ہونے کے قریب ہیں،کیونکہ اسکی بنیادوں کا ضعف نمودار ہوچکا ہے،جبکہ اسکے شہتیر ہل چکے ہیں،نا جانے یہ عمارت کب کہاں پیوندِ خاک ہوجائے،عرصہ دراز سے ہمارا مشاہدہ ہے کہ لوگ نظم و ضبط کی پیروی کرنے سے گریزاں ہیں،اسکے بقا کی یہی صورت مجھے نظر آتی ہے کہ مرد و عورت کے آزادانہ میل جول پر پابندی عاید کردی جائے۔

[24] **Russel,Bertrand.Impact Of Science On Society.Newyork**.

کہنے کو مرد و عورت کی برابری کی بابت دعوے کرنے والے یہ کہتے ملتے ہیں کہ بطور جنس دونوں یکساں ہیں بس ظاہری وظایف و صفات کا تنوع الگ الگ ہے مگر اہل مغرب کے ماہرین اس بحث کے جوہر کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں،مرد کا عورت کی طرف اور عورت کا مرد کی طرف میلان ڈھکا چھپا قصہ نہیں حقیقت ہے،مرد و عورت کے مخلوط تعلیمی ادارے ہونے چاہئے یا نہیں میری بحث کا محور نہیں ہے،میں خود ایک مخلوط تعلمی ثقافت کی پیداوار ہوں اور جانتا ہوں کہ اس نظام کے بالغ حصے میں مرد استاد اور اسکی شاگردائیں باپ بیٹی ،بہن بھائی نہیں ہوتے ہیں نا ہی ہماری شریعت انھیں محرمات تسلیم کرتی ہے،چناچہ دونوں درون خانہ ایک دوسرے سے جتنا ممکن ہو مادی وجنسی فائیدہ اٹھا لیتے ہیں،کئی اساتذہ ظاہراً اپنی شاگرداوں کو بیٹی یا بہن کہتے ہیں مگر درون خانہ دونوں میں تعلق رومانوی و جنسی ہونا کوئی غیر معروف بات نہیں ہے،یہ تو ہمارا معاشرتی ڈھکوسلہ ہے ہمارے برخلاف مغرب یہ جھوٹے خود ساختہ منافقانہ رشتے بنا کر کھیل نہیں کھیلتا ہے،وہ عموماً گناہ ہو یا ثوب ہو اسے با بانگ دھل سرانجام دینے میں ہی فخر محسوس کرتا ہے۔

لڑکیاں شاید اپنے ہم عمر لڑکوں کے حسن و عمر،قد و قامت سے متاثر ہوتی ہونگی ان پر مرتی ہونگی مگر،شاگردائیں اپنے اساتذہ کی علمیت،طرز نشست،طور اطوار،بلخصوص زبان دانی سے جلد متاثر ہوجاتی ہیں،فرائیڈ کے مطابق پیدا ہوتے بچے میں بھی جنسی لذت کا احساس پایا جاتا ہے،بیٹی باپ کی طرف جھکاو رکھتی ہے اور بیٹا ماں کی طرف جھکاو رکھتا ہے۔

مجھے میری کئی ہم جماعتوں نے بتایا ہے کہ لڑکی استاد سے متاثر ہوتی ہے اور استاد کے کسی لڑکی کے طرف جھکاو سے تشویش کا شکار ہوجاتی ہے،یا جلن کا شکار ہوتی ہے،کچھ ناز و انداز سے اظہار کردیتی ہیں تو کچھ ،ڈھکے چھپے انداز میں اظہار کرتی ہیں اور کچھ موقع دیتی ہیں کہ ان سے اظہار کیا جائے،عورت کیا سوچتی ہے اور اسے کیا پسند ہے اس بابت اسکی آنکھیں ظاہراٍ بہت کچھ کہہ دیتی ہیں مگر اسکی حیا اسکے لبوں سے اسکا انکار کروادیتی ہیں۔

اور یہ سب ظاہر ہے ہمارے مخلوط تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ ،دو مختلیف مگر ایک دوسرے کی طرف جھکاو اور التفات رکھتی جنسوں کی فطرت کے بھی سبب ہے اہل مغرب کو شروع سے ان امور کی تفتیش میں بڑی دلچسپی رہی ہے وہ کبھی کاروباری تناظر میں تو کبھی تعلیمی،علمی و نفسیاتی تناظر میں ایسی کتھاووں کی تفتیش میں سر پھوڑتے نظر آتے ہیں۔

سوشل علما نے اس امر میں تحقیقات کرکے یہ دیکھنے پرکھنے کی کوشش کی ہے کہ حسن و جمالیات کا سماج و تعلقات میں کیا کردار رہا ہے جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ جیرالڈ ایڈم جیسے سماجی سائینسدان نے بھی یہ امر تسلیم کیا ہے کہ لوگ حسن سے متاثر ہوتے ہیں چھرہ جسکا آئینہ دار ہوتا ہے یعنی چھرہ جنسیت کی قوت میں اضافہ کرتا ہے ،اور جسمانی ساخت میں دوگنا اثر بڑھا دیتا ہے،بلخصوص عورت کا چھرہ باہمی تعلقات کی قوت میں کئی گنا اضافہ کرتا ہے۔[25]

---

[25] **Adams ,Gerald.Physical Attractivness Toward A Developmental social Psychology of Beauty.Human Development.pp:217..239.**

آج ہم جسمانی طور پر شاید خود کو آزاد محسوس کرتے ہوں یا اپنی انا پر پڑنے والی چوٹ کی ضرب سے بچنے کے لئے خود کی آزادی کے دعوے کرتے ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں اور دیگر استعماری قوتوں نے محکوم ممالک کو اول جسمانی غلام بنایا پھر بعد ازاں بتدریج جامعات کے ذریعہ انکی روحوں کو بھی غلام بنالیا ،انھونے جب کہ دیکھا کہ وجود پر حکمرانی مین نقصانات اور تاریخی بدنامی زیادہ مل رہی ہے،جسکے سبب انکا سیاسی ،علمی اور ثقافتی اثرو نفوذ کمزور پڑ رہا ہے لہذا انھونے اپنی کمزور ہوتی حالت کو بچانے کے لئے سیاسی آزادی دیکر بدلے میں انکی جوہری آزادی اپنے قبضے میں کرلی ، اس ضمن میں انکی فکری معاونت کے لئے جامعات اور سماجی علوم نے یہ کام بخوبی طور پر سرانجام دیا،ہماری تحریک آذادی کے زیادہ تر رہنما اور سیاسی کارکن وکالت کی تعیلم اور اسکے شعبہ سے وابستہ تھے چناچہ انکے ذریعے برطانوی قانونی نظام،اقدار ،اور روشن خیالی مسلم قیادت میں بھی نفوذ پذیر کرگئی،سماج،سامراج،ریاست ،حکومت،تعلیم اور اس سے تشکیل کردہ اقدار کا بڑا باہمی تعلق ہوتا ہےذیل کے اقتباس سے گفتگو میں رنگ پیدا کرنے کی امید کرسکتے ہیں۔

<u>نیویارک یونیورسٹی کے یہودی محقق نیل پونٹ مین کہتا ہے کہ:</u>

ہر دور کا ایک مخصوص سامراجی نظام ہوتا ہے،عین ایسے جیسے ہر فاتح کے بھی سامراجی عزایم ہوتے ہیں،جیسا کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں برطانیہ نے اس فن کو بکمال بروئے کار لانے میں چابک دستی کا مظاہرہ کیا تھا،چناچہ جب وہ کسی ملک پر حملہ کرنا چاہتا تو وہاں اپنے بحری طاقت بھیجتے پھر بعد میں ادھر ذمینی دستے بھیجے جاتے،اسکے بعد انتظامیہ کا عدد آتا اور آخر میں اپنا تعلیمی نظام اس ملک میں نافذ کردیتے تھے۔[26]

برطانوی جامعات نے جو ہمارے اجداد کی ذہنی تربیت کی وہ ان میں بھلے اتنی طاقتور نہیں رہی ہو جتنی برطانیوں کو مطلوب تھی مگر اسی نمونہ و نصاب پر استوار ہماری ملکی جامعات نے ہمیں ہمارے بڑوں سے کئی گنا زیادہ آزاد خیال اور جدید الفکر فرد بنادیا ہے،شاید بھارت میں لوگ ،دین و دنیا کو مذہب سے ہٹ کر ویسے الگ الگ شہ نہیں سمجھتے ہوں،جیسا آج ہماری نئی نسل کا موقف ہے مگر جدید پاکستانی ریاست میں اسلام کا نام استعمال کرنے والے اورعدم استعمال کرنے والوں کی نیت و اہداف جموہریت نوازی اور اسکے لوازمات سے محبت کے سبب یکساں رہی ہے،اس کے نتیجے میں ہماری لوگ انسانی حقوق ،نسائیت و جمہوریت کی روشنی میں اپنےسارے اقدار کو منقلب کرنے لگے ہیں،جسکا ایک چھوٹا سا نمونہ عورت مارچ اور اس سے متعلقہ مباحثہ ہے۔

جدید الفکر عورت چاہے وہ حجاب کرتی ہو یا،حجاب نا کرتی ہو،عبایہ پہنتی ہو یا جینز چڑھاتی ہو ،چاہےاسکے افکار اقدار کی اصلاح چاہتے ہوں، یا مرد کی برابری اسیکی نئی ایمانیات میں شامل ہوں،یا اس وہ کلی طور سے اس بدنصیب مرد سے کامل نجات کی شوقین ہو ان سب طرح کی خواتین کو اپنی پیشرو نسل کی خواتین کی تشکیل کردہ صدیوں کی اقدار سے اللہ واسطے کا بیر رہا ہے۔

---

[26] **Post Men,Neil. Conscientious Of Objections: Stirring up trouble about language ,Technology and Education.vintage.Newyork.1992.**

آج پھر اپنے ذہنی و فکری یا پھر قلبی قرار کے لئے موجودہ مغرب مشرق کی طرف دیکھ رہا ہے،اور ہمارا یہ مغرب صدیوں سے مشرقی عیسائیت، اسلام اور مشرق کی بابت غلط فہمی کا بھی شکار رہا ہےاور ساتھ ساتھ یہاں کی خواتین کو دیکھنے کے لئے پرتجسس بھی رہا ہے،اس کی کارٹونوں میں ایک ایسی کارٹون کی شبیہ اکثر چھلکتی ملتی ہے جس میں صحرا میں موجود نخلستان میں ایک عرب گندمی رنگت کی بڑی بڑ ی کالی آنکھوں والی ،گھنی زلفوں والی،پتلی کمر بھاری کولھوں اور ابھرے سینے کی حسینہ بکریوں کے ساتھ ٹہلتی نظر آتی تھی،کوئی اسکو نقاب پہنادیتا تھا،کوئی حجاب،کبھی یہ قافلے کے ساتھ عربی میوزک کے پش منظر میں اونٹ پر بیٹھی سفر کرتی دکھتی تھی۔

یہ تو خیر فلموں ،کارٹونوں،اور ڈراموں کی کلاسیکل عربی حسینہ کی تصویر کشی ٹھری ایک مغربی اسکو کیسے بیان کرتا ہے اور خود کے لوگوں کی غلط فہمی کو کیسے عیاں کرتا ہے ذرا غور سے ذیل میں اقتباس پڑہیں۔

<u>فرانسیسی تاریخ دان لیوں مشل لکھتا ہے کہ:</u>

ہر یورپین کو سمجھو یہ گمان ہوتا ہے کہ جب وہ افریقہ(کے مسلمان ممالک) جائیگا،تو اسے وہاں ایسے خوبصورت و شاندار محلات سر اُٹھائے نظر آئینگے جنکی بالکونیاں سڑک پر کھلتی ہونگیں،اور جہاں ایک پرکشش قیدی(یعنی کوئی افریقی یا افریقی مسلمان خاتون)اس انتظار میں کھڑی ہوگی کہ کب ایک چمکتی ذرہ پہنے ہوئے فرانسیسی جوان آکر اسکی نجات و مکتی کا سامان پیدا کریگا،یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ وہاں بالکونی پر لگی موٹی جالی(عربی:شناشیل:مشربیہ)اس بات کو ناممکن بنادیتی ہے کہ کوئی باہر والا اندر جھانک تانک کرسکے۔[27]

معاشرتی و مذہبی پابندیاں مردوں اور عورتوں دونوں کو ہی حدود و قیود میں رکھتے ہیں بلخصوص مرد کی جسمانی و جنسی فطرت ان میں تند و تیزی اسے عورت کے مقابل زیادہ غصیلہ،ہٹیلا،لڑاکا اور زیادہ محرک بنادیتے ہیں اسی بات کو ایک سماجی سائینسدان یوں بیان کرتا ہے ۔

<u>الفرڈ کنزی کا موقف یہ ہے کہ:</u>

اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں ہونی چاہئے کہ اگر معاشرتی حدود و قیود موجود نا ہوں تو پوری دنیا کے مرد کثیر تعداد میں اپنی کل حیات میں خواتین سے شادیاں کرتے پھرتے، جو عموماًمردوں کی خواہش کے برعکس بیک وقت ایک مرد کے ساتھ میں ہی خوش رہتی ہے۔[28]

---

[27] **bullock ,Katherine .Rethinking Muslim Women And Veil. Virginia .2002. Cited : Michel,Leon.(1883:tunis) .**

[28] **Kinsey.Alferd C.Pomeroy ,Wardell B.And Martin ,Clyde E. Et.alSexual Behavior in Human Male.W.B.Saunders.Philadelphia.1948**.

اقدار ، بہت حد تک کسی نظریے،فکر،تصور یا عقیدے کی مابعد الطبیعات کی اساس بھی کہے جاسکتے ہیں اور اسکی اخلاقی پیمایش و رفعت کا قدری اظہاریہ بھی گردانے جاسکتے ہیں،چناچہ ہم معاشرتی ہوں یا مذہبی اقدار ہوں ہر ایک کی اہمیت کو نا ہی بطور مرد مسترد کرسکتے ہیں اور نا بطور عورت ہماری شخصیت انکے احاطہ سے باہر ، لہذا مغرب کا مرد ہو یا مشرق کی عورت دونوں اپنی سماجی قدریں اپنے اقدار پر استوار کرتے ہیں۔

گوربا چوف سویت یونین کا وہ حکمران فرد ہے کہ جس کی حکمرانہ پر سویت یونین کا وفاق اختتام پذیر ہوا ،اس نے یلسن سے قبل ہی بہت سے امور پرکھ اور سمجھ لئے تھے،اسکی پراسڑایکا اور گلاسنوسٹ کی حکمت عملیاں اشتراکی سماج کی آخری بنیاد ہلانے والی حکمت عملیاں تھیں اسے روسی سویت وفاق کی اخلاقی کمزوریاں بھی سمجھ آچکی تھیں، لہذا مشرق کی سرخ انقلاب کی حامی عورتیں،مائیں اور لنگڑے لولے مارکسی مرد ذرا اسکا تبصرہ غور سے پڑھیں۔

<u>گورباچوف لکھتا ہے کہ:</u>

اب خواتین کے پاس اتنا وقت نہیں رہا ہے کہ روز مرہ کی ذمہ داریاں پوری کرسکیں،میرا مطلب ہے گھر کا کام،بچوں کی تربیت،اور فیملی کا ماحول پیدا کرنا،ہم نے یہ دریافت کیا ہے کہ ہماری مشکلات یعنی بچوں اور نوجوانوں کا رویہ ،ہماری اخلاقیات ؛کلچر اور پیداوار میں کمی ان سب مشکلات کی ایک بنیادی وجہ خاندانی رشتوں کا کمزور ہونا،اور خاندانی ذمہ داریاں نبھانے میں سست روی اختیار کرنا ہے۔

<u>مابعد جناب گوربا چوف معاشرے سے ایک چبھتا ہوا معنی خیز سوال دریافت فرماتے ہیں کہ:</u>

What should we do to make it possible for Women to return to their purely Women Mission?

ہم ایسا بلآخر کیا کرسکتے ہیں کہ ہماری خواتین اپنے اصلی مشن(منزل مقصود) یعنی خواتین کی اصل ذمہ داری کی طرف رجعت اختیار کرسکیں؟[29]

میری جابجا متعلقہ بحثیں جو ممکن ہے کچھ حضرات کی نگاہ میں غیر متعلقہ گفتگو ہوں اور مذکورہ بالا حوالہ جات اتنا تو بیان کر ہی چکے ہونگے کہ مغرب جسکے طرف مشرقی نسائیت نگاہ پھاڑ پھاڑ کر رہنمائی و تقلید کرنے کے لئے دیکھ رہی ہے خود اپنی اساس و نسائیت پر کیا سوچنے لگا ہے، جدید الفکر خواتین و حضرات کے اٹھائے گئے زیادہ تر سوالات کا جواب میں تین جوابوں اور انکے بعد کی بحث میں دے چکا ہوں انکے پس پشت علمیت سے اٹھتے مسایل اور ان پر مغرب کے نقد پر بھی کافی کلام کردیا گیا ہے۔

---

[29] **Gorachev,Mikhail.Perestroika:New Thinking For Our Country And World.Harper and Row.Newyork.1988.**

اقدار کی بحث سے قبل کچھ گفتگو ہم نے ایک حوالے کے ذریعے مغرب کے چند سو سال قبل کے مردوں کے تناظر میں کی تھی جسے یہ گمان تھا کہ وہ مشرق جاکر وہاں کی عورت کو بھلا پسھلا کر آزاد کرواسکتا ہے،اور بالکونی میں لٹکی عورتیں اسکا فقید المثال استقبال کرینگی،اگر اس بحث کے سیاق و سباق کو بہ نظر غایر دیکھا جائے تو بخوبی اندازہ ہوگا کہ مغرب ہو یا اسکے مقلدین دونوں کو عورت چھپی ہوئی نہیں،کھلی ہوئی پسند ہے ،جیسا کہ جرمنی اور ہالینڈ کے نیوڈ(برھنہ) ساحلوں پر مادر پدر آزادی کے ساتھ جنسی جوڑے اور پورے پورے خاندان مکمل ننگے گھومنا آزادی و تہذیب کی معراج سمجھتے ہیں اسی طرح صدیوں بعد بھی مسلم دنیا کی عورتوں کی بڑی تعداد چاہے وہ نقاب لیتی ہو یا حجاب یا دوپٹہ لیتی ہو اپنی مرضی کے ان اظہاریوں کو پسندیدگی کی نگاہ سی دیکھتی ہیں،اور جبھی یورپ و امریکہ ریاستوں پر دباو،اور اپنی تخلیق کردہ،ہدایت کردہ این جی اوز کے ذریعے انکی ذہنی کایہ کلپ کرنے میں مشغول ہیں،جسکا نتیجہ بلآخر نوے سال بعد یہ نکلا کہ سعودیہ نے بھی اعتدال پسندی کے نام پر ریاستی حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کی اور مرد اور مردوں کو س تناظر میں کئی آزادیاں عطا کیں مگر بہ حیثیت مجموعی شہریوں کی بڑی تعداد نے ان اصلاحات کو پسند نہیں کیا ہے،کچھ عشروں قبل ایک تحقیق میں اہل مغرب کے متعصب محقق کو بھی مسلمان عورتوں کی ان فکری بنیادوں نے حیرت و استعجاب کا شکار کردیا تھا۔

نکولس کرسٹاف ایک متعصب اسلام مخالف محقق جانا جاتا ہے اور اسکی تحقیقات،سروے،انٹریوز میں مختلیف اخبار و جراید کی زینت بنتے رہتے ہیں اس کو ۲۰۰۲ میں یہ خیال چرایا کہ مسلم عورت پر کچھ لکھے ،جسکے لئے اس نے کچھ مسلم خواتین سے انٹرویوز کئے چناچہ بعد ازاں یہ تحقیق نیویارک ٹایمز میں چھپی،اسکی حجاب کی مخالفت اور افکار سن کر معلوم پڑتا ہے کہ خواتین نے اسکا موقف نہیں مانا تھا ابلکہ الٹا حجاب کی حمایت کی تھی۔

<u>لانا نامی ایک نیوٹریشنل طبیب نے اسکے دریافت کرنے پر اسے بتایا کہ:</u>

میں اپنا جسم و چھرہ ڈھانپ کر رکھتی ہوں،اور اسی میں خوش ہوں ویسے بھی میں ایک مذہی رجحان کی حامل لڑکی ہوں،جو احکامات خداوندی کی پیروی کرتی ہے،میں چاہوں تو کوئی بھی کھیل کھیل سکتی ہوں،ریسٹورانٹ جاسکتی ہوں،جو چاہوں پہن سکتی ہوں مگر مردوں کے سامنے نہیں،آخر میں اپنی ٹانگیں اور جسم مردوں کو کیوں دکھاوں کیا اسی کو آزادی کہتے ہیں؟(آپ لوگ)

نکولاس کو دوران انٹرویو ریاض شہر کی خواتین نے یہ بتایا کہ:جنھیں آزاد عورت کہتے ہیں وہ دراصل سعودی خواتین ہی ہیں،ہر قسم کے جنسی استحصال ،عریاں فلموں اور میڈیا سے آزاد،اپنے اجسام کو گاڑیوں اور کوکا کولا کے اشتہارات کا حصہ بنتا دیکھنے سے آزاد ،یہ دراصل مغرب کی عورت ہے جسے مردوں نے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا رکھا ہے[30]۔

[30] **Kristov,Nikolas D.Saudis In bikinis.Newyork Times.25.Oct.2002.**

میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ ہنٹنگٹن مغربیت و جدیدیت میں تفریق پر بار بار زور دیتا ہے،اسکے مطابق جدیدیت شروع شروع کا کھیل ہے بعد میں مقامی ثقافت اور ریاستی مفادات اسی مقامی و ذاتی بنالیتے ہیں جدیدیت پہلی سیڑھی پر تخریب در تخریب کرتی چلی جاتی ہے ،دوسری سیڑھی پر اپنے ذاتی تشخص و انفرادیت کا مسلہ جدیدیت کو دعوت مقابلہ دینے لگتا ہے،عین اسی طرح جہاں ایک طرف مشرق کا ایک طبقہ جدید تر بن رہا ہے،اجبکہ دوسری طرف مشرق و مغرب کا ایک جدید طبقہ دین کے قریب ہوتا جارہا ہے،یہاں سے جو لوگ آزاد خیال مغرب جاتے ہیں وہ وہاں مذہبی بن جاتے ہیں اور جو مذہبی ہوکر جاتے ہیں وہ کبھی کبھار آذاد خیال بن جاتے ہیں۔

اسی طرح مغربیت و قدیمیت کی کشمکش اکثر کی نگاہ میں،بنیاد پرستی اور روشن خیالی کی کشمکش ہے،یہ ایک چوراہے کی طرح ہے جو بہت بڑا ہے اسکے گرد لوگ مسافت طے کرتے چکر لگاتے ہیں اور نقطہ نظر اپنے اپنے تجربات و میلانات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں، میرا ناقص مشاہدہ مجھے یہ باور کروارہا ہے کہ مذہب مغرب میں واپس جگہ بنا رہا ہےجبکہ مشرق میں یہ کہیں کہیں ایک خاص کلاس میں بھی اپنی جگہ بناتا ہوا دکھ رہا ہے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ان سب سے بڑی تعداد میں ایک نئی نسل دین کی طرف واپس آرہی ہے،اسی بات کو جان اسپوزیٹو نے بھی محسوس کیا ہے جو مغرب کے چوٹی کے مشرقی امور اور اسلام کا محقق مانا جاتا ہے جسے عصر حاضر کےجدید علمِ استسشراق میں بڑا رتبہ حاصل ہے اور وہ اس بابت کیا کہتا ہے ذرا کان لگا کر سنیں:

جان اسپوزیٹو کہتا ہے کہ:

اسلام کے جدید دور کی تاریخ نے ہمارے بہت سے اندازوں کو غلط ثابت کردیا ہے،عمومی طور پر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ جب عامتہ الناس کو جدید تر بنایا جاتا ہے تو معاشرے سیکولرازم کی طرف جھکاو رکھنے لگتے ہیں۔جدیدیت دراصل عقل کے استعمال کا نام ہے،ہم دیکھتے ہیں کہ سائینس و ٹیکنالوجی جیسی چیزوں سے سیکولرآیزیشن کو فروغ ملتا ہے،مگر عصر حاضر کے مسلمانوں کی مذہبی بیداری نے تاریخ کے ارتقائی نظریہ کو غلط ثابت کرکے رکھ دیا ہے۔

حقیقت اس رد عمل میں پنہاں ہے کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں جتنی ماڈرن بنانے کی کوشش کی گئی ہے وہاں اتنی ہی مسلم بیداری بیدار ہوئی ہے،جبکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے ٹیکنالوجی و جدید تعلیم بھی مذہبی ایمان و عمل کو نیچا دکھانے کے بجائے مذہب کی معاون ثابت ہورہی ہیں[31]۔

اگر غور کریں تو بخوبی جان لینگے کہ عورت مارچ اور اسکے مد مقابل حیا مارچ درحقیقت مذکورہ بالا بحث کے تناظر میں کافی شافی علمی اشکالات کو رفع کرسکنے کے حامل مواقف کا عملی ثبوت ہیں۔

عورت مارچ والیاں ہوں یا انکے حمایتی حمیت و غیرت کے معنی و مفہوم سے ناآشنا مرد ہوں جو اپنی عورتوں پر قابو پانے کی صفات کی کمی کو اس دعوے سے پورا کرتے نظر آتے ہیں کہ ہم اپنی

---

[31] **Esposito ,John L.Islam:The Straigh Path.Oxford University Press.NY.1988.**

،بھن،بیٹی،بیوی،ساتھی یا ایسے اور اس کے مماثل کسی بھی تعلق کی حمایت کرکے درحقیقت رجعت پسند معاشرے میں نقارہ بجانا چاہتے ہیں،فرض کریں جدیدیت،روشن خیالی،سیکولرازم کچھ سال جڑیں پکڑ لیتی ہیں ،ایک دو دھائی ،پانچ یا دس عشرے بعد اگر یہ قصہ پارینہ بن جائیں اور جنکو آج ہمارے دور میں قدامت پسندی و رجعت پسندی کہا جاتا ہے وہ اس دور کا لیٹیسٹ جدید موقف مانا جائے تو اس وقت یہ اپنی فکر کی ترویج کو کیا نام دینگے ؟،کیا وہ جو آج انکی نگاہ میں رجعت پسند ہیں ،مگر کل وہ انکے مقابل جدید نئے موقف کے حامل جانے جائینگے ،یا میں نا مانوں بات کی رٹ کو دھرا کر پھر بھی اسے قدامت پرستی کہنگے ،حلانکہ نئی نسل کی نگاہ یہی نیا فیشن اور ٹرینڈ ہوگا اور خود انکی نئی نسل ممکن ہے انکو بھی رجعت پسند قرار نادینے لگے؟

اتنا تو سمجھنا چاہئے کہ اقدار چاہے مذہبی ہوں یا غیر مذہبی نوعیت کے حامل ہوں یہ سب ہی ایک خاص نظم و ضبط اور ضبط نفس کا تقاضہ کرتے ہیں،ہم بار بار یہ بات دھرا چکے ہیں کہ جو مذہب اور اسکے اقدار کے منکر ہیں وہ خود بھی انکے مقابل نمٹنے کے لئے کسی موقف یا مذہب کے حامل ہوتے ہیں، اور لازماً انکے مد نظر بھی کچھ نا کچھ اقدار موجود ہوتے ہیں،جبکہ اس بحث وہ لوگ جو فری اسٹایل ریسلنگ والا رویہ اختیار کرکے،متنوعیت،ثقافتی تکثیریت،آزاد خیالی کے لامحدود چھکے چوکے مارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں وہ دراصل نراجی قسم کے لوگ ہوتے ہیں،ضمیر کی آواز،اخلاقی اقدار کے منکر،فکری خانہ بدوش واقع ہوتے ہیں،یہ عورت مارچ نما افکار کے حامل لوگ دراصل نا ہی مغرب کو صحیح طرح سمجھ سکے ہیں اور نا خود کو جان پائے ہیں ، حلانکہ صہٰح ہو یا غلط ،نیک ہو یا بد،خیر ہو یا شر مغرب کے بالغ الفکر مفکرین و سائینسدان بھی کسی نا کسی نہج سے اقدار و اخلاق کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں دو چار حوالے ذیل میں دماغی لطف و ذایقہ کو دوبالا کرنے کے لئے پیش خدمت کئے جاتے ہیں:

<u>پال جانسن جیسے مورخ کو یہ کہنا پڑا ہے کہ:</u>

ہم ایک ایسی دنیا میں جہاں منطق کے اصول و قوانین بدل جائیں اور اور شکست و ریخت کا شکار ہوتے نظر آئیں،یہ بات دیکھ کر کر کچھ خاص حیرت نہیں کر پاتے ہیں کہ جدید دور ویسی صورت نہیں اپنا سکا ہے جیسے وہ ۱۹۲۰ میں تشکیل شدہ نسل کو منطقی دکھتے تھے۔

کو مذہب ،بلخصوص عیسائیت پر کافی تحفظات تھے،منکر دین لوگوں کے نزدیک آج وہ ایک **<u>رسل</u>** حوالہ جاتی سند جانا جاتا ہے مگر اسے بھی سماجی نراجیت اور اخلاقی ابتری پر بڑی تشویش محسوس کہتا ہے کہ:[32]ہوئی تھی جیسا کہ وہ بقول جوزف ووڈ کرچ

ظابطے اور پیمانے قیاسی چیزیں ہیں ،لیکین بحر حال یہ امر بھی بے حد مشکوک دکھتا ہے کہ کوئی انسان اس یقین کے بغیر کہ وہ جیسے بھی حقیقی پیمانے ہیں،روحانی یا طبعی طور پر زندگی گزار سکتا ہے۔کیونکہ ان ظابطوں کے بغیر معاشرہ انارکی کی لپیٹ میں آسکتا ہے اور فرد کو اپنی ذات و

---

[32] **Joseph wood Krutch**

کائینات کے درمیان قایم ہوجانے والے ناقابل برداشت عدم توازن اور بے ہم آہنگی کا احساس ہونے لگتا ہے،آخر کار وجدانی و جذباتی طور پر انسان آج ایک اخلاقی جانور سے زاید کچھ نہیں ہے۔

<u>اس بات پر افسوس کرتے ہوئے اقدار کی بے قدری کا یوں رونا روتا نظر آتا ہے:[33]لیوش ممفورڈ</u>

پتھر کے دور کا غریب ترین وحشی بھی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی اتنی مفلس،کنگال،اور اخلاقی گراوٹ میں لتھڑی ہوئی سماجی زندگی کا فرد رہا ہوگا جیسے ہم ہیں۔

جب افکار بازاری کے سبب بھانت کی بولیاں ہر نکڑ و چوک پر بولی جانے لگیں، ہرایرے غیرے اور نتھو خیرے کی چاندنی ہونے لگی ،ہر فرد جمہوریت،سرمایہ داری،اور سیکولر ازم کے دم پر افکار و ثقافتوں کے تنوع کی ایمانیات میں آزادی رائے کی مطلق العنانیت کو ملا کر آٹا گوندھنے لگا تو مغرب والے بھی ان اضافی و ذاتی،خودساختہ خیروں کے تصادم سے ڈرنے لگے اور انھیں ان کے اتنی کثرت کے سبب نمودار ہونے والی ضبو حالی پر اپنی تشویش چاندی کے ورق میں لپیٹ کر ظاہر کرنی پڑی۔

<u>کو کہنا پڑا کہ:[34]جیسا کہ جوزف فلیچر</u>

اضافی اور متعلقہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ کسی نا کسی کے حوالے سے یہ اضافت ہوگی،قطع اضافی ہونا خود میں میں غیر مرتب ہونا ہے،ناقابل قیاس،ناقابل تصفیہ،لایعنی اور غیر اخلاقی ،حقیقی اضافیت کے ہونے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ اسکی کوئی معروضی اور مطلق قدر ہو۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کی نگاہ میں فلیچر عام فہم اور صریح بات قارئین تک نہیں منتقل کرسکا ہو

<u>کو اس بات کو عام فہم مگر واضح انداز میں سپرد قلم کرنا پڑا کہ:[35]ڈنکن ولیمز</u>

ایک غیر منظم ،منتشر اور اٹکل پچو دنیا میں وفور جذبات سے ابھرنے والے نتیجہ پر بھروسہ کیوں کیا جائے؟۔[36]

اگر اس پوری بحث اور مابعد کی تحریروں کو بہ نظر غایر مطالعہ و مشاہدہ کیا جائے اور کسی کو خود کے مسلمان ہونے پر بھی اصرار ہوتو وہ عقل کے ناخن لے ورنا اپنی منافقت و دینی غداری پر ماتم کرے۔

---

[33] **Lewis mumford.**

[34] **Joseph Fletcher .**

[35] **Duncan Williams.**

[36] **مذید حوالوں اور بحث کے لئے دیکھیں:طارق جان:سیکولرازم :مباحث و مغالطے۔**

عورت مارچ میں آئی ہوئی خواتین کے پوسٹرز کا اگر معاشرتی،ثقافتی تناظر میں بھی مشاہدہ النفس کیا جائے تو ان نعروں اور مبہم جنسی اشاروں سے ہی انکے تحریر کرنے والوں اور نعرہ مارنے والوں کے ذوق کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

عورتیں صدیوں سے اپنے معاملات کو جنسی طور ڈھکی چھپی کج رویوں اور اپنے ہم جنسیت پر جذبات و احساسات کو معاشرہ اور مذاہب کے نزدیک انکے کج روی پر مبنی ہونے کے سبب چھپاتی آئی تھیں،بلخصوص مشرق میں تو انہیں اتنا خفیہ رکھا جاتا تھا کہ دیواروں کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی،یہ امور برطانوی دور غلامی کے جدید اوردو ادب میں اس دوران کھل کر نمودار ہوئے، جب عصمت چغتائی،خدتیجہ مستور،اور منٹو جیسوں نے اس کو کھل کر اب کے ذریعے معاشرہ میں عیاں کردیا تھا ،اسکی حدت و شدت کتنی ہے اس امر سے اسکا ارتکاب کرنے والے اور اللہ ہی آگاہ ہیں،مگر جامعات اور یکساں جنس کے کالجز و اسکولوں سے ایسے امور کا معاملہ اکثر و بیشتر خفیہ ذرایع سے معلوم ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ بطور مثال و حجت اگر ہم ان مطالباتی پلے کارڈوں پر نگاہ ڈالیں جن میں خواتین عورت میں خود کفالت کی طرف [37]مارچ میں ان امور کی طرف اشارہ کرکے مردوں کو زنانہ ہم جنسیت کو فروغ دیں،اور یہ [38]اشارے کرتی نظر آتی ہیں اور انھیں مشورہ دیتی دکھتی ہیں کہ وہ بھی لواطت انکا ڈھکا چھپا موقف ہے کہ مرد مردوں سے تعلقات استوار کریں اور عورتیں عورت سے جنسی تعلقات کرکے جنسی خودکفالت کو رایج کریں اور انکا جنسی استحصال مذید کرنے سے اجتناب برتیں ،لہذا مردوں کو عورتوں سے جنسی تعلقات پر اب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عورت کو نا ہی اسکی اب تعلقات کے ضمن میں خاص ضرورت ہے اور نا اس قسم کے تعلقات کے لئے آج کی جدید مشرقی عورت بقول انکے اپنی خودی کھونا چاہتی ہے۔

اس بیانیہ کو ایک موصوفہ نئے پلے کارڈ میں موجود جنسی مشورے کو اعلان کی صورت میں اس فحاش بد گوئی سے بیاں کرتی ہے کہ :

تم آگے نہیں پیچھے ڈالو

یعنی ان جدید الفکر خواتین کے مطالبے کی رو سےآج کے ظالم و جابر صدیوں سے عورت کا استحصال کرنے والے مرد کو اب صنفِ نازک کے فرج کا آسرا چھوڑ دینا چاہئے اور مرد سے ہی لواطت پر اکتفا کرنا چاہئے،یہ بیانیہ ،مطالبہ اور مشورہ اسے جو بھی نام دے لیں ، ان خاتون کی ماں اسکی بیٹی اور باپ کی باہمی ذہنی تربیت،و تعلق کو عیاں کرتے ہیں، جس سے اسکا تعلق ہوتا ہے،جنھونے ان لڑکیوں کے ہاتھوں میں اس قسم کے واہیات اور غیر مہذب قسم کےجنسی مطالبے کو تھمایا سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ لڑکی انتہا کی بے حیا اور ہر قوسم کے اقدار کی منکر نظر آتی ہے جو اسے ایسے غیر فطری روابط و تعلقات فطری نظر آنے لگتےہیں،اس لڑکی کی اقدار میں

---

[37] **Lesbianization.**

[38] **Sodomy.**

یہ تغیر جدید دور کی فطرت کے مطابق عین زمانی و حادثاتی نوعیت کا حامل ہے ممکن ہے کہ یہ مورثی یا پھر کسبی نوعیت بھی رکھتے ہوں مگر بحرحال اسکا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے، ہماری پاکستانی ناقص اسلامی جمہوریہ میں ایسے نعرے آزادی رائے و اظہار کے نام پر بلند کرنا دراصل حقوق حاصل کرنے کے مطالبے سے ایک قدم آگے فطرت سے انکار و بغاوت کا نقارہ بجانا ہے،جس ہماری ریاست کے اربابِ حل و عقد منہ میں گھگیاں ڈالے بیٹھے ہیں،شاید ہماری کل قوم کی غیرت کا جنازہ دھوم سے نکل چکا ہے اگر ابھی کچھ خاموشی ہے تو کل ان پر عمل بھی زیادہ دور نہیں ہے۔

آج کل کچھ خواتین ہنسی مذاق میں یہ کہتی دکھتی ہیں کہ ہمارا خاوند ہو یا غیر خاوند ہمارے ساتھ زور زبردستی سے نہیں بلکہ محبت سے تعلق قایم کیا جانا چاہئے ،ہم بھی کافی حد تک اس نعرے و کارڈ کو زوجاوں کے انکے خاوندوں سے مطالبے کے طور پر ہی دیکھتے ہیں باقی ناجایز تعلقات چاہے باہمی رضا سے ہوں یا عدم رضا سے اس میں میں زبردستی کرنا تو کوئی بھی باشعور اور ہوشمند انسان پسند نہیں کریگا،جبھی اغلباً اس نعرے میں شوہر ہی کی طرف اشارہ غالب نظر آتا ہے۔

آپ نے سنا ہی ہوگا کہ نا ہوگا بانس نا بجے گی بانسری ایسے ہی ایک موصوفہ یہ پلے کارڈ اٹھائی نظر آئیں تاکہ پیدایش نر کی بنیاد ہی نہیں ڈالی جاسکے،اور پیدایشِ مادہ پر اس گروہ کی سائینسدان خواتین کوئی نیا کرشمہ دکھانے میں مگن ہونگیں، مطلب سیدھا سادہ سا ہے کہ نا ہی یہ موئی بچہ دانی ہوگی یعنی اب ان کے لبوں پر یہ مطالبہ بھی آگیا ہے کہ ہم بچہ پیدا کرنے [39]اور نا کوئی پیدائیشی موقف ہوگا کی مشین نہیں ہیں، لہذا جب یہ ہی نہیں ہوگی مراد شاید اسکے غیر فعال کرنے کی طرف ہے یا سرے سے اسکا وظیفہ و مقام ختم کرنے کی اس بابت اجمال کے سوا کوئی صریح کلام سامنے نہیں آپایا ہے؟،چناچہ یہ اگر ہوگی بھی تو آئیندہ سمجھو یہ اب گھسے پٹے بھاری بھرکم حمل کے عمل میں بروئے کار نہیں لائی جائے گی،ممکن ہے کہ یہ جدید الفکر طبقہ میں ایک زیادہ نرالا ماڈرن نمونہ ہوں اور شاید یہ نعرہ بھی موصوفہ کا ذاتی موقف ہو، جبھی جو صاحب بچے نہیں چاہتے ہیں وہی ان سے شادی کریں باقی فٹے منھ کرکے دور رہیں۔ ویسے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ موصوفہ اپنے والد محترم سے اگر وہ انکی نگاہ میں محترم ہیں سے ایسا احتجاج کرتیں تو بہت عمدہ ہوتا؟ کہ کیوں انکی والدہ صاحبہ کو موصوفہ کو حمل میں پالنا پڑا ،وہ اتنا سال انتظار کرواکر بیٹی سے یہ لکھوا کر اپنا وقت ذایع کرتی رہیں جو بیٹی کے ذریعے کہلوایا وہ خود کہہ دیتیں تو آج سالوں بعد جوان ہوکر بیٹی کو اتنی محنت نا کرنی پڑتی۔

ان پلے کارڈوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرد کئی جگہ ان پلے کارڈوں سے اتنے کم عزت محسوس ہونے لگے ہیں کہ انھیں انکے پس پشت بھی تو،ٹڑاپ سے یاد کیاگیا ہے،اس ضمن میں کھیرے کو بھی کنیاوں کی جانب سے خود کفالت کا معیار قرار دیا گیا ہے،اور مرد کی بابت صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ہمیں تیری ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہم نے فلاں فلاں سبزی کے ذریعے خود کفالت کی حکمت علمی اخذ کرلی ہے،یعنی کہ عورت مارچ عصمت چغتائی کے لحاف کی ماڈرن

[39] نو بچہ دانی: No Opinion.

تفسیر بنکر سامنے آیا ہے، یعنی اب اوردو ادب کو ایک نیا معیار ملا ہے جو اسکی جنسی غیر فطری خود کفالت کی عکاسی کرتا ہے۔

ماضی کے سوشلسٹ مارکسٹ،انارکسٹ جس طرح فوجی حکمرانوں کو آمر مانکر انکے خلاف زبان کھولنا انکے خلاف تحریک چلانا ایک نیکی یا آدرش تصور کیا کرتے تھے ،اسی طرح عورت مارچ والے عورت کو ہی نیکی کا ماخذ نہیں تو کم از کم مساوی رکن تسلیم کرنے پر لازمی اصراری نظر آتے ہیں،بھارت میں تو کل ڈرامہ اور فلم انڈسٹری عورت کے راج ،قوت،عزت و وقار کے بابت آدرش سے بھری پڑی دکھتی ہے،چاہے کوئی دیو مالائی مذہبی داستان جیسے راماین و مہابھارت کے ان گنت ورژن ہوں یا تاریخی فلمیں ان سب میں خواتین اپنے حقوق کے ڈایالاگ بولتی نظر آتی ہیں،کئی ہندو دیومالائی ڈراموں میں خالق کائینات برھما کی کھلی بے عزتی ہوتی دکھائی گئی ہے،شیو تباہی کا بھی دیوتا دکھایا گیا ہے اور وومن رایٹس کا مبلغ بھی ظاہر کیا گیا ہے،ایسے ہی ایک ڈرامے آدھی دیوی(پاروتی) میں اسے تشویش ظاہر کرتا دکھایا گیا ہے کہ ،تری مورتی سے بڑی کوئی شکتی ہے جس نے تری مورتی کو بھی یہ سب فرایض و وظایف سونپے ہیں ،پھر شیو کی زوجا پاروتی کو آدھی شکتی اور کائینات کی اصل قوت کے طور پر دکھایا گیا ہے،جدید صدی بھارت میں ہندو دتا کے عروج کی صدی ہے رام،اور وشنو جیسے صدیوں کے طاقتور دیوتا کی جگہ طاقت،تباہی کی جوڑی شیو اور کالی ہندو ڈراموں کی بالا تر قوت کے طور پر نظر آنے لگے ہیں،انکے ساتھ ماڈرن ،ہیومن رایٹس کا وومن امپاور ڈسکورس ڈراموں کی طاقتور نسائی کرداروں سے چھلکتا محسوس کیا جاسکتا ہے بلکہ پورا انسانی حقوق کا چارٹر،حقوق النسا کی بازگشت اصلی سیتا سے سیتا و گیتا تک نظر آتی ہے یہ امر صاف نظر آتا ہے کہ خواتین ناظرین کے لئے اور انکی دل لگی کے لئے باقاعدہ ہدایتیں دے کر طاقتور مکالمے تیار کروائے گئے ہیں۔

رام رامایں میں عورت حقوق پر لیکچر دیتا نظر آتا ہے تو سیتا راون کو خواتین کی بابت لمبا چوڑا لیکچر دیتی نظر آتی ہے،پاکستان و بھارت میں مظاہروں ،مارچوں میں فیض و جالب کی نظمیں دیکھیں گے اور دستور خواتین کے لبوں سے نکلتے نظر آنا عام بات ہوچکی ہے۔

ادب میں پراگریسو مصنفین کی جس کھیپ نے ۱۹۳۰ سے اب تک سفر طے کیا ہےانکے گیہرے اثرات،سابقہ مارکسیوں کے شانہ بشانہ عورت مارچ میں نمودار ہوتے نظر آتے ہیں،عورت مارچ والیوں کا یہ ایمان لگتا ہے کہ مرد کو جنسی تشفی کے لئے انکی سخت ضرورت ہے،مگر آج کی عورت انکے مطابق اتنی باشعور ہوچکی ہے کہ اپنے مسایل و وسائل کو بخوبی پہچان سکتی ہے،اور مرد کو یہ باور کراسکتی ہے کہ صدیوں سے ظالم وہی رہا ہے اور مظلوم صرف عورت رہی ہے،اور مرد کو اگر اس سے جنسی تشفی چاہے نکاح کی صورت میں پوری کرنی ہو،یا زنا بلرضا کی صورت میں کرنے ہو وہ جان لے کہ اب اس صدی میں اصل حاوی کردار عورت کا ہونا چاہئے،عورت اسکو بھیک میں اپنا تعلق جبھی عطا کرنے پر راضی ہوگی کہ وہ اسے اپنے مساوی جانے،اسے ہر طرح کی آزادی عطا کرنے میں رکاوٹ نہیں ڈالے،ساتھ ساتھ وہ یہ بھی مطالبہ کرتی نظر آتی ہیں کہ وہ جسمانی و طبعی بنیادوں سے بھی مرد جتنی ہی طاقتور ہیں بلکہ مرد سے زیادہ جسمانی ہیت میں طاقتور

ہیں،کیونکہ مرد کے مد مقابل وہ بچہ دانی میں اسکے پیدا کردہ حمل کو لیکر پھرتی ہیں لہذا مرد کو اسکا احترام مرد کے مقابل ہر روپ میں کرنا چاہئے۔

ہم جانچتے ہیں کہ اس پوری نسائی بحث کے زیادہ تر متنازعہ نعرے حقوقِ نسا کی بابت کم اور جنس کی بابت زیادہ اظہار کرتے نظر آتے ہیں،جن سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مرد نا کسی عورت کا بھائی ہے اور نا بیٹا،بھانجا ،بھتیجا،چچا یا ماموں بلکہ یہ انکی نگاہ میں یہ ظالم ،جابر بد کردار، صدیوں سے استحصال کرنے والا سر تا پا بس ظالم و جابر زندہ وجود مرد ہی ہے۔

عورت مارچ سمیت اس بحث کے تنقیدی رخ میں کہیں بھی مرد کی تربیت میں عورت کے کردار ،بطور ماں ،بھن اس پر اسکے اثرات اور انکے ضمن میں مرد کے دیگر خواتین سے رویہ و سلوک کو سرے سے بحث کا حصہ ہی نہیں بنایا گیا ہے ،جس کی رو سے بیٹی باپ کی بیٹی اور بھائی کی بھن بعد میں ہے اور اول عورت اور مظلوم عورت پہلے ہے باپ اول ظالم ہے بعد میں باپ ہے۔

اس قسم کے روئے درحقیقت ایک ایسی دوغلی ثقافت کو جنم دینے کا سبب بن رہے ہیں جو خود کی شناخت سے تو اجنبیت ظاہر کررہی ہے مگر دوسری تہذیب کے ساتھ فکری خلط ملط کے لئے تیار نظر آرہی ہے،یوں مغرب مشرق کے جسد میں پنہاں ہوکر مشرقی وجود کو بتدریج ختم کرنے کا سبب بن رہا ہے،یہ ذہنی غلامی سے جسدی غلامی کے طرف ایک خاص سوچ و فکر ،مفادات کے حامل طبقے کی مایہ قلبی ہے ،جس میں حقیقت کی ایسی ازسرنو تمعیر پیش نظر ہے جسکے طفیل مشرق کو مغرب کے ایسے طفلیہ کا کردار ادا کرنا ہے جو مغربی اقدار کے درون ریاست فروغ کے لئے خود کے ذاتی وجود ،خود کے ذاتی تشخص ،اور خود کی آبائی ثقافت سے لیکر اپنے کل ظاہری و باطنی وجود تک سے بھی بغاوت کرسکتا ہے،اور اس وجود کے پیش نظر حقیقت میں ایک ایسی مسلسل امتداد پذیر اضافی اخلاقیت کی تعمیر کرنا ہی اصل مقصد ہے جو خیر و شر کے مشرقی تصورات کو ملیامیٹ کرنے کے لئے اپنا تن،من دھن تک قربان کرسکنا عبادت تصور کرتا ہے۔

اس ذمن میں صنفیت کو ایک خاص جگہ دینے کی گذرشتہ سو سالوں سے ایک طاقتور کوشش جاری و ساری ہے جو بلآخر خاندانی رشتوں کے باہمی تعلقات کا خاتمہ چاہتا ہے ،انکے باہمی حقوق و فرایض اور قربانیوں کے فلسفے کو مطلب پرستی،جنسیت ،اور خواہش نفس کی طرف موڑ کر محبت و الفت و اعتماد کو رقابت و عناد میں بدل سکتا ہے۔

جیسا کہ ایک پلے کارڈ میں ہم عورت مارچ کے دوران ایک لڑکی کو یہ مطالبہ کرتے دیکھتے ہیں کہ **میری شادی کی نہیں میری آزادی کی فکر کرو**: یہ جملہ ایک ایسے مطالبہ کا اظہاریہ ہے جسکی رو سے لڑکی اہل خانہ و خاندان کی اسکی زندگی میں مداخلت کی نفی کرتا نظر آتا ہے لڑکی کا مدعا یہ ذہنیت قایم کرتا دکھتا ہے کہ تم نے مجھے پیدا تو کردیا ہے،پڑھا لکھا کر بڑھا کردیا ہے،اب مجھے اپنی قید سے بھی کامل آزاد کردو،میری حیات میں مداخلت و تسلط ختم کردو ، اپنے اور میرے مابین یہ ان دیکھے رشتے ناطوں کے بندھن ڈھیلے کردو اور مجھے ایسی آزادی دو جسکی رو سے میں اپنی مرضی سے اپنے لئے لامحدود لذت،کام،آسائیش کا انتظام کرسکوں، چونکہ میری زندگی میری مرضی ہے اور میں جس سے چاہے شادی کروں،یا نا کرو،مرد سے شادی کروں یا بوڑھے سے نکاح

کروں،یا پھر کسی سے نکاح کے بغیر تعلق استوار کروں یہ سب میرے رد و انتخاب کے دم پر ہوگا، ناکہ کہ کسی باپ،بھائی،چچا،دادا کی مرضی سے ممکن ہوگا، وہ وقت بیت گئے نسائی جھالت کے دوران تو ایسا ممکن تھا مگر ناسائی روشن خیالی کی ترویج و فروغ کے بعد میں اب چاہوں تو کسی ہم جنس لڑکی سے بھی تعلق استوار کروسکتی ہوں، اور میرے گھر والوں کا اس تعلق و معاملہ سے کچھ لینا دینا نہیں ہونا چاہئے ،اور جب گھر والوں ،ماں باپ،بھن،بھائی تک کا حق میں نے اپنی آزادی میں سے منفی کردیا ہے تو سمجھو کہ معاشرہ و ریاست بھی خود بخود اس بحث سے نفی ہوگئے ہیں، چونکہ میں ہوں جبھی میں آذاد ہوں اور میری آزادی پر کوئی مذہب ،خدا،نبی،بشر ،مسٹر و مولوی قدغن عاید نہیں کرسکتا ہے،ڈھکے چھپے انداز میں زبان سے کہے بغیر اس ڈسکورس کی جڑوں میں یہی بیانیہ کارفرما ہے:جسے میں فلسفیانہ اصطلاح میں نسائی خودی کی دریافت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

دوسری جدت طرازیاں دکھانے والوں کے نقش قدم پر چلتی ایک عورت مارچ میں شریک موصوفہ کو ہم بخوبی یہ کہتے ہوئے بلکہ سابقہ موقف صراحتسے عیاں کرتے ہوئے جانچ سکتے ہیں کہ:

،یعنی کہ گھر والوں کو ہماری جوانی کے ساتھ،ہماری تعلیم کے ساتھ **ہمیں رشتے نہیں حقوق چاہئے** ہمارے رشتے کی فکر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیں صرف آزادی کا اظہار کرنے والے حقوق دے دو تو خوب ہوگا، ،رشتہ ہم خود ڈھونڈھ لینگے،یہ انسان کی آزادی بلخصوص صنف نازک کی مرد سے آزادی کی طرف اشارہ فراہم کرتا عملی مطالبہ ہے،مردانہ جیون ساتھی اب جدید زنانہ صنفیت کی رو سے بس ایک ثانوی معاملہ بن کر رہ گیا ہے ۔ جدید نسائیت کی رو سے اصل معاملہ عورت کے ذاتی تشخص و وقار کا ہے،ایک ایسے وقار کا ہے جس میں آزادی کے ساتھ ساتھ عورت فرانسیسی انقلابِ آزادی سے پیدا شدہ مساوات کا مطالبہ کرتی نظر آتی ہے،مگر اسکے لئے تن من دھن کی جگہ بس نعرے بازی،بیان بازی،ٹاک شو تک قربانیاں دکھاتی ملتی ہے۔

مگر یہ سب ساتھ میں مرد سے مساوی ہونے کے دعوے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف جسمانی مساوات سے یوٹرن لیکر پھر عزت کے مطالبہ کی طرف رجعت کرتی ہیں،لوہا گرم ہے ایک ہتھوڑی اور ماردو ،جہاں مساوات کچھ دیر کے لئے دوران مطالبہ ہوا میں معلق کرکے جنس کے غلام مرد پر یہ قدغن عاید کرتی ہے کہ اسکی بطور عورت خاص عزت کو بھی برقرار رکھا جائے ،مگر نتیجتاً خود مرد کی عزت ،وقار،برتری کو کامل طور پر مسترد کرتی دکھتی ہے،اور ساتھ میں اسے یہ بھی دھمکی دیتی ہے اگر تم نہیں مانے تو ہم تم سے نا تعلق استوار کرینگی نا تمہیں قریب آنے دینگیں ہمارا کوئی اور متبادل ڈھونڈھ لو وہ دن گئے جب تم ہم سے بچہ پیدا کرواتے تھے،اب ہماری مرضی پر موقوف ہے بچے پیدا کریں یا نا کریں،سرمایہ داری نے اسکا بھی ایک حل جنسی گڑیاوں کی صورت میں مرد کو یورپ میں فراہم کردیا ہے،مشرق اس سے ابھی صحیح طرح آشنا نہیں ہے۔

عورت کے اگر اس موقف کو دیکھا جائے کہ وہ مرد کو شہوت کا نشانہ نہیں بنانا چاہتی ہے اور نا اسکے نازیبا کپڑے پہننے کے پیچھے اسکی کوئی بد نیتی کارفرما ہے بلکہ بد نیتی فلنفسی مرد کے ذہن کی پیداوار ہے ، وہ بیچاری تو بس کبھی لباس یا اسکے کسی جز و کل کو چھوٹا کرکے پہنتی ہے

تاکہ کوئی جسمانی حدود ، اربعہ نکھر کر سامنے آئے ،یا شریف عورت کی طرح اسے چھپا دیتی ہے یہ اسکا بس حسن انتخاب ہے،مردوں کے ذہن میں آتے خیال بس مردانہ توجہ کا نتیجہ و کمال ہے،یعنی محتمہ کوئی بھ کام حسن نیت سے کریں اسکے سرے سے سائیڈ افیکٹ سرے سے ان کی رو سے وقع پذیر ہوتے ہی نہیں ہیں؟۔

اب اس کل بحث میں یہ دیکھا جانا چاہئے کہ کسی وجود کا چھوٹا ہونا یا بڑا ہونا فی النفسی حقیقی شہ ہے یا پھر سوچ و نظر کا دھوکہ یا التباس ہے؟،ظاہر ہے اگر کوئی فرد ،مرد و عورت قمیض ہو یا شلوار ،پینٹ ہو یا شرٹ سینے والے یا بنانے والے سے اپنے جس مطالبے کی رو سے بنوائیگا وہ درزی اسکے بیان کردہ تفصیل کا خاکہ اپنے ذہن میں رکھ کر ویسا ہی بنائیگا یا بیچے گا،پہننے والے کا یہ لباسی مطالبہ بھلے اسکی نگاہ میں کوئی فیشن ہو یا نا ہو مگر اتنا طے ہے کہ ان سب کے پس پشت اسکے ذوق ،میلان،اظہار ،نمودِ خودی و نیت جیسے عوامل ضرور کارفرما ہونگے ، لہذا نا درذی خالق ہے اور نا درزی نے اس جنسی اشتھا کی افروزدگی میں کئی ذاتی نیتی یا موضوعی کردار ادا کیا ہوتا ہے، بلکہ یہ اس عورت کی ذہنی موضوعیت اور شہوت تخلیق کرنے والی کی نیت کا قصور ہوتا ہے جبکہ درزی تو بس روزی کمانے کے لئے اپنی خدمات بطور آلہ کار پیش کررہا تھا،یا بس اسکا جز وقتی ملازم تھا یا پھر ایک مقصد میں معاون تھا مطلب حقیقت میں وہ سلوائی گئی قمیص یا لباس کا کوئی بھی واضح کیا گیا جز بعد از سلائی یا تو چھوٹا ہو گا یا پھر بڑا سلے گا،چھوٹی قمیضیں جانی مانی بات ہے کہ جسمانی ہیتوں کو نسبتاً زیادہ واضح و اجاگر کرتی ہیں،بلخصوص عورت کے جسمانی حدود و اربع ،مد و جزر ،اتار چڑھاو اس میں کہیں زیادہ ن واضح ہوتے ہیں،اور عورت نے یہ سب کھیل تماشہ خود کو دکھانے کے لئے نہیں کھیلا ہوتا ہے،اگر ایسا ہے جیسا وہ کہتی ہے تو یہ کام تو وہ خود کو خوش کرنے کے لئے بند کمرے میں شیشہ کے سامنے خود کو کھڑا کرکے سرانجام دے سکتی ہے،یہ سب فیشن،ندرت،چھوٹا بڑا کرنا اسکی خودنمائی بھی ہے اور دوسروں کی نگاہ میں خود کو نمایاں ظاہر کرنا بھی ہے،وہ ماڈرن ہوکر بھلے دنیا کے سامنے کتنا انکار کرے مگر درون خانہ یہی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔

اب لازمی بات ہے کہ ان امور سے مرد کی جنسی اشتھا و شہوتوں میں بھڑکاو پیدا ہوتا ہے، یہ سمجھیں کہ پانی میں آگ لگانے والا معاملہ ہوتا ہے،کسی پر سکون تالاب میں پتھر مارنا ہوتا ہے،بلیک ہول میں کسی وجود کا گر اپنی ہستی نیست کرکے ،خود سے بے گانہ ہونا ہوتا ہے، نیکی و بدی مابین فرق کو پاٹنے کی جگہ انہیں ابھارنا ہوتا ہے،جس طرح جراثیم،وائرس اور بیکٹیریاز سے بچنا ہی عمدہ تحفظ ہوتا ہے اسی طرح جنسی اشتھا میں اضافہ روکنے کے لئے اعضا کو عیاں کرنے سے روکنا ایک حکمت و عمل بلیغ ہے ، یہ سامنے والے کو بد طریقہ سے بدی کی طرف راغب کرنا ہوتا ہے،یہ عذر کہ نیت اچھی ہو تواور عشق محمدی کا پٹہ ہو تو دوپٹہ فضول ہے ایسا ہے جیسے عیسی ؑ کا ابن اللہ ماننا بس مجازی معنی کا حامل ہے حقیقی معنی و مفہوم کا مالک نہیں ہے،،سمجھیں کہ شیطان کہہ رہا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیاہے میں نے رب تیری اجازت سے اسے ترغیب دی ،یہ اسکا قصور تھا کہ پھنس گیا، نبی اکرم ﷺنے یہ فرمایا ہے کہ جھان مرد و عورت اکیلے ہوں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے،ایعنی کہہ سکتے ہیں کہ پھر وہاں مرد و عورت کے اعمال بھی شیطان ہوجاتے ہیں لہذا عشق

محمدی میں ڈھکنے چھپنے کی سنتِ حجاب بھی شامل ہے،چناچہ جنس کو ظاہر کرکے دانہ ڈال کر مظلوم بننا ایسا ہے کہ بھوکے غریب کے سامنے روٹی کھانا اور اسکو ایک لقمہ بھی نہیں دینا۔

جبھی شریعت و معاشرہ انکے ڈھاکنے اور چھپانے کا مطالبہ کرتے ہیں،اب کیا عورت یہ حلیہ صرف خود کو خوش کرنے کے لئے اختیار کرتی ہے یا خود کو نمایاں کرنے کے لئے اختیار کرتی ہے،ظاہر ہے اسکی ذاتی نگاہ میں اس قسم کے حلیہ کی ایک متاثر کن ، داخلی ،جذباتی ،حسی افادیت ہوتی ہے اور وہ اسکی خود نمائی ہے،اگر وہ کہے کہ میں خود کو دکھانے اور خوش کرنے کے لئے ایسا کرتی ہون تو غریب کو بھی پھر امیر کی طرف دیکھ کر جلنا نہیں چاہئے،کیونکہ یہ امیر کی مرضی ہے کہ وہ جتنی چاہے اپنے مرتبہ و ثروت کی بڑھوتری کے سبب جیسی چاہے خودنمائی کرتا پھرے، جبکہ صاحب ثروت معاشرے کی نگاہ خالی پیٹ ،انصاف سے محروم غریب کا سرمایہ دار کے خلاف انقلاب لانا،مزدور کی بدمعاشی سمجھی جائیگی گی ۔

کیونکہ نگاہ و نظر غریب کے ساتھ ساتھ امیر کی بھی وابستہ ہے ،لہذا منطقی طور پر امیر کی ثروت سے اسے اس لئے بھی مشتعل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ امیر نے یہ حلیہ خود کو دکھانے اور خوش ہونے کے لئے اختیار کیا ہے،جبھی غریب کو اسکے خلاف انقلاب نہیں لانا چاہئے ، بلکہ انکے مطابق خود امیر بنکر ایسا حلمیہ اپنانا چاہیے؟عین ایسے ہی اگر کوئی عورت ننگی جاری ہو اور مرد اسے دیکھ رہا ہو تو وہ اسے نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ وہ عورت خود کو اسے دکھارہی اور خود کو اول خوش کرہی ہے،

اور مابعد الطبیعاتی غیر اقداری موقف کی رو سے مرد کو اضافی طور پر وہ راستے میں دکھ گئی ۔کیونکہ اسکی کوئی ضامنت نہیں ہے کہ ایک مرد یا سارے مرد کسی غیر اخلاقی کپڑے میں پھرنے والی عورت کے لئے باہر نکلے تھے ،جبھی حقیقت یہ ہے کہ اس صورتحال میں عموماً مرد کی نگاہ چھوٹی نہیں ہے بلکہ عورت کی قمیض حقیقتاً چھوٹی ہوتی ہے،جبھی حقیقت کا اظہار کرنا انکی آبا تہذیب مغرب کی نگاہ میں نیکی ہے ،جیسے پورن فلم کی ہیروین خود کے لئے ننگی نہیں ہوئی ہوتی ہے بلکہ کمائی کے لئے ننگی ہوکر جنسی فعل کررہی ہوتی ہے،ایسے اگر خود کو دکھانا اصل مقصود مانا جائے تو یہ مطلب گھر میں خالی کمرے میں آئینے کے سامنے بھی پورا ہوسکتا ہے،جیسا کہ سابقہ سطور میں یہ بات بیان کی گئی تھی یہاں اسکا اعادہ کردیا گیا ہے، بلکہ زیادہ اچھی طرح پورا سکتا ہے،اس تناظر میں گھر میں چھوٹی قمیض یا گردن تک چھوٹی قمیص پھن کر بھی دل اور زیادہ خوش کیا جاسکتا ہے۔

مگر اس حادثہ قصدی میں عورت چھوٹی قمیص والی اس منظریت و افادیت میں دوسروں کو بھی شریکِ ستایش کرنا چاہتی ہے،جبھی نگاہ کا چھوٹا پن ہونا حقیقی چھوٹی قمیض کی حقیقت سے کنارہ کشی نہیں کرسکتی ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ عورت کا مرد کو دکھانا اصل مقصودِ نظر ہی نہیں تھا تو پھر وہ سمجھوعورت یا تو عورت کو جنسی طور پر ترغیب دینے کی حرکت سرانجام دے رہی ہے،یا پھر اس سے ستائیش کی طالب ہے یا پھر ضرور اس پر اپنی فضلیت و برتری کے قایم کرنے کی طلب

گار ہے،صورت معاملہ کی کوئی بھی ہو ،نگاہ چھوٹی یا بڑی ہو مگر اتنا طے ہے کہ قمیض کا چھوٹا ہونا ہی سچ اور منفی سچ و سوچ کا مبدا ہے۔

اور عورت کی نیت ان سرگرمیوں میں کسی بھی تناظر میں عمدہ و مفید نہیں ہے، نا خود اسکے لئے اور نا دوسروں کے لئے ،اب اسکو معاشرہ برا کہے یا ،جنسی بھیڑیے اس پر حملہ کریں،یا پھر اس پر جملے کسیں یہ سب اسکے فعل کے منفی اثرات ہیں جنھیں جنکا خمیازہ اسکو بھگتنا پڑسکتا ہے،جیسے وہ یہ کہہ سکتی ہے کہ قمیض نہیں نگاہ چھوٹی ہے یعنی تمہاری سوچ گندی ہے ویسے سامنے والا اسکے تصور حیات و اور تصور خیر کے سامنے اپنے تصور خیر کو لے کر اپنی مرضی وآزادی کا راگ الاپ سکتا ہے ،ایسا کسی صورت ممکن نہیں ہے کہ چھوٹی سوچ والا ہی بدی کا محور ہو اور بدی کا تاثر پیدا کرنے والی اپنے اعمال کو ذاتی خیر کہہ کر بچ نہیں سکتی ہے،جبھی یہ جملہ جواب دعوی ضرور ہے مگر معقولی دعوی ہر گز نہیں ہے،ہر عمل کا ایک برابر رد عمل ہمیشہ متوقع رہتا ہے،لہذا جب کسی کی سوچ و نگاہ کو چھوٹا کہا ہےتو خود کو بڑا و خیر پر ہونا بھی جواب میں ثابت کرنا جملہ اختراع کرنے والے پر فرض بنتا ہے۔

یہ جملہ عین اس سوچ کی بھی شرعی حیثیت پر طمانچہ ہے جو کہتا ہے جس نے عشق رسول کا دوپٹہ پہنا ہو اسکو دوپٹے کی کیا ضرورت ہے،یہ کسی شیطان کے چیلے کا مذہب کے نام پر جعلی خود ساختہ جواز ہے اول تو عشق رسول کی انتہا پر سنت کی علامت اگر داڑھی مرد کے ساتھ وابستہ ہے تو عین اسکے مد مقابل اسی طرح ،جلباب،خمر ،دوپٹہ ،چادر،اور حجاب کا استعمال کرنا عورت کو اللہ و رسول کا حکم ہے۔

حکم عشق پر مقدم ہوتا ہے اور اطاعت کا طلبگار ہوتا ہے اور انکار اطاعت عاشق کی معشوق سے عدم عشقیت و نافرمانی کا ثبوت ہوتا ہے،جبھی تمہارا عشق رسول کا دعوی جھوٹا ثابت ہوا، جس رسول سے تم عشق کے دعوے دار ہو وہ کیا تمہاری نگاہ میں کوئی شرعی و حکمی رسول نہیں ہے بلکہ کیا تمہارے اذہان میں موجود تمہارا اختراع کردہ رسول ہے،کیونکہ جس رسول کی ہماری اسلامی شریعت بات کرتی ہے اسکی بابت قران کہتا ہے نبی جو دیں لے لو اور جس سے روکے رک جاو اور یہ امر مسلم ہے کہ اسلام نے عورت کو خود ڈھکنے و چھپانے کا حکم دیا ہے،جبھی مردود کا دعوی فضول ثابت ہوا ،لہذا جو کوئی نبی عربی ،رسول اکرم محمدؐ کے عشق کا قلادہ پھن کر انکے در کی غلامی کرتا ہے اس پر حجاب اور دوپٹہ کی تعظیم کرنا فرض ہے۔

اس مارچ میں لچ نے جرات سے شکل دکھا دکھا کر نعرے و مطالبے پیش کئے مگر کچھ نے چھرے چھپا کر نعرے مارے جیسے ایک موصوفہ ماسک سے چھرہ چھپا کر یہ پلے کارڈ لے کر کھڑی تصویر بنواتی نظر آئیں،کہ میں اکیلی ہی اچھی خیر اس تصویر میں انکے اکیلے پن سے ہمارا کیا لینا دینا مگر برا ہو مارچ اور انکی ٹارچ کا جس نے ہماری نگاہ میں انکا اکیلا پن تو نہیں مگر انکا تارک الدنیا مطالبہ قابل توجہ ٹھرایا،ویسے بھی بات سے بات نکلتی ہے، موصوفہ کی نسبتاً معتدل ظاہری فحاشی بھی یقین جانیں کہ سابقہ نعروں کا اصلاح شدہ نمونہ ہے جو مرد سے کراہت کا آئینہ دار ہے ،یعنی وہ یہ موقف عیاں کرتی دکھتی ہیں کہ جو شادی میری آزادی فکر و عمل کے خلاف ہو اس سے

میں اکیلی غیر شادی شدہ کنواری ہی صحیح ہوں اور ذرا نگاہ مارچی موقف کے مطابق چھوٹا کرکے دیکھیں تو اس میں جنسی خود انحصاری سے لیکر ہم جنس پرستی تک کی چھایا ابھرتی نظر آتی ہے،قریباً سارے ہی پلے کارڈ و موقف درون خانہ جنسی موضوع اور آزادی پر اپنی توجہ مرکوز کرتے نظر آتے ہیں،مطلب چچا فرائیڈ ہوتے تو کہتے جنسی دبی ہوئی جبلتیں،ماحول موافق ملنے پر ظاہر ہوگئیں،ایڈیپس کمپلیکشن،ہم جنس پرستی میں بدل گیا ہے،اب لڑکی کی جبلت ابا کی طرف جھکاو سے دوست کی طرف جھکاو کی حامل ہوگئی ہے،،خیر مغربی فکر و ماحول میں ایسی علمی فلسفیانہ بدمعاشیاں ملنا عام بات ہے۔

ایک کارڈ کہتا ہے کہ آج واقعی ماں اور بہن ایک ہو رہی ہیں، شاید یہاں فرائیڈ اکہتا کہ جبلتی انحراف اور کج رویاں کی بدولت نئی تہذیبی مسایل نے اب جنسی میلانِ طبع باپ سے ماں اور وہاں سے دوست کی طرف کردیا ہے ،اب کوئی ان سے پوچھیں کون سی ماں و بہن؟ ،اس میں خاتون بیٹی گول کر گئیں یعنی وہ خود سرے سے خود کسی باپ کی بیٹی نہیں تھیں جو انھیں اس بحث سے صرف عورت چھلکتی نظر آئی یا انکی نگاہ میں ماں اور بہن کے الفاظ کسی خاص نقطہ نظر کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں،انکے مطابق شادی وہ بطور بیٹی اپنے فرایض پورا کرنے سے زیادہ نظریاتی ماں بہن زیادہ اہم ہیں۔

اور یہ سب کس طرح ایک ہوگئیں ہیں ،اور کس مسلے پر ایک ہوگئیں ہیں ،یہ ابھی بحرحال طے کرنا باقی ہے ،اگر بڑی شفیق بہن اور اخلاقی رہنما ماں کی بابت بات ہوری ہوتی تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا یہاں ایک خاص نسائیت ذدہ ماں اور اسکی آزاد خیال بیٹی زیر بحث ہیں جو اس لڑکی کی بڑی بہن کے طور پر اسکی آزاد طبعی کو موید معاون بنتی نظر آتی ہے،اور اس نے حقیقت میں یا تو اپنی ہم خیال ماں و بہن کی طرف اشارہ کیا ہوگا یا پھر ہم خیال عورت مارچی برادری کی ماں بہن کا ذکر کیا ہوگا،مشرقی شوہر کی اطاعت گزار،عزت کرنے والی بیوی ، فرمانبردار بیٹی اور بہن کی نمایندگی یہ عورت مارچ والیاں شاید نہیں کرتی ہیں اور نا وہ انکے موقف میں انکے ساتھ ہیں کیونکہ مرد و عورت کے فطری ،سماجی،اخلاقی اور مذہبی اقدار کی تعمیر ہماری جس مشرقی عورت نے بطور ماں،نانی،دادی،پھوپھی،خالہ کی ہے،وہ اپنے منتقل کردہ صدیوں کے اقدار کو یوں گنتی کی چند اقدار گریز عورتوں کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتی ہے جو ان سے ہر لحاظ سے الگ موقف،کردار،حیات اور سماجی رتبے میں الگ ہوتی ہیں۔

لہذا اس مقدمہ کی پوری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جن لبرل لوگوں نے پاکستان میں نسائیت،آزاد خیالی،سیکولرازم اور انسانی حقوق کی علم بردارئیت کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے وہ نا تو پاکستانی ریاست اور معاشرے کے حقایق سے آگاہ ہیں اور نا ہی مغربی اقدار و بنیاد سے اچھی طرح آگاہ ہیں، اور وہ نا ہی پاکستانی معاشرے کے کسی بڑے گروہ یا عامتہ الناس کی زبان میں باتیں کرتے ہیں اور ناہی انکی نمایندگی کرتے ہیں ، نا ہی انکی علمی و فکری مسایل کے لئے کوئی فکری کام کرسکتے ہیں،اتنا ساتھ میں واضح ہے کہ انکے پاس عوامی مسائل کا کوئی شافی مستقل ،فوری حل بھی نہیں ہے اور وہ جو کچھ بھی تھوڑے کام دکھا پاتے ہیں وہ سب بیرونی، امداد ،حمایت اور اندرونی ریاستی مشینری کی درپردہ انکی حمایت کے سبب ممکن ہوتا ہے ، ایسا دیکھا گیا ہے کہ کچھ معاملات

میں اسٹیبلیشمنٹ ان کے مخالف بھی نظر آتی ہے جیسے گمشدہ لوگوں کے مسلے پر ،قوم پرستوں اور لبرلز کا فطری اتحاد وغیرہ مگر اسکے باوجود یہی قوم پرست لبرلز کہنے میں کچھ ہیں اور کرنے میں کچھ نظر آتےہیں اگر انکا مشاہدۃ النفس کیا جائے تو بخوبی معلوم ہوجائے گا کہ یہ جو بھی اعمال و وظایف سرانجام دیتے ہیں ان میں زیادہ تر درون خانہ انکے کچھ نا کچھ ذاتی مفادات نظریاتی مفادات کے مقابل کارفرما ہوتے ہیں۔

اور جن انسانی ،معاشی،اور فکری سرچشموں سے یہ اپنی بنیاد حاصل کرتے ہیں وہ انکو اپنا زرخرید غلام بنا کر مغرب کی سطحی تعلیم سے انھیں اتنا ہی روشناس کرواتے ہیں جتنا مغربی ریاستی ایجنڈے کی نگاہ میں ضروری ہوتا ہے۔

مغرب ،اسکا نصاب اور اسکے اقدار ہم دیکھتے ہیں کہ خود مغرب میں بھی کبھی اتنے مطلق،منطقی اور معیاری نہیں گردانے گئے ہیں جتنا انکے مشرقی مقلدین انکو خود پر مطلق طور پر خطا سے مبرا جان کر نافذ کرتے ہیں،یہ حضرات دراصل ایک ایسی یوٹوپین رومانیت زدہ برادری کے قیام کے خواہش مند نظر آتے ہیں جو انکو مطلق ،بے لگام ،کسی حد سے ماورا خود کفیل،اور فردی خواہشات کے عین مطابق آزادی دے سکے ، مگریہ خود کسی بیرونی فکر فرد و اجتماع کو اپنے پر کسی قسم کی تنقید کرنے کے لایق نہیں سمجھتے ہیں بلکہ خود کو دوسروں کی تنقید سے مامون جانکر سہولیات فراہم کرتے رہتے ہیں۔

انکا مطالبہ ہے کہ اس مطلق آزادی کا اطلاق اول عورتوں پر کیا جائے پھر ان کے بعد عورتوں کے غلام مغرب ذدہ مردوں پر کیا جائے جنکی منافقت انکو دین اسلام کا ظاہری پیروکار تو ظاہر کرواتے ہیں مگر،اصول و فروع میں وہ کامل طور یا تو فیڈرسلسٹ پیپرز کا پیروکار ہوتا ہے یا پھر وہ انسانی حقوق کے چارٹر کو جدید صدی کا قران و بایبل تسلیم کرتا ہے،اور مزے کی بات انکی ننانوے فیصد اشرافیہ اور انکے پیروکار ان ماخذات سے بھی سرے سے واقف ہی نہیں ہوتے ہیں،یہ دراصل ایک نئی خود ساختہ روشن خیال جامد تقلید کے عادی ہوتےہیں جس میں روشن خیالی،فکری ثقافتی تنوع کو نیکی تصور کیا جاتا ہے مگر یہ ان مباحث کی حقیقی تاریخ و اساس اور انکے لئے مطلوب امور سے واضح طور پر نابلد نظر آتے ہیں۔

اسکی قسم کے گروہ کی ظاہری اسلام بازی جو اگر چہ اسلامی شریعت سے کوسوں دور ہوتی ہے اسے کفر سازی کے پروپگینڈے کے ذریعے ایک تو مرتد کہلانے سے بچاتی ہے دوسرا اسکو مسلم برادری کا رکن ہونے کے فواید جیسے نکاح سے موت تک فراہم کرتی ہے،اگر انکا درون خانہ نفسی مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے تو بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ کسی قسم کا اقداری نظم انکی نظر میں چاہے وہ معاشرتی ہوں یا ریاستی یا پھر مذہبی نوعیت کے حامل ہوں انکے نزدیک ثانوی اہمیت کے حامل دکھتے ہیں،یہ اسی ملکی ریاستی اصول کو جایز تصور کرتے ہیں جو انکے تصور زندگی سے مطابقت رکھتے ہوں ورنا وہ بھی انکے نزدیک مغربی تصور انسانیت اور انکے حقوق کے منافی گردانےجائینگے،انکے نزدیک ہر وہ فعل جو انکی آزادی سے متعلقہ مختلیف رویوں کو کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ اور قدغن کا شکار بناتا ہے وہ جابر،قاہر آمر کا فعل ہوتا ہے چاہے وہ بھلے کتنی بڑی

جمہوری جماعت کے ذریعے انتخابات میں سامنے آیا ہو وہ انکے ہاں بس ظالم ہے، ظالم ہے، ظالم ہے اب ایسے میں آمرانہ طرز حکومت ہو یا کوئی اور قسم کی حکومت ہو اسکی دال انکے یہاں کہاں گل سکتی ہے، اقدار کی قدر و افادیت سمجھیں انکے ہاں ذاتی اور انفرادی نوعیت کا معاملہ جانا جاتا ہے،یعنی یہ غیر اقداری تصورات کے ایسے مقلد ہیں جو انکی قایم کردہ اقدار کے سوا ہر قسم کی اقدار کو منطقی و غیر انسانی تصور کرتے ہیں۔

یہ تو تھااقدار کا معاملہ اب جہاں تک تعلق ہے غیرت مندیت یا شخصیاتی خودی و شناخت کا تو یہ اپنی پیدائشی خاندانی مشرقی اسلامی خودی کو آہستہ آہستہ مٹا کر لبرل مغربی،سیکولر میلان کی حامل خودی سے بدلنے کی ایمانیات پر یقین رکھتے ہیں،جسکا یہ وقتاً فوقتاً مظاہرے کرتے رہتے ہیں یقین جانیں کہ انکے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر شہ یہ کسی غیر اقداری سرچشمے سے اخذ کرتے ہیں اور جس شہ کو یہ منفرد ،یونیک اور الگ جان کر اپناتے ہیں ،ان امور میں یہ کچھ منفرد و یکتا روزگار قطعاً نہیں ہوتے ہیں بلکہ دیگر نوآبادیاتی فکری غلامی کے مقلدین بھی اس امر میں انکے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتے ہیں ،ان سب میں جو شہ مشترک ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ہی اپنے اسلاف کے ماضی،اقدار اور اخلاقیات کو ردکرنے میں اشتراک کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے سابقہ اور موجودہ آقاوں کو اپنا نمونہ عمل گرداننے لگتے ہیں،جسکی علت میں انکی احساس کمتری کے ساتھ ساتھ اپنی شناخت و اساس کو قبر میں دفنا کر ظاہری چمکتی تہذیب و تمدن کے اقدار کو اپنانا شامل ہوتا ہے،ان میں سے ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو اسلاف کی نفی نہیں کرتا ہے بلکہ عصری خواہش نفسی پر مبنی میلانات اا ور احتیاجات کی اساس اپنے اسلاف سے جوڑتا نظر آتا ہے،انکے مطابق عصری تہذیب کی کامیابی میں ہمارے اسلاف آگے آگے تھے اس ورثہ سے دستبرداری ہماری تباہی،بربادی ،اور زوال کا سبب ہے۔

لہذا مشرق و مغرب کے مابین فکری بعد دور کر کے فکری خلیج کو فکری پل کی تعمیر سے پر کرنا ہوگا جسکے لئے سیکولر روشن خیال جدیدیت اہم کردار ادا کرسکتی ہے ،یوں بحث کے اس رخ سئ نتیجتاً ایک ایسا مشرقی انسان نمودار ہوتا ہے جو کئی روپ رکھتا ہے ،جیسے وہ ظاہر میں مشرقی وضع قطع کا بھی دکھ سکتا ہے،مولوی بھی نظر آسکتا ہے اور مسٹر بھی دکھ سکتا ہے ،مگر جیسے ہی کوئی ان سے تبادلہ خیال کریگا تو انکے مقلدین چاہئے حجاب میں ہوں یا نیم برہنہ ہوں ،داڑھی رکھتے ہوں یا کلین شیو ہوں فکر میں سب ایک ہی تصویر کا دوسرا رخ معلوم ہوں گے،جبھی صرف حلیہ سے ہم کسی کی ایمانیات اور مابعد الطبیعات کا اندازہ قایم نہیں کرسکتے ہیں تبادلہ خیال یا نقطہ نظر ہی انکی اصلیت کو باطن سے باہر لا سکتا ہے۔

زنانہ حقوق صرف حقوق کا مطالبہ نہیں ہیں جیسا کہ یہ یورپ و امریکہ کے سلیقہ مند نسا پرستوں کی گفت و شنید سے عیاں نظر آتا ہے،بلکہ یہ مشرق میں ایک عجیب و غریب شکل میں نمودار ہوا ہے کہ جس سے عقل اس چیستان میں پھنس کر رہ جاتی ہے،کہ بھائی بھلا یہ بلا ہے کیا؟،اسکی اساس ایک ہے یا کئی؟،یہ اتنی دوغلیت کی کیوں حامل کیوں ہے؟،اتنا تو میں اوپر بیان کرچکا ہو ں کہ اس مشرقی نسائیت نے اسلام و مشرقی اقدار دونوں کی اقداری روایات کو نا صرف مسترد کردیا ہے،بلکہ یہ خود ایک مشرقی جنسی مذہب بنتا جارہا ہے،جسکی اصولی مبادیات تو مغرب کی ہیں مگر خالصیت اس میں

نا مشرقی طرح کی ملتی ہے اور نا مغربی طرز کی پائی جاتی ہے جیسے دوپٹہ ایک نسا پرست کے گلے میں نظر آسکتا ہے مگر اسکا وہاں اسکے رحجان کے برخلاف ہونا، بھلا انکے خود مطابق وہاں اس کا کام کیا ہے اور مقصد کیا ہے؟ کیا وہ دوپٹہ والی اسکی قدر کی علت سے آگاہ نہیں ہے،اسکی مشابہت مغربی وی نما کیوں ہے، ویسے یہ دوپٹہ ایسی فکر کی کسی عورت کے سینہ کو چھپارھا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پر گردن کی پشت سے ایک رسی کی طرح لٹک رہا ہوتا ہے،قمیض مشرق کی ہو یا مغرب کی جہاں کی بھی ہو دونوں کی ظاہریت اکثر وہاں کچھ ایسی فیشن کے نام پر ضم ہوجاتی ہے اور وہاں قمیض کی علت و تصور اڑن چھو ہونے لگتا ہے۔

دراصل یہ مقامی نسائیت دوغلیتی فکر کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں تشخص و خودی کے فقدان کا بھی شکار ہوچکی ہے،مشرقی اقدار تو خیر یہ رد کرچکی ہے اسلامی اقدار کو بھی ڈھکے چھپے الفاظوں میں ظالمانہ گردانا جارہا ہے،مگر ساتھ ساتھ یہ سوسری طرف مغربی نسائیت کے خالص تشخص مطالبے،حقیقت و ماہیت کو بھی سمجھنے سے گریز کرتی نظر آتی ہے،مغربی نسائیت حقوق مانگنے میں تو یقین رکھتی ہے،مرد کے مساوی آنے کی وہ بھی طلب گار ہے،مگر مرد کی جنس ،ذات کو دشمن ماننا،اسکے وجود کو کلیتاً رد کردینا وہاں بہت محدود معنی میں اہم جانا جاتا ہے۔

مغرب کی عملی کام کرنے والی حقوق مانگتی ہے تو بات سمجھ آتی ہے آفس سے فلور تک ،وہاں سے فیکٹری ورکر تک آپکو عورت مغرب میں روز کی روزی کما کر کھانے کی ضرورت پر اپنی جوانی لٹا رہی ہوتی ہے۔

مشرق میں ظلم کا رونے والی خواتین عموماً اس ظلم اور اس ظالمانہ معاشرے کی رکن نہیں ہوتی ہیں،وہ یا تو شہری علاقوں کی اشرافیہ کا حصہ ہوتی ہیں یا پھر درمیانہ طبقہ سے انکا تعلق ہوتا ہے،انکے پاس صاف لگتا ہے کہ بولنے چیخنے ،شور مچانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے،ان میں سے زیادہ تر طلاق یافتہ،بیوہ،ازواجی زندگی کی ناکام عورتیں اور انکی تربیت یافتہ جامعات و کالجز کی کم سن طالبات ملتی ہیں۔

یوں یہ مشرقی نسائیت دوغلے بحران کا شکار ہوکر اپنا وجود کھو بٹھتی ہیں اور ایسا وجود دھار لیتی ہیں جو نا مشرقی خودی کا مظہر ہوتا ہے اور نا اس مغربی تشخص کا آئینہ دار ہوتا ہے جسکی یہ مداح ہوتی ہیں اور جسکی فکر و تربیت کے نتیجے میں یہ پود نمودار ہوتی ہے،حاصل مطالعہ یہ ہے کہ یہ تحریک مرد بیزار،عنادیت پر استوار نظر آتی ہے ،اور اسکی بنیاد ہی ایک تاریخی ظالم و جابر مرد مخلوق کی نفی ذات پر استوار ہے،اور اگر اس مسلہ کو صحیح طرح سمجھا اور سلجھایا نہیں گیا تو یہ جنسی تصادم دونوں جنسوں کے باہمی خوشگوار تعلقات پر گھن لگادیگا جسکا نتیجہ بنی نوع انسان میں ایک عظیم تباہی کی صورت میں نکلے گا،جو اخلاقیات کا جنازہ نکال دیگا اور ہمارے پیارے پیارے رشتے ناطوں کو کمزور اور مفاد پرست بناد دیگا،ماں ،باپ،بہن بھائی کے رشتے ناطے اپنی اہمیت کھونے لگیں گے اور ایثار و قربانی بس داستانوں میں ڈھونڈھنے سے ملے گی،اور دونوں جنسوں میں بڑھتی کراہت یہ تک ممکن ہے کہ اس بحث میں کبھی خون خواری کا عنصر بھی اس

بحث میں شامل کروادے،اللہ ہمارے رشتے ناطوں اور خاندانی معاشرت کو قایم و دایم رکھے یہی اس عاجز کی دعا ہے۔

اس مجموعے میں نے اسلام پر جدید الخیال،ملحدیت مایل اور مسلم جدت پسندوں کے خواتین سے متعلق اعتراضات کی بابت مختلیف تحریریں جو آن لاین موجود تھیں کو اصلاح،ترمیم،تہذیب،حواشی اور تخریج سے مزین کرکے آپکے سامنے ایک مقدمے کے ساتھ پیش کرہا ہوں۔امید ہے جنکو حق پسند ہے انکے لئے اس میں قابل سکون تحقیق میسر آ پائیگی۔

ڈاکٹر محمد علی جنید۔

کیا قرآن کسی کو بلا تحدید بیوی کو مارنے کا حکم دیتا ہے ؟

از: وقار اکبر چیمہ

غیر مسلموں کا ایک طبقہ خصوصا عیسائی مشنریز یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام مرد کو عورت پر ہاتھ اٹھانے اور اسے مارنے کا حکم دیتا ہے ۔گزشتہ کچھ دنوں سے اسلامی نظریاتی کونسل کے چئیرمین مولانا شیرانی کے بیان کو لے کر لبرل طبقے نے بھی اسی انداز میں طوفان اٹھایا ہوا ہے ۔ عیسائی معترضین قران مجید سورۃ نساء کی آیت 34 کو بطور دلیل پیش کر تے ہوئے اسلام کو نشان بناتے ہیں اور لبرلوں نے فی الحال مولانا شیرانی کی آڑ لی ہوئی ہے۔ مسئلے کی حقیقت سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قران کے کسی بھی ایک لفظ یا ایک آیت کو لے کر اس کی من مانی تشریح کرنا اور اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیئے استعمال کرنا کوئی درست اور منطقی علمی طریقہ نہیں ہے ۔ ہر آیت کو اس کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلامی اطوار و تعلیمات کے ساتھ ملا کر اس کا معنی سمجھنا ضروری ہوتا ہے ۔

اب چند باتوں پر غور کیجیے:

۱۔ اسلام شادی کے بعد مرد و عورت دونوں کو پابند کرتا ہے کہ وہ اپنی شریک حیات تک محدود رہیں ۔

۲۔اپنے شریک حیات کے سوا کسی سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کو سختی سے روکتا اور منع کرتا ہے ۔

۳۔ عورت کو ہلکی پھلکی سزا دینے کی اجازت بے قید اور غیر مشروط نہیں ہے نا ہر صورت میں جائز ہے ۔ آئیے آیت کے سیاق و سباق کو دیکھتے ہیں : ...چنانچہ نیک عورتیں فرمان بردار ہوتی ہیں ، مرد کی غیر موجودگی میں اللہ کی دی ہوئی حفاظت ‘‘ سے (اسکے حقوق کی) حفاظت کرتی ہیں ۔ اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہوتو (پہلے) انہیں سمجھاؤ اور (اگر اس سے کام نہ چلے تو) انہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو۔(اور اس سے بھی اصلاح نہ ہو تو) انہیں مار سکتے ہو ۔ پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو انکے خلاف کاروائی کا (کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کے اوپر ، سب سے بڑا ہے ۔(قرآن 4:34 یہ آیت وضاحت کرتی ہے کہ یہ اجازت صرف ان حالات میں ہے جب عورت سرکشی کی اس حد تک پہنچ جائے کہ اسکو روکنے کا کوئی اور طریقہ نا رہے سوائے طلاق کے۔ ایک دفعہ دوبارہ پڑھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس سرکشی کا یہ لیول ایسا ہے کہ اسے سے ایک شریف اور باوقار عورت کی اپنی عظمت بھی مجروع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

۴۔ جب کوئی عورت ایسے کسی عمل میں مبتلا ہوتی ہے تو عورت کا رویہ نا صرف مرد کے لیئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے بلکہ اسے بددل کرنے اور کسی اور کی طرف راغب ہونے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ایسی سٹیج نا صرف ان دونوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے بلکہ پورے خاندان اور معاشرے پر بھی اثر چھوڑتی ہے ۔ چنانچہ یہاں فزیکل سزا کی اجازت اعتدال کے لیے اور اس برائی سے نجات کے لیے ہوتی ہے۔

شرعا نے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک باظابطہ طریقہ کار اس ضمن میں مقرر کردیا ہے جسکے تین درجے بتدریج کمیت و کیفیت کے تفاوت کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہیں ،اگر درجہ اول سے کام نکل جاتا ہے تو کسی کے لئے جایز نہیں کہ دویم و سویم تک جبراً چھلانگ لگا کر درجہ اعتدال سے تجاوز کرجائے:اگر کوئی اس کے باوجود کچھ ناجائز کر گزرتا ہے تو اسکا یہ فعل اسکا انفرادی زاتی فعل تصور کیا جانا چاہئے تاکہ اسکا الزام شریعت کے سر مُنڈھا جائے۔[1]

اب ذیل میں ان شرعا تادیبی کاروائی کے لئے متعلقہ اصول و درجات ملاحطہ فرمایے جائیں:

۱۔ سب سے پہلے نصیحت کرے ۔

۲۔ اگر اس کا مثبت نتیجہ نہ نکلے تو بستر سے علیحدہ ہوجائے۔

۳۔ اور اور اگر یہ طریقہ بھی ناکام ہو جائے تو تب آہستگی سے تادیبا مارنے کی اجازت ہے۔

تو اسکے بعد فورا بعد احتیاط کرنے کا حکم دیا گیا ہے:جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے کہ:

"اگر وہ اپنی اصلاح کر لے توتم ان پر زیادتی کا کوئی راستہ مت تلاش کرو"

آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ہمیں حضور ﷺ کی احادیث کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے ۔ آیت میں مذکور بالا لفظ***نشوزھن*** کی وضاحت خطبہ حجۃ الوداع میں بھی کی گئی ۔ چند دفعات پیش ہیں:

۱۔ وہ کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں۔

۲۔ وہ تمہارا بستر کسی ایسے شخص سے پامال نہ کرائیں جسے تم پسند نہیں کرتے۔

۳۔ وہ تمہارے گھر میں کسی ایسے شخص کو داخل نہ ہونے دیں جسے تم ناپسندکرتے ہو،مگر یہ کہ تمہاری اجازت سے۔

[1] **ڈاکٹر محمد علی جنید**

۴۔ اگروہ عورتیں (ان باتوں) کی خلاف ورزی کریں تو تمہارے لیے اجازت ہے کہ:

ا۔ تم انہیں بستر وں پر اکیلا ،تنہا چھوڑ دو۔2۔ (ان پر سختی کرو)مگر شدید تکلیف والی چوٹ نہ (مارو(اگر مارنا ہی چاہو۔

یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ عمل جسمانی کی بانسبت نفسیاتی ذیادہ ہے اور اس کا مقصد زوجین کے درمیان عفت ،باہمی محبت اور انسیت کو قائم رکھنا ہے .اگر عورت کے ایک غلط طرز عمل کی جانچ نہ کی جائے تو یہ بات یقینی ہے کہ تعلقات پر بہت منفی اثرات پڑتے ہیں ۔

خاوند کی سرکشی کی صورتحال میں بیوی کو ایسے عمل کی اجازت کیوں نہیں دی گئی ؟ یاد رکھیں کہ شوہر قانونی ‘‘دوسری’’ بیوی رکھنے کا مجاز ہے جب کہ عورت ایک وقت میں دو شوہر نہیں رکھ سکتی ہے ، جس کی وجوہات واضح ہیں . یعنی مرد کے پاس ایک ہی وقت میں آپشن موجود ہوتے ہیں ۔ اس کومد نظر رکھتے ہوئے اور نفسیاتی اور جسمانی فرق اور حقیقی زندگی کے حقائق کو دیکھتے ہوئے بیوی کی شوہر کو اس طریقے سے نصیحت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی .وہ شوہر کو درست کرنے کے لیے ایسے مسئلے کو عدالت یا خاندان کے بڑوں کے سامنے لے کر جا سکتی ہے۔

ایک شرعی ریاست ان مسائل کے حل کا باقائدہ انتظام کرتی ہے۔ شوہر کو ریاست کی طرف سے پابند کیا جاتا ہےا ور سزا دی جاتی ہے۔ مزید اگر عورت محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کسی وجہ سے نہیں رہ سکتی تو عورت کو اجازت ہے کہ وہ خلع لے کر علیحدگی اختیار کر لے ، مگر جب تک وہ عقد نکاح میں موجود ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ خاوند کی موجودگی اور غیر موجودگی میں اسکے ساتھ وفا دار رہے۔ مرد و زن کے باہمی تعلق کی درستگی ہی ایک خوبصورت معاشرے کی بنیاد ہے۔

<u>ایک غیر مستند روایت سے حجت پکڑنے والے لوگوں کا رد:</u>

ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ایک روایت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کچھ یوں ہے :

عمر ابن الخطابؓ سے روایت ہے کہ : نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :کسی شخص سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی بیوی کو کیوں مارا ہے[2] ابوداود کی اس روایت کی علت ِ ضعیفہ یہ ہے کہ: علامہ البانی نے اس کو ضعیف اور غیر مستند قرار دیا ہے: ہم یہ جانچتے ہیں کہ امام ناسر الدین البانیؒ کے علاوہ ، شیخ احمد شا کرؒ اور شعیب ارنوطؒ جیسے جید محدثین اور ماہرین رجال نے بھی اس کو اپنی مسند احمد کی درجہ بندی میں ضعیف قرار دیا ہے. جبکہ خود حافظ ا بن کثیرؒ نے بھی مسند الفاروق 182/1 میں اس کی روایت کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ .

[2] سنن ابو داؤد :حدیث نمبر : ۲۱٤۷:

خلاصہ:

اسلام میں اللہ کو امت کی اجتماعیت نہایت زیادہ عزیز ہے اور اس اجتماعیت کو توڑنے پر سخت وعیدیں آیی ہیں. اس اجتماعیت کا سب سے پہلا پتھر میاں بیوی کا صحیح تعلق ہے جس کی بنیاد پر پھر آگے چل کر پوری امت کھڑی ہوتی ہے. اس مقصد کے لیے اللہ تعالی مرد کو قوامیت کا درجہ دیتا ہے اور تاریخ گواہ ہے جہاں جہاں قوامیت متاثر ہوئی ہے وہاں انارکی اور انتشار نے جنم لیا ہے. مغرب میں خاندان کے ادارے کے تباہ ہونے کا حال دیکھ لیجیے. اب جب یہ اجتماعیت امت کی بنیاد ہے تو فطری بات ہے کہ اس عظیم ترین مقصد کا حصول اگر کسی درجے میں سختی سے بھی ممکن ہو تو قابل روا و حکمت ہے. قرآن میں ایسا کرنے کی اجازت **قوامیت** کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے کے بعد دی گئی ہے جس کے لیے **نشوز** کا لفظ لایا گیا ہے. نشوز عورت کی طرف سے وہ اعلا درجے کی سرکشی ہے جو خاندانی نظم تباہ ہونے پر منتج ہوتی ہے. اس میں عام روزمرہ کی چخ چخ داخل نہیں. اس پر ضرب کا حکم ہے لیکن اس کی جو حدود حدیث نے بتائی ہیں اس کی رو سے عرف عام والی مار کا اس پر اطلاق بھی نہیں ہوتا ہے۔

قابل غور نقطہ جات :

واضح رہے کہ ہماری یہ تحریر صرف ان قارئین کے لیے ہے جن کے نزدیک خاندان کی کوئی قدر و قیمت ہے یا جو معاملات و تعلقات میں اسلامی شریعت و معاملات کی اہمیت و قدر کے کسی حد کے قائل ہیں ۔ جبکہ انکے برخلاف جو دین بیزار طبقہ ہے انکے لیے یہ توضیحات بالکل اہمیت نہیں رکھتی ہیں کیونکہ اگر انکی نگاہ میں ذرا بھی شریعت کی اہمیت ہوتی تو وہ ایسی جسارتوں سے دور رہتے یا دل میں رب سے پشیمانی کا جذبہ رکھتے لہذا انکو مطمین کرنے کا ہمارے پاس کوئی شافی نسخہ موجود نہیں ہے،اور فیالحال نا وہ میرے مخاطب ہیں ، کیونکہ انکے اور ہمارے ماخذات علمیہ بلکل مختلیف ہیں ۔ بقول ایک محقق ہمیں یقین ہے کہ ہم اس آیت کے حکم کو چاہے جتنا بھی ہائی لائیٹ کرلیں، یہ اس ''جدید خلق'' کے حلق سے نیچے نہیں اترپا یگی جو جدید ذہن یہ کہتا ہو کہ بیوی کو بیوی ہونے کے باوجود معاشقے کرنے کی شخصی آزادی ہے. وہ اس تحدید کو کبھی نہیں مانے گا جو شریعت نے مرد و عورت کی جنسوں کے مطابق مقرر کی ہے۔

تہذیبِ جدید اور تربیت کا تعلق:ایک مثال

از : مہران درگ

میرے نانا (مرحوم) کے پاس تین گھوڑے اور دو گھوڑیاں ہوا کرتی تھیں ، جنھیں وہ اصطبل میں الگ الگ باندھا کرتے تھے اور گھوڑوں کو سُدھانے کے لمحات کے دوران وہ گھوڑوں کوتربیتی مقام پر وہ گھوڑیوں سےالگ کرکے میدان میں دوڑایا کرتے تھے ، یہ عرصہ قریباً چار ماہ پہ مشتمل ہوا کرتا تھا ، اور اان چار ماہ کے دوران وہ نئ پُشت کے گھوڑوں کو نا صرف گھوڑیوں سے الگ باندھتے تھے بلکہ حتہ المقدور اُن پر انکی نگاہ بھی پڑنے نہیں دیتے تھے۔

جب بھی گھوڑا بدکنے لگتا وہ منہ میں قابو کرنے والی نکیلی سلاخ کو اس وقت جھٹکا دیتے جب وہ بدکنے لگتا تھا اوربلّاخر گھوڑا اپنی نظر جھکا کے اپنے پانچ سبق بلترتیب دُھرانے لگتا تھا، گھوڑے کی چالیں ہوا کرتیں تھیں ، تیزگام ، رلا گام ، تیز رلا گام، چو باز گام ، جب بھی گھوڑا نفساً حکمًا بدکنے لگتا تو وہ چمڑے کی مہار کو مٹھیوں میں کرکے لہرا کے کھنیچتے گھوڑا قدموں پہ ہلکا سااُٹھتا اور پھر نیچے تیز گام ، رلا گام ، چوباز کے آسن میں اک دائرے میں دوڑنے لگتا ہے۔

چوباز گام میں دوڑتا ہوا گھوڑا چاروں پاؤں اٹھا کے زمین پہ مارتا ہے ، اسکے سنبھالنے کی اگلی چُٹی صرف زمین کو چھو پاتی تھی ، تربیت ایسی تھی کہ پانی کا گلاس لے کہ اسکی پشت پر بھلے بیٹھ جاؤ چوباز گام میں پانی چھلکے گا بھی نہیں ، دھکے کا تصور نہیں ہوگا ، اس رفتار میں گھوڑا جوبن پہ ہوتا ہے عین ایسے جیسے چاندنی میں سمندر جوبن پہ ہوتا ہے ، اسکی رفتار اُس لمحہ ساٹھ کلو میٹر فی گھنٹہ کے قریب ہوتی ہے اور اسکا دماغ یک سو ہوتا ہے جس پر کوئی دو رائے نہیں ہوتی ہے۔

اس میں اس دوران کوئی معلوم سرکشی ، یا بے قوت بکھرتی آلائش نہیں ہوتی تھی ، جب دوڑتا تھا تو پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو یوں معلوم ہوتاتھا کہ جیسے سطح زمین سے پانچ انچ اوپر کوئ شے اڑتی ہوئ چلی جارہی ہے – یہ اسکا ہارس پاور ہوتا ہے ، اسکی توانائ اسکی نفسیات کے ساتھ باہم متصل ہوجاتی ہے۔

ہمارے پیارے نانا جان فرمایا کرتے تھے ، کہ میاں جی !جہاں سڑک چلتے ہوئے چوباز گام میں دوڑتا ہوا کُمیتی نسل کا گھوڑا پہلو سے گزرنے لگے تو رک جایا کرو ، اور کھڑے ہوکے سلام کیا کـــرو!

میں نے پوچھا کیوں؟ ، تو ارشاد ہوا کہ ، یہ ایک صاف و شفاف سدھایا ہوا جفا کش گھوڑا ہوتا ہے ، اسکا کُمیتی رنگ سب سے معتبر رنگ ہوتا ہے ، اس رنگ میں رنگے گھوڑے کے ماتھے پہ سفید ٹکا لگا ہوتا ہے ، چاروں سُنبھ سفید ہوتے ہیں ، قیامت کے دن جب انسان اٹھائے جائیں گے تو نمازی کثرت زدہ مومن ایسے کمیت رنگ کے گھوڑے کے جیسے چوباز گام میں پُل سراط سے دوڑتے چلے جائیں گے ، انکے ماتھے پہ سجدے کی سفیدی چسپاں ہوگی ، چاروں پاؤں وضو کردہ مومن کی

ہتھیلیوں جیسے اور ٹخنے سفید نور میں میں ملے و اجلے نمایاں ہونگے ،جیسے گھوڑے کے چاروں اسنبھ اور ماتھا!

تمہیں کیا لگتا ہے مہران؟ ،

اسکی اس قدر ایکوریسی[3] ، اور باہمی ربط کی وجہ کیا ہے ؟پھر انھونے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا – اور کہنی ایڈجسٹ کرکے ہاتھ اپنی سفید مونچھوں تک لائے ، دونوں ابرو اٹھا کے استفسار کیا میں نے پوچھا ، وجہ کیا ہے؟
-بولے
اسے اسکی تربیت کے دنوں میں اسے مخلوط نہ کرنا“
جنس مخالف کو مخالف ہی رکھنا اس کو اسکے ربط تک آسانی سے لے آیا ہے :
جنید بغدادی سے ایک دفعہ یہ پوچھا گیاکہ: اے مرشدی ، کیا مرد عورت کو پڑھا سکتا ہے کیا دونوں اکھٹے پڑھ سکتے ہیں ؟
ارشاد ہوا کہ شاگردِ رشید :

اگر پڑھانے والا بایزید بسطامی ہو ، پڑھنے والی رابعہ بصری ہو ،جس جگہ پڑھایا جا رہا ہو وہ بیت اللہ ہو ،جو کچھ پڑھایا جا رہا ہو کلامُ اللہ، ہو پھر بھی اجازت نہیں ہے[4] . بات رویے کی ہے شیر سے ہل چلاواؤ گے کسان تو مرے گا ہی، یہ طریق تعلیم اپنی ذریت کے تناسب میں سمجھو ایک طرح کی موم بتی ہے آپ کہتے ہیں یہ روشن ہوری ہے میں کہتا ہوں پگھل رہی، ختم ہو رہی ہے مجھے حیرت نہیں ہوئ تھہ کیونکہ جب میں نے سنا کہ مخلوط تعلمی ادارے کے دو نو خیز بچوں نے رومانس کی آڑ میں خود کو گولیاں مار کے خودکشی کرلی تھی-

جو عین انکی تعلیمی تہذیب و تربیت کے موافق تھا ، لہذا وہی ہوا ، جو ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا - چناچہ وہ خبر پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ جو تم بو گے وہی تم کاٹو گے اور ممکن ہے کہ یہ موقولہ فرسودہ ہو گیا ہو – مگر گھوم گھما کر بھی یہ اب کچھ ایسا ہی ہے کہ جسطرح سے بو گے اُسی طرح سے کاٹو گے -مگر جب ہم اس مسئلہ کا حل تختہ سیاہ پہ سفید چاک سے لکھتے ہیں تو کل عالم کی روشن خیالی ایک بلب میں سمٹ کر ہماری آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں اور نستعلیق سی ہو جاتی ہیں-

سمجھو کہ یہ موئی عقل بھی اک گھوڑا ہی ہے جسکو دوڑانے سے پہلے اسکی تربیت نیوٹریل ماحول مانگتی ہے ، اور اسکی نفسیات کے ساتھ مکمل انصاف طلب کرتی ہے: جیسا کہ:

---

[3] **Accuracy.**

[4] **کیونکہ شریعت اور اسکے احکامات حتمی،عالمگیر ،غیر زمانی مگر کل مقامی نوعیت کے حامل ہیں ،جنھیں اللہ اور اسکے رسول نے محکم و راسخ کیا ہے ،شریعت کی پیروی سے کوئی بھی فرد باہر نہیں چاہئے وہ نبی ہو ،رسول ہو،صحابی ہو یا عالم و صوفی کوئی بھی فرد ہو .-معج**

ساحر لدھیانوی نے ارشاد کیا تھا:

نیک مادام! بہت جلد وہ دَور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہوں گے

اپنی ذلت کی قسم! آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے میعار پرکھنے ہوں گے
ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے، لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے
لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل؟
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میں جہاں ہوں، وہاں انسان نہ رہتے ہوں گے

عورت کی آزادی

از:مهران درگ

جس نے خود کبھی کوئی گناہ نا کیا ہو مجھے پہلا پتھر تم میں سے وہ مارے کہا گیا ہے کہ
اسلام کی سرشت سے عورت نام کی جنس صاف بے دخل ہے اور اس دین میں اسکے حقوق آٹے میں نمک کہ برابر ہیں۔

بلکہ یہ کملوہی عورت کیا ہے؟یہ تو بھائی صرف مرد کی رکھیل و کنیز ہے، عورت بستر گرم کرنے کی شہ ہے اچھا جی، آپ مجھے بتائیگے انجیل برنابس ، یوحنا ، توره کی موجوده شکل اور کچھ عرصہ قبل تک یورپی،سیاسی،مذہبی،اور فلسفیانہ تاریخ میں عورت کے لیے گنتی کی رو سے اندازۃً کتنے حقوق درج موجود و درج ملتے تھے، چلیں آپ لوگ تو جس طرح اپنے پیارے مغرب کو بہ بانگ دھل حقوق نسا کا جو تاج پہناتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انہونے وراثت میں اسکا پچاس فیصد حصہ رکھدیا گیا ہے۔

اب ذرا ہم اٹھا رویں صدی عیسوی کے انگریزی قانون کو لیتے ہیں ، جس میں ایک قانونی موقفی بیانیہ یہ موجود تھا کہ "**عورت باپ کی وراثت میں کوئ حق نہیں رکھتی ہے**" جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ برصغیر میں جب انگریز حاکم آیا تو اس نے بھی اولین کاموں میں سے ایک کام یہ بھی کیا تھا کہ عورت کو جائیداد سے بے دخل کر دیا جیسا کہ اس دوران انکے مادر واطن برطانیہ میں اسکا رائے دہی اور جائیداد میں حصہ کا قانون واضح طور پر موجود نہیں تھا ، "مین ڈومیننٹ ایسٹ انڈیا کمپنی[5] " کو یہ کریڈٹ دیا گیا تھا کہ اس نے اختیارات صرف اور صرف مرد کے ہاتھ میں رکھے تھے۔

آدھی سے زیادہ دنیا پر انگریزوں نے اپنی حکومت قایم کی ہوی تھی میڈ ل ایسٹ ہو یا پھر آسڑیلیا جہاں جہاں انکا ہاتھ پہنچا وہاں وہاں انگریز سرکار نے اپنی سلطنت قائم کرلی تھی ،کہیں بلواسطہ بذریعہ کمپنی راج قائم کر لیا تھا اور کہیں کہیں براہ راست طاقت و قوت سے یہ کام سرا انجام دینے میں مشغول ہوگئے تھے انہی کے بنائے اصول کے مطابق عورت جائداد میں اس دوران برطانوی سول قانون کی رو سے حصہ دار نہیں تھی،یہ الگ بات ہے کہ طبقہ اعلی میں کچھ مختلیف و متضاد آرا و رواج اس ضمن میں بروئے کار لائے جاتے تھے۔ انیسویں صدی کے اخیر میں انہیں خیال آیا دوستوں عورت کا بھی کچھ حصہ وغیرہ رکھو کیونکہ بھر حال وہ بھی مرد کی طرح ایک ہی باپ کے تخم سے پیدا ہوئی ہے وہ بھی ____ پھر عورت کو محور

[5] Man dominant east India Company.

بناتے ہوئے محزب اخلاق"مارکیٹنگ" کے اصول وہ وضع کیے گئے جن سے انکل عزازیل بھی پناہ مانگنے پر مجبور ہوجائیں۔

یہ انسانی اختراع شدہ افکار و اقدار ،نشاۃ ثانیہ،انسان پرستی،عقل پرستی کی منزلوں پر کوئی فوراً نہیں پہنچے ہیں ، بلکہ حقیقت میں انکے جبر و استحصال کی ایک مرتب ،واضح اور ناقابل تردید مذہبی و غیر مذہبی مسلسل و مربوط تاریخ و فکر موجود ہے، اور انکے عورت کو عطا کردہ تمام حقوق ،کچھ فرایض کی بجاآوری پر اسے عطا کئے گئے ہیں،اور اسکی ضمانت دینے میں مغربی معاشروں،اداروں اورا فکار کو سرمایہ دارانہ ذہنیت،مقاصد و و مطالب نے تیار کیا تھا،جب جاگیرداری نظام کمزور و تباہ حال ہوا ،جب سرمایہ دارانہ،تجارتی نظام کی مغربی عالمگیریت و استعماریت کا چلن پڑا ،ایجادات نے مشینوں کا چلن ڈالا،رسل و رساید اور ذرایع پیداوآر میں وسعت پیدا ہوئی تو ،منڈیوں کی تشکیل بھی ہوئی اور ان تجارتی مالوں کی کھپت،خرید و فروخت،نقل و حمل کے لئے کارخانوں کو لاتعداد مزدوروں کی ضرورت پڑی ۔

تو بجائے مہنگے داموں غلام خریدنے،انہیں رکھنےیا سنبھالنے کے انھونے نے اجارہ و محنت پر مزدوروں کو رکھنا شروع کردیا، جبھی اس سے غلامی کا چلن کمزور ہونے لگا،مفکروں نے سیاسی علمیت و افکار پر اسکی مخالفت شروع کردی ،ایوانوں میں ان پر مباحثہ شروع ہوا،یہودی سرمایہ داروں نے حکومتوں کو بھاری قرضے فراہم کرنے کے لئے جو شرایط مقرر کی تھیں ان میں ان امور کا بھی ڈھکا چھپا تاثر ملتا تھا،تو جلد ہی اس نظام کو یہ اندازہ ہوگیا کہ،صرف مردوں سے مزدور کے طور پر کام لینا کافی نہیں ہے بلکہ اب تو مزدوروں،اور محنت کشوں کی صف میں عورتوں،بچوں کو بھی شامل کیا جانا چاہئے ،تاکہ تیز مسابقت،تیز پیداوار میں اضافہ ممکن ہوسکے۔

عین اسی دوران تعلقات عامہ، دماغی نظمیاتی ملازمین کے مختلیف درجات کی بھی ضرورت پڑگیی صرف پیداوآر سے دولت کا حصول کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اب تو نتیجہ میں ساتھ ساتھ خدمات کا شعبہ بھی،پیدا ہوا،پھر تشہیر کا شعبہ بھی پیدا ہوا، اور ان نتایجی امور نے عورت کو گھر سے نکال کر کارخانے ،تشہیر خانے،جنسی اعمال خانے کے شعبوں میں لاکر بٹھا دیا ،یعنی اس وقت شروع شروع میں عورت کو ایک سستا دلنواز ،پر حسن و لطف معاونِ سرمایہ سمجھا گیا تھا ،اور کافی حد تک درون خانہ آج بھی دماغوں میں ایسا ہی تاثر پنہاں ملتا ہے ، چناچہ یہ الگ بات ہے کہ سیاست،جمہوریت،حقوق و فرایض کی جنگ نے اسے چھپا کر رکھ دیا ہے۔

ان مجموعی سرگرمیوں ،ضرورتوں نے مغرب کو حقوق نسا کے ضمن میں کچھ کرنے پر مجبور کردیا تھا مگر اسکے بعد الحاد،زندیقیت،سائینسی آبا پرستی نے عورت کے گھر چھوڑنے کے نتیجے میں مغرب کا خاندانی،و مذہبی نظام بھی تباہ کردیا،جسکا نتیجہ نکلا کہ وہ آج اس سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھنے،ترقی کی اقدار کی پیروی میں بیرونی دنیا سے سستے ملازمین کی درآمد کرنے پر مجبور ہے،یوں ان سب کو مطمین کرنے ،کے لئے کچھ حقوق تسلیم کر لئے گئے مگر ایوان، قانون ساز ،عدالتوں،اور فوج کے زریعے بغاوتوں اور انقلاب کو محدود و مجبور کردیا گیا،عورت کے حقوق کو خاندان کے دایرہ سے نکال کر ،معاشرہ و ریاست کے دایرہ میں لایا گیا پھر اسے اقوام متحدہ اور اسکے اداروں کے ذریعے بین الاقوامی عالمگیری حقوقی اقدار کے دایرہ میں مقید کرکے دنیا بھر میں جبراً نافذ کردیا گیا۔[6]

---

[6] ڈاکٹر محمد علی جنید

مستشرقین و اہل جب منہ کھول کر اسلام پر الزام لگاتے ہیں ناں تو ہقین جانیں تب بڑا غصہ آتا ہے مغرب والے جب انسانیت ، نیوٹریلٹی ، موریلٹی کے بلا مقابلہ ٹھیکے دار بنتے ہیں تو اس سے قبل انکو زور لگا کر زرا اپنی تاریخ کو بھی کباڑ سے نکال کر جھاڑ کر اُسی نیوٹریلیٹی کے چشمے سے با آوازِ بلند پڑھ کے کل دنیا کو سنانا چاہئے جب ہم کچھ کہتے ہیں تو انھین یہ تنقید خوب بُری اور تعصبی سرگرمی لگتی ہے۔

سب سے پہلے یہ بات کھلے دل سے سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کہ دورجاھلیہ کی اقدار و ثقافت سے اسلام کو خلط ملط کرنا علمی جہالت ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ عورت کو زندہ گاڑنا قدیم عرب معاشرے کی روایت تھی جبکہ اسلام کی ایک شریعی سماجی و خاندانی ہدایت یہ ہے کہ اپنی بیٹیوں کو نان ونفقہ کے ڈر سے قطعاً مت مارو جبکہ مغرب کو کل اور آج دیکھ لیں کہ آج بھی مغرب عورت کو پیٹ میں زندہ ابارشن کرتا چلا آرہا ہے،اور نا دوران حمل بچے کو زندہ ماتنا ہےاور نا ہی بچی کو زندہ مارتا ہے ،اور دونوں جنسوں کا یہ قتل عام خود انکی ماں کرتی ہے،ایک عورت کرتی ہے جو ،آج لڑکیوں اور عورتوں کے ریپ،تعلیم،عدم مساوات ،جبر پر شور شرابا کررہی ہے،اسی عورت نے کتنا خود کی جنس کا ،خود کی ممتا کا قتل عام کیا ہے اس پرمغرب خاص توجہ مرکوز کرنے سے پہلو بدلتا ہے۔[7]

دیکھوکوئ قانون اس کے خلاف نکال کر دیکھاو توہم مانیں؟ اسلام تو اسے اول روز سے ہی صرف قتل کہتا ہے اور قتل کی سزا قتل ہے،اور تم اسے منصوبہ بندی اور مینجمنٹ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہو۔

<u>دوسری بات یہ ہے کہ:</u>

جائداد نسا کا مغرب کی جناب سے پچاس فیصد عورت کے حق میں ہونے کا اصول اس اصول کو صحیح طرح مجھے ذرا آپ انٹر پریٹ تو کریں ،اس میں کتنی،نطق،علمیت اور صداقت پنہاں ہے،مذید یہ کہ پچاس فیصد لے کے جانے والی عورت اپنے پیچھے آدھی رہ جانے والی جائیداد جب لے جاتی ہے تو اس میں اگر اسکے پیچھے روٹی کھانے والے آٹھ تھے تو بقیہ ورثا سات رہ گئےذرا آپ مجھے اتنا بتائیں ایک کے ساتھ تو بہت بڑا انصاف کیا گیا ہے اور باقی سات لوگ ساری زندگی آدھی بچی کچھی کے ساتھ جیسے تیسے سروائیو کرتے رہینگے یہ کون نہیں جانتا ہے؟

ایک تو جہیز بھی موصوفہ کو دیا گیا،الٹا ساری زندگی قرض نے اترنے کا نام نیں لیا ،اگر سود اس کے پیچھے کارفرما ہے تو اسکا بوجھ الگ سینے پر مونگ کی طرح دلتا رہا،ظاہر ہے ہر آدمی قارون یا بل گیٹس نہیں ہوتا ہے کہ اتنی جائیدادیں چھوڑ کر جائے کہ سب ورثا کو وافر یا معقول حصہ میسر

[7] معج

آئے ۔ اوپر سے طرفہ تماشہ یہ ہےکہ ایک بو جھ اُترا تو دوسرا آن موجود رہا ایک تو خاتون کو حق مہر ملا ، دوسرا شوہر سے آٹھاواں حصہ، اسکےبعد ایک حصہ باپ کی جائیداد سے لے کر جمع کریں تو مالیت کا حجم اُس "پچاس فیصد "سے زیادہ بنتا ہے جو مغرب اسلا م کے مقابلے میں سامنے لایا ہے،اس طرح مذکر ،مرد اولادوں کی زندگی،شادیوں اور حیاتِ دلجمعی کے لئے کیا بچے گا؟جبکہ آپکی رو سے عورت کو بھی کمانے کا حق حاصل اور مرد کو بھی حق حاصل ہے۔

تیسری بات:

کپڑے خود اُتاریں تو تمہیں ننگی عورت آزاد لگتی ہے
کوئ آکر انہیں ُاتار لے تو تمہیں مظلوم لگتی ہے
دونو ں زاویوں کے ضمن اسلام جب سنگ سار کا حکم کرتا ہے یا اسکے سد باب کے ضمن میں پردہ وحدود قائم کرکے سِرے سے ان ممکناتکو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ: لوگوں دیکھو تو یہ کیسا عظیم ظلم ہے یہ تو خالصتاً غلا می ہے جنابِ من آپ تنقید کی بجائے ایسا اصول تو وضع کریں کہ کوئی عورت ریپ کی سطح تک پہنچ ہی نا پائے آپ کوئ ایک اصول سنادیں جو اس پایہ کا ہو _جو آپ نے اب تک وضع کیا ہو اور جس نے عورت کے تحفظ کے ضمن میں کچھ کام بھی دکھادیا ہو۔

اعتراض:اسلام مرد کو طلاق کا حق دیتا ہے مگر عورت کو کیوں نہیں دیتا ہے ؟

از:احسن خدامی

ملا جی !ایک سوال پوچھنا ہے مگر ڈر لگتا ہے کہ آپ کہیں کوئی فتوی ہی نہ لگا دیں ہم پر تو فرمانے لگے:
پوچھو پوچھو! میں نے کہا کہ: کہ کہیں سوال پوچھنے پر کوئی فتوی تو نہیں لگے گا ؟
یہ بتائیں کہ: اسلام مرد کو تو طلاق کا حق دیتا ہے، مگر عورت کو کیوں نہیں دیتاہے ؟کیا عورت انسان نہیں ہے ؟ کیا اس کے حقوق نہیں ہیں ؟

یہ کیا بات ہے کہ مرد تو جب جی چاہے عورت کو دوحرف کہہ کر فارغ کرسکتا ہے اور عورت ساری زندگی اس کے ظلم کی چکی میں پسنے کے باوجود بھی اپنی جان بخشی نہیں کراسکتی ہے۔؟ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ ملا جی نے بات سننے کے بعد کہنے لگے کہ:میں اب تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں، مگر پہلے تم مجھے ایک بات بتاؤ میں نے کہا جی ملا جی فرمائیں۔

فرمانے لگے کہ:یہ بتاؤ کہ تم ایک بس میں کہیں جانے کے لئے سوار ہوتے ہو ، اور بس والے کو کرایہ دیا،اس سے ٹکٹ لی، سیٹ پر بیٹھے، سفر شروع ہوا کیا بس والا تمہیں منزل پر پہنچنے سے پہلے کہیں راستے میں، کسی جنگل، کسی ویرانے میں اتارنے کا حق رکھتا ہے؟ بالکل نہیں رکھتا ہے۔
ٹھیک، اب ذرا یہ بتاؤ کہ اگر تم راستے میں کہیں اترنا چاہو تو تمہیں اس کا حق حاصل ہے یا نہیں ہے؟تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ:
بالکل ہے، میں جہاں چاہوں اتر سکتا ہوں

فرمانے لگے :وجہ۔؟ میں نے عرض کیا کہ:
وجہ یہ ہے کہ : ملا جی کہ وہ مجھ سے کرایہ لے چکا ہے، لہذا منزل سے پہلے کہیں نہیں اتار سکتا ہے ، اور میں جہاں چاہوں اتر سکتا ہوں، اور وہ مجھے نہیں روک سکتا ہے ، اس لئے کہ اس کا کام اس بس کے کرائے کے ساتھ وابستہ تھا جو وہ مجھ سے لے چکا ہے۔تو کہنے لگے کہ:
بالکل ٹھیک! اب ذرا پھر ایک اور بات بتاو؟فرض کرو کہ تم ایک مزدور کو ایک دن کے کام کے لئے لے کر آئے، اس نے کام کرنا شروع کردیا، اینٹیں بھگوئیں، سیمنٹ بنایا، دیوار جمانا شروع کی، اور آٹھ دس اینٹیں لگا کر کام چھوڑ کر گھر کو چل دیا، تو اس نامکمل کام پر بلآخر تمہارا رد عمل کیا ہوگا۔؟

میں نے جواب میں عرض کیا کہ: میں اسے اس فضول حرکت پر پکڑ لوں گا، اور اسے نہیں جانے دوں گا، وہ کام پورا کرے گا تو ہی اسے چھٹی مل سکے گی، تو انھونے استفسار کیا کہ: اور اگر تم اسے کام کے درمیان میں فارغ کرنا چاہو تو؟تو میں نے جواب میں کہا کہ:پھر تو مجھے اسکو اجرت دینی پڑیگی، اجرت دینے کے بعد میں اسے کسی بھی وقت فارغ کرسکتا ہوں حضرت جی اس پر فرمانےلگے کہ :اگر وہ کہے کہ میں اجرت لینے کے باوجود نہیں جاتا ہوں؟۔تو میں نے کہا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا ہے، اورمیں اسے لات مار کر نکال دوں گا۔تو کہنے لگے کہ:

بالکل ٹھیک! اب ذرا اپنے سوال کا جواب سنودنیا میں جس قدر بھی معاملات ہوتے ہیں، ان میں ایک فریق رقم خرچ کرنے والا ہوتا ہے، تو دوسرا اس رقم کے بدلے میں خدمت کرنے والا ہوتا ہے۔ دنیا کا اصول یہ ہے کہ ہمیشہ پیسہ خرچ کرنے والے کا اختیار دوسرے سے زیادہ ہوتا ہے، کوئی معاملہ طے ہونے کے وقت تو دونوں فریقوں کی رضا مندی ضروری ہوتی ہے، لیکن معاملہ طے ہوجانے کے بعد اس کے انجام تک پہنچنے سے پہلے، رقم خرچ کرنے والا فرد تو واجبات کی ادائگی کے بعد خدمت کرنے والے کو فارغ کرسکتا ہے، اسکے برخلاف خدمات فراہم کرنے والا فریق کام کو درمیاں میں چھوڑ کر خرچ کرنے والے کو فارغ نہیں کرسکتاہے۔

اگر رقم کے بدلے میں خدمت فراہم کرنے والے فریق کو کسی بھی وقت پیسہ خرچ کرنے والے کو فارغ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو مزدور دوپہر کو ہی کام چھوڑ کر گھر چلے جائیں، ملازم عین ڈیوٹی کے درمیان غائب ہوجائیں، مالک مکان مہینے کے درمیان ہی کرائے دار کو گھر سے نکال دیں، درزی آپ کا سوٹ آدھا سلا اور آدھا کٹا ہوا آپ کے حوالے کرکے باقی کام کرنے سے انکار کردے، نائی آپ کے آدھے سر کی ٹنڈ کرکے آپ کو دوکان سے باہر نکال دے، دنیا کا کل نظام چوپٹ ہوکر رہ جائے۔

کچھ سمجھا آیا تمہیں؟ تو میں بولا :ہاں ملا جی سمجھ رہا ہوں، مگر میں تو وہ طلاق والی بات کررہا ہوں تو فرمانے لگے کہ : میں تمہیں وہی بات سمجھا رہا ہوں’اب سنو ایک مرد اور ایک عورت میں جب نکاح کا پاکیزہ، محبت، پیار اور اعتماد والا رشتہ ہوتا ہے تو یہ کوئی کاروباری یا جزوقتی معاملہ نہیں ہوتا ہے، سمجھو ایک طرح سے یہ دو دلوں کا سودا ہوتا ہے، اور ایک طرح سے یہ ساری زندگی کا سودا ہے، مگر اسی ضمن میں بھی اسلام ہمیں کچھ اصول اور ضوابط دیتا ہے۔

اس معاملے اور معاہدے میں ایک فریق مرد ہوتا ہے،اور اسلام اس کے اوپر اس کی بیوی کا سارا خرچ نافذ کردیتا ہے، اور وہ کھانا پینا، رہن سہن، علاج معالجہ، کپڑا زیور، لین دین، اور زندگی کی ہر ضرورت کا بوجھ اُٹھاتا ہے، اب دیکھو اس عورت کی ساری زندگی کی ہر ذمہ داری اس مرد پر ہی عاید ہوتی ہے، یہی اس کی حفاظت کرنے اور اور اسکی عزت ،حرمت کے تحفظ کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور وہی اس کی ہر ضرورت کا کلی مسئول ہوتا ہے، یہاں تک کہ دیکھو کہ اس عورت کے مرنے کے بعد اس کے کفن دفن کا بندوبست بھی اسی مرد کو کرنا پڑتا ہے۔

اور میاں ! اس پر طرفہ یہ کہ: مرد کے مرنے کی صورت میں اس مرد کی بہت سی وراثت بھی اسی عورت کو ملنی ہوتی ہے’ہم دیکھتے ہیں کہ: ان دونوں میاں بیوی سے جو بھی بچے پیدا ہوتے ہیں وہ یوں تو دونوں ہی کا مجموعی اثاثہ ہوتے ہیں ، مگر ہم دیکھتے کہ : اسلام ان بچوں کی مکمل مالی ذمہ داری بھی صرف اور صرف مرد پر ڈالتا ہے، اور ان بچوں کی رہائش، کھانا پینا، کپڑے، علاج معالجہ، تعلیم اور کھیل کے تمام مالی اخراجات بھی

مرد اور صرف مرد کے ذمہ ہوتا ہےجبکہ اسکے برخلاف اسلام عورت کو ان تمام ذمہ داریوں سے مکمل طور پر آزاد رکھتا ہے۔

ان سب ذمہ داریوں سے پہلے، عقد نکاح کے وقت ہی مرد نے مہر کے عنوان سے ایک بھاری رقم بھی عورت کو ادا کرنی ہوتی ہے،
ان سب کے علاوہ اسلام مرد کو اس کی بیوی کے بارے میں حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے، وہ اسے **"من قتل دون عرضه فهو شهيد"** کی خوش خبری سنا کر اپنی بیوی کی عزت کی حفاظت کے لئے جان تک دے دینے کی ترغیب دیتا ہے،
اور **"حتي اللقمة ترفعها الي في امرأتك"** کہہ کر اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنے پر بھی ثواب کی نوید سناتا ہے۔

وہ اسے **"اتقوا الله في النساء"** کہہ کر بیوی کو تنگ کرنے، ستانے، بلا وجہ مارنے، دھمکانے اور پریشان کرنے پر اللہ کی ناراضگی اور عذاب کی وعید سناتا ہے تو "خیرکم خیرکم لاهله وانا خیرکم لاهلي" کہ کر گھر والوں کو محبت، پیار، سکون دینے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنے اور انہیں جائز حد میں رہ کر خوش رکھنے پر اللہ کی رضا کی نوید سناتا اور ایسے لوگوں کو بہترین انسان قرار دیتا ہے۔

مرد پر اس قدر ذمہ داریاں عائد کرنے کے بعد وہ بیوی پر اپنے شوہر کی خدمت، اطاعت، اس کے ساتھ وفا داری، اس کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔
مرد اور عورت کے اس معاہدے میں عورت کی ساری زندگی کی ہر مالی ذمہ داری مرد پر ہے، تو تم خود بتاؤ کہ طلاق کا حق ان دونوں میں سے کس کے پاس ہونا چاہئے؟

تو میں نے کہا :ویسے ہونا تو مرد کے پاس ہی چاہیئے لیکن ویسے اگر عورت کو بھی یہ حق دے دیا جائے تو آخر اس میں کیا حرج ہے؟
تو جواب دیا کہ :بھئی فرض کرو تم نے ایک خوبصورت عورت کو پسند کیا، اسکو رشتہ بھیجا، بات چلی، رشتہ طے ہوگیا، انہوں نے ایک لاکھ مہر کا مطالبہ کیا، تم نے منظور کیا، نکاح ہوگیا، تم نے جونہی مہر اس کے حوالے کیا، اس نے کہا:"میں تمہیں طلاق دینی ہوں، طلاق طلاق" اور شام کو کسی اور سے شادی کرلی، اس سے مہر وصول کرکے تیسرے، پھر چوتھےسے لگاتار شادیاں کرتی رہی تمہارے اور دوسرے متاثرہ مردوں کےدل پر کیا بیتے گی مسٹر۔؟

اس زاوئے سےسن کر تو میرے ہوش اُڑ گئے میں نے کہا کہ :اوہ ملا جی! آپ نے تو میرے ہوش اڑا دئیے ہیں، یہ تو بہت خوفناک قسم کی بات ہے۔
تو فرمانے لگے کہ:صرف یہی نہیں مسٹر۔! اس سے آگے چلو، اب جو مرد کھلے دل سے بیوی پر اپنا مال جان دل سب کچھ لٹاتا ہے، اس کے نخرے اٹھاتا ہے، صرف اس لئے کہ وہ اسے ہمیشہ کے لئے اپنی سمجھتا ہے، اگر اس کے دل میں یہ خوف پیدا ہوجائے کہ یہ کسی بھی وقت اسے لات مار کر کسی دوسرے آشیانے کو روانہ ہوسکتی ہے، تو وہ اسے گندم کا ایک دانہ بھی دیتے وقت سو مرتبہ سوچے گا، اور صرف اس مرد کی نہیں بلکہ اس عورت کی زندگی بھی ہمیشہ کے لئے جہنم بن جائے گی۔

میں پکار اٹھا کہ :سمجھ گیا سمجھ گیا! انتہائی خوفناک، بہت ہی خطرناک سچوئشن۔مگر ایک بات ملا جی۔! کہ کبھی کبھی ایسے بھیہوتا ہے، بلکہ اب تو بہت سے گھرانوں میں بھی ہورہا ہے، کہ مرد اپنی بیوی کے ساتھ نہ ہی انصاف کرتا ہے، اور نہ ہی اس کی جان چھوڑتا ہے۔ اس صورت میں کیا کیا جائے۔؟یہ سن کر بولے کہ:
آہ کیا دل دکھانے والا سوال پوچھ لیا تم نے ظالم۔

تو میں نے عرض کیا کہ :کیوں ملا جی؟ اس میں دل دکھانے والی کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ :دیکھو مسٹر !ان تمام مسائل کا حل اور مکمل کامل حل صرف اسلامی نظام میں ملتا ہے، وہی اسلامی نظام جس کی راہ میں آج روڑے اٹکانے کے لئے تم جیسے لوگ ساڑھے چوبیس گھنٹے پھرتیاں دکھاتے رہتے ہو۔!!
اگر مکمل طور پر اسلامی نظام قائم ہو ہر طرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی عزت، اہمیت اور بالادستی قایم ہو تو ایک طرف تو سب لوگوں میں اللہ کا خوف، تقوی، نیکی کے شوق اور برائی سے دوری کے احساسات پیدا ہونگے، بلکہ یہ ہی وہ چیزیں ہیں جو ہر سطح پر ظلم، زیادتی اور گناہ کو روکنے کے لئے وہ اہم کردار ادا کرینگی جو پولیس، فوج اور عدالت بھی نہیں کرسکتی ہیں۔
مگر افسوس ہے کہ تم لوگ اپنی پوری توانائی اسی خوف خدا اور دینداری کو ملیامیٹ کرنے پر صرف کرتے ہو، خود ہی اپنے آشیانے کو آگ لگادیتے ہو اور پھر اسے بجھانے کے لئے دوڑے دوڑے ہمارے پاس چلے آتے ہو، اور اپنے بچوں کو اللہ، رسول، قرآن، دین اسلام کا سبق دینے کی بجائے فلموں اور ڈراموں کا سبق دیتے ہو اور جب وہ اس سبق پر عمل کرتے ہوئے تمہیں جوتے لگاتے ہیں تو روتے روتے ہمارے پاس آکر تعویذ،گنڈوں،دعاوں اور عملیات کی درخواست کرنے لگتے ہو،حلانکہ اکثر ان چیزوں پر یقین بھی نہیں کرتے ہیں مگر جب سر پر پڑتی ہے تو ہر دروازہ کھٹکھٹانے سےگریزنہیں کرتےہو۔

سنو میرے بھائی! اگر مکمل طور پر صحیح معنوں میں اسلامی نظام نافذ ہوجائے تو اول تو ایسے واقعات پیش ہی نہیں آئیں گے،
اگر اکا دکا ایسا ہو بھی جائے تو بیوی فورا اسلامی عدالت میں جاکر قاضی(یا پھر کونسلر،ناظم،میر وغیرہ) کو شوہر کی زیادتی کی شکایت کرے گی اور قاضی سالوں تک اس مقدمے کو لٹکانے یا وکیلوں کے ہاتھوں اس کی کھال اتروانے کے بجائے دونوں کا مؤقف سن کر فوری طور پر عورت کو اس کے شوہر سے اس کا حق دلوا دیگا،
اگر شوہر کسی صورت اس کا حق نہیں دیتا ہے، یا دینے پر قادر ہی نہیں ہے، تو اس سے عورت کو طلاق دینے کا مطالبہ کیا جائے گا اور اگر وہ طلاق بھی نہیں دیتا، تو عدالت اسے جیل میں بند کرنے کا حکم جاری کریگی۔

تھانے جائے گا، پولیس والوں کے چھتر کھائے گا، تنہائی اور بے بسی کا مزہ چکھے گا تو خود ہی دوسرے کی بے بسی کا احساس پیدا ہوگا، ورنہ جب تک اس کی بیوی عذاب میں رہے گی، وہ بھی اسی دائمی عذاب میں مبتلا رہے گا۔

اسلام میں عورت کو آزادی کیوں نہیں دی گئی ہے؟

از:------------------------------

اگر ہم آج تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ امر واضح ہوجائیگا کہ اسلام نے عورت کو گذشتہ تمام مذاہب یا معاشروں سے بڑھ کر آزادی اور تقدس عطا کیا ہے ۔ اگر معترضین کے نزدیک آزادی کا مفہوم وہی ہے جو مغرب نے عورت کو دیا ہے اور اپنی روحی ،فکری،کاروباری،نراجی،اور سرمایہ دارانہ بنیادوں پر دیا ہے تو اسکو ہم قطعاً آزادی نہیں کہتے ہیں۔

اگر ہم آج مغرب میں عورت کی حالتِ ذار پر غور کریں تو یہ کھل کے واضح ہوجایگا کہ مغرب نے عورت کو آزادی نہیں دی ہے بلکہ الٹا اسکو الٹا جنسی ،جسمانی،اور فکری طور پر استعمال کیا ہے، اسکو آزادی کے ان جذباتی نعروں کے بہانے بھلا پھسلا کر الٹا سرمایہ دارانہ نظام کی ایک اہم پراڈکٹ بنایا ہے ۔
اسکی فطری کمزوریاں اور ذمہ داریاں آج بھی اسی طرح موجود ہیں جیسے ماضی میں تھیں، مغرب نے جناب کیا کیا ہے کہ اسے آزادی کا لالی پاپ دے کر دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ اسے مردوں کی ذمہ داریاں بھی سونپ دی ہیں۔ اب وہ نئی فکرو حلیہ کی رو سے آج ایک عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرد بھی ہے جبکہ اس کے برخلاف اسکی نگاہ میں اور مغرب کی نگاہ میں آج معاشرے کے مرد صرف اور صرف مرد ہی ہیں ۔

دور حاضر میں یورپ و امریکہ اور دوسرے صنعتی ممالک میں عورت ایک ایسی گری پڑی مخلوق بن چکی ہے ،جسے کھل کر تو گرا پڑا نہیں کہا جاتا ہے بلکہ باعزت قرار دینے کے دعوے کئے جاتے ہیں مگر جب تحقیق کے لئے جب ادھر ادھر نگاہ اٹھا کر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ آج صرف اور صرف سرمایہ دارانہ نظام کی ایسی لونڈی بن چکی ہے جو ہر طرف تجارتی اشیاء کی خرید و فروخت کے لیے استعمال ہوتی نظر آتی ہے ۔
وہ اشتہاری کمپنیوں کا جز ء لا ینفک ہے ، بلکہ حالت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اس کے کپڑے تک اتروا دیئے گئے ہیں ، اسکا جسم دکھلا کے اپنی چیزیں بیچی جاتی ہیں،اور اس جنسی و صنفی استحصال کو وہ چند ٹکوں اور عیش و آرام کے نام پر خالصتاً محنت و اجرت کے لفظوں سے ڈھانپ کر خوش ہوتی رہتی ہے۔

فحش رسائل و اخبارات میں اسکی پُر ہیجان انگیز عریاں تصاویر کو مارکیٹنگ کا وسیلہ گردانا جاتا ہے،یعنی وہ آج ظاہری اظہار و مظہر کا نمونہ عملی بن چکی ہے،آج جو دس فیصد عزت کی نوکریوں کو چھوڑ کر وہ پر آفس کی رونق بن چکی ہے ، گھر سے باہر بھی مردوں کے دل بہلانے کے لیے ایک ماڈل، ایک کال گرل ، ایک ریسپشنسٹ یا پھر ایک سیل گرل بن چکی ہے ، غرض یہ ہے کہ وہ آج صرف گاہکوں کو متوجہ کرنے والی ایک منافع بخش جنس مانی

جاتی ہے اس میں کیا شک ہے کہ وہ آج ہر جگہ وہ اپنی خوبروئی ، دلفریب ادا اور شیریں آواز سے لوگوں کی ہوس نگاہ کا مرکز چکی ہے ۔

یہی نہیں مس ورلڈ، مس یونیورس اور مس ارتھ کے انتخابی مراحل میں عورت کے ساتھ کیا کیا کھلواڑ نہیں ہوتے ہیں ،آج یہ کوئی ایسی خاص ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے ۔ نیز فلموں میں اداکاری کے نام پر اور آج انٹرنیٹ کی مخصوص سائٹ پر اس کی عریانیت و جنسی افعال کے کون کون سے وہ رسوا کن مناظر ہیں جو پیش نہیں کئے جاتےہیں ۔

اگر یہی عورت کی آزادی اور اس کی عزت و تکریم اور اس کے حقوق پانے کی علامت ہے تو ,انسانیت کو ایک بار ضرور اپنے پیمانہ عزت و آنر[8] پر نظر ثانی کرنی چاہئے پھر یہ سب معاملہ عورت کے ساتھ اس وقت تک روا ر کھا جاتا ہے جب تک اس میں مردوں کے لئے کشش ، ابھرتی جوانی کی بہار ، دل ربا دوشیزگی کا جوبن اور شباب و کباب کی رونق قایم و رہتی ہے ، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب اس کے جوبن میں پژ مردگی آ جاتی ہے، اس کی کشش میں گھن لگ جاتا ہے ، تو دنیا کے بازاروں میں اس کی قیمت لگنا بند ہو جاتی ہے،اب وہ مردہ،اولڈ،ڈھلتی،موت کے طرف دواں آوٹ ڈیٹیڈ پروڈکٹ گردانی جانے لگتی ہے اور اس کی مارکیٹی ڈیمانڈ کو دیمک چاٹ جاتی ہے اور اس کی ساری مادی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے تو یہ معاشرہ اس سے منہ موڑ لیتا ہے ،یوں وہ کسی کونے میں پڑی فضول شہ کہلاتی ہے جسکو یا تو کسی کونے کھدرے میں پڑا ہونا پڑتا ہے یا وہ اولڈ ہاوس میں جاکر سوجاتی ہے، اگر ان الفاظوں کو دبل بھی دیا جائے تو وہ ادارے جہاں اس نے جوہر کمال دکھائے تھے اس کو چھوڑ دینے میں عافیت سمجھتے ہیں اور وہ اکیلی یا تو اپنے گھر میں کسمپرسی کی زندگی گزارتی ہے یا پھر پاگل خانوں میں سر پٹکتی رہ جاتی ہے۔

یہ ہے آزادی نسواں کی موجودہ کڑوی حقیقت اور یہ ہے اس کا حتمی برا انجام ،جس کی تمنا میں عورت باولی ہوئی جارہی ہے، پھر اس کا اثروتفوذ صرف عورت تک محدود نہیں ملتا ہے بلکہ انسانی زندگی کے وہ تمام شعبہ ہائے حیات اس اس سے متاثر ہوتے ہیں جنکا وہ لازمی جزو ہوا کرتی تھی، جیسا کہ ایک مغربی مصنف اس ضمن میں رقم طراز ہے کہ:

’’وہ نظام جس میں عورت کے میدان عمل میں اترنے اور کارخانوں میں کام کرنے کو ضروری قرار دیا گیا تھا، اس سے ملک کو چاہے کتنی بھی دولت و ثروت مہیا ہو جائے، مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس سے گھریلو زندگی کی عمارت زمیں بوس ہو کر رہ گئی ہے، کیونکہ اس نظام نے گھر کے ڈھانچہ پر حملہ کر کے خاندانی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور معاشرتی تعلقات و روابط کے سلسلہ کو درہم برہم کر دیا ہے‘‘۔

---

[8] **Honor.**

آج فطرت سے بغاوت کی وجہ سے عورت کی خاندانی ، ازدواجی زندگی سخت تباہی کا شکار ہے ، وہ ظاہری طور پر خوش دکھتی ہے، مگر دروں خانہ وہ خوبصورت مگر عظیم پُر خطر نفسیاتی طور پر وسیع وگہرے بحران کا شکار ہے،آج وہ سرمایہ دارانہ زہریت کے سبب اپنی ذات میں بالکل تنہا اور بے سہار ا ہو چکی ہے، کیا یہ ہی آزادی ہے:جسکی وہ متمنی ہے؟ دیکھو تو واضح ہوگا کہ کہاں یہ بازاری حیثیت اور کہاں ایک بہن ، ایک بیٹی ، ماں ، پوپھی ، خالہ، دادی ، نانی کی مقدس حیثیت اور احتـــــــــــــــــــــــــــــــــــرام ،

ظاہر ہے مشرقی ہو یا اسلامی تصور آزادی ہر دو صورت میں آزادی چاہئے کتنی محدود و مقید ہو عورت انتخاب،کجروی اور مفاہمت کا حق تو رکھتی ہے،اس بنیاد پر اپنی زندگی کے ان فیصلوں،اختیارات پر وہ حق محفوظ رکھتی ہے اب اسے کونسی راہ چننی ہے جو اسے محبوب ہے وہ اسے چن کر اپنےعزت و وقار کو اپنے لئے خود ہی چن سکتی ہے،اب اگر کوئی اسکا تصور اقدار بدلنا چاہے تو یہ علمی ،ثافتی،سماجی معاملہ ہے،اور چاہے اقدار کوئی بھی ہوں ،دیہی ہوں یا ریاست،ثقافتی ہوں یا علاقائی ان پر اسکے مذہبی اقدار کی برتری ہر سطح پر حاوی رہتی ہے،اب وہ اگر کسی مذہب کو مناتی ہی نہیں تو پھر معاملہ دوسرا ہے،مگر کامل آذادی کو نراجیت کہتے ہیں جدید طاقتور ہوتی ریاستوں کے دم پر قایم اقدار کسی خالص اصول و ضوبط سے خارج اقدار یا حریت کو کبھی تسلیم نہیں کرتے ہیں۔[9]

[9] **ڈاکٹر محمد علی جنید**

حجاب

از: مہران درگ

جون ایلیا نے ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ:

‘‘آزادی نسواں کے علمبردار حقیقت میں عورت کی آزادی کے نام پر عورت تک پہنچنے کی آزادی چاہتے ہیں۔’’

اٹلی کے وزیرِ داخلہ جناب **رابرٹ مارونی** سے جب کہا گیا کہ جناب! ضرورت اس امر کی ہے کہ حجاب کی ممانعت کے حکم نامہ پر اب دستخط کر ہی دینے چاہئیں: رابرٹ مارونی اس وقت چائے کا ایک مگ ہاتھ میں لیے کھڑے تھے ، تو وہ سامنے لگے پور ٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ ، اگر کنواری ماں ماں مریم اپنی تمام تصویروں میں حجاب پہنے ظاہر کناں ہو سکتی ہے ، تو تم کون ہوتے ہو مجھے کہنے والے کہ میں حجابپر قدغن کے حکم نامہ پر دستخط کردوں۔

یمن کی ایک عرب لڑکی **توکل کامران** کو جب نوبیل پرائز کے لیے نامزد کیا گیا تو جب وہ سپیچ کرنے ڈائس پہ آئ تو سٹیج سیکٹری نے مائیک میں سوال کیا:حیرت ہے آپ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں پھر بھی حجاب کرتی ہیں؟ تو .اس نے کہا کہ : زمانہ قدیم میں جب لوگ جاہل تھے تو ننگے تھے ،کپڑوں سے باہر تھے ، جو کچھ آج میں پہنے کھڑی ہوں یہ تہذیبِ انسانیت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے ناکہ رجعت پسندی! اب اگر کوئ کپڑوں سے باہر آتا ہے تو وہ زمانہ قدیم کی تنزلی یا رجعت پسندی ہوگی۔

<u>**علی ہجویریؒ نے کہیں کہا تھا کہ:**</u>

عادت بھی حجاب ہے!
یعنی عادات و اطوار میں اک بیچ بچاؤں الگ تھلگ ملبوسیت کے جیسا ہی حجاب ہے فرانس ، جرمنی ، ناروے ، کینڈا ، ہالینڈ ، مشرقی مغربی یورپ میں بل دھونس بندوق کی نوک پر حجاب پہ پابندی کے بل پاس کرائے گئے ، راہ چلتی مسلم خواتین کو عبائیوں سے پکڑ کر سڑکوں پہ گھسیٹا گیا جرمانے عائد کیے گئے، اور پھر فقط اپنی مرضی کے کپڑے زیب تن کرنے پر جیلوں میں ڈالا گیا ؟ عقل پر تف کہوں تو کم ہی ہوگا کیونکہ آج زمانے نے غالباً کسی کی نگاہ میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب کوئ عورت اپنی مرضی سے کپڑے بھی نہیں پہن سکتی؟ -

کیا یہی معروفِ زامنہ آزادی اظہارِ رائے و مظہرِ ظاہر ہے ؟ایک قصہ ہے کہ -
ایک آدمی عین ایک سڑک کے بیچوں بیچ نا صرف چلا جا رہا تھا ، بلکہ زور زور سے گول

دائرے میں بانس کا ڈنڈا بھی گھما رہا تھا ، بانس کی نوک جب ایک راہگیر کی ناک کے قریب سے گزری تو اُس نے اُسے روک کر پوچھا کہ جناب یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ تواس نے کہا کہ : میں اپنی آزادی کا اظہار کر رہا ہوں ، راہیگر نے کہا ، دیکھیے جناب! بات آپکی اغلباً درست ہوگی مگر یادرہے آپکی آزادی عین وہیں پر ختم ہوتی ہے جہاں سے میری" ناک" شروع ہوتی ہے۔

ہمیں حیرت تو یہ ہے کہ کسی مخصوص مذہب و گروہ کو بہ جبر پابند سلاسل کرنے والے کہاں سے روشن دماغ تسلیم کئے جاسکتے ہیں؟ جو ہمیں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم جیسوں نے دینِ اسلام کو تلوار وسناں کی نوک پر رائج کیا ہے ، کیا یہ اب بھی ایسا اعتراض وارد کرنے کا کوئ معقول علمی و سیاسی جواز رکھتے ہیں جبکہ خود یہ لوگ بہ نوکِ بندوق دوسروں کو پابندِ سلاسل کرتے ہیں اور بے حیائ اور روشن خیالی پھیلانے والے یہ لوگ اور انکی حکومتیں کیا خود شدت پسند اور متعصبی نہیں ہیں تو اور کون ہیں؟ حجاب پر جرمانہ یا جیل بھیجنے والوں کی بندوق کی نوک کے سامنے صبر کا مظاہرہ کرنے والوں کو کروڑہا بار سلیوٹ مارنے کو دل کرتا ہے۔

اپنی تہذیب کا آزادی اظہار کے نام پر چورن بیچتے یہ لوگ دوغلی ذہنیت و اصلیت کے حامل نظر آتے ہیں ،جبکہ ہمارے شعایر کا تمسخر اُڑانا انکے نزدیک عین روشن خیالی ہے اور انکا یہ ذاتی یک طرفہ آزادی اظہارِ رائے کا خود تک محدود حق کیا انکی ضمیر کی عدالت میں انہیں رسوا نہیں کرتاہوگا :ارے ہاں یہ تو جبھی ہوگا نا جبکہ انکے پاس منصف مزاج ضمیر موجود ہو ؟ ان یک طرفہ بے غیرتوں میں سے غنیمت ہے کہ انہی کی صفوں میں سے ہمیں کوئ ایک آدھ صاحبِ ظرف بھی ملتا ہے جو انہی کے منہ پی تماچہ جڑ کے انہیں انکی اصلیت سے آشکار کرتے ہوئے ان سے اس ضمن میں کچھ کہدیتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ :یورپ کی انسانی حقوق کونسل کے کمشنرتھامس حماربرگ نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

"اس طرح کے اقدامات سے الٹا خواتین کو آزادی دینے کی بجائے انھیں معاشرتی زندگی سے ہی نکال باہر کیا جارہا ہے۔ درحقیقت برقع پر پابندی، یورپ کے انسانی حقوق کے معیارات اور خاص طور پر کسی کی نجی زندگی اور ذاتی شناخت کے احترام کے کلیئے کے منافی ہے۔ اور آج جس طریقے سے مسلم خواتین کے لباس کے معاملے کو اچھالا جارہا ہے، اس سے نمٹنے کے لیے ایک حقیقی بحث اور قانون کے بعد قانون سازی کی ضرورت ہے۔"

امریکا ہی کی ایک ہسپانوی النسل نومسلمہ نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"جب میں مغربی لباس میں ہوتی تھی تو مجھے خود سے زیادہ دوسروں کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا، گھر سے نکلنے سے پہلے اپنی نمائش کی تیاری، یرے لئے یقین جانیں روز ایک کافی حد تک کرب انگیز اور مشکل عمل تھا۔ پھر جب میں کسی اسٹور، ریسٹورنٹ یا کسی ایسے مقام پر جہاں بہت سارے لوگ

جمع ہوں، جاتی تھی تو خود کو دوسروں کی نظروں میں جکڑا ہوا محسوس کیا ن کرتی تھی، دیکھنے میں بظاہر میں آزاد وخود مختار ہوتی تھی، لیکن درحقیقت دوسروں کی پسند وناپسند کی قیدی ہوتی تھی، پھر مجھے ہر پل یہ فکر بھی لاحق رہتی تھی کہ جب تک حسن اور عمر ہے، لوگ میری طرف متوجہ ہیں، عمر ڈھل جانے کے بعد خود کو قابل توجہ بنانے کے لیے مجھے اور زیادہ محنت کرنی پڑے گی؛ لیکن اب اسلامی پردے نے ان الجھنوں سے مجھے یکسر بے فکر وآزاد کردیا ہے۔''

ہم کو فقط حجاب پر ہالینڈ نے حجاب پر فی کس ایک سو پچاس یورو جرمانہ عائد کا قانون بنا رکھا معلوم پڑتا ہے کہ :جو خود
پھر انکے منہ پر انہی کی تہذیب کی کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہاتھ اٹھتا ہے اور ایک تمانچہ جڑ دیتا ہے۔

ماضی قریب میں ہم دیکھتے ہیں کہ :
فرانس کے ایک بزنس مین نے جب یہ دیکھا کہ : فرانس میں حجاب پہ پابندی لگادی گئ ہے تو اس نے کہا کہ
مسلمان عورتیں حجاب کا حق رکھتیں ہیں اور وہ اس ضمن میں اپنا مذہبی حجاب جاری رکھیں اور فی یوم کے حساب سے پورے فرانس میں اگر ایک بھی موجود مسلم خاتون ہوگی تو اسکا جرمانہ میں خود ادا کردوں گا۔

سچ تو یہ ہے کپ بہ ضمن معیارِ تہذیب تم مغرب پسند لوگ دراصل ہمارے شعائر کی جوتی کی انی کی برابر بھی نہیں پہنچ سکتے ہو ،جان لو کہ پانی اپنا راستہ خود بناتا ہے اور اگر تم پل باندھو گے تو حد سے تجاوز کروگے تو الٹا پل پل بہا لے جائیگا۔

اکبر الہ آبادیؒ نے کیا خوب کہا تھا کہ:

یہی ہے عقدہ کشائ قوم تو اک دن
ازار بند کو کہہ دیں گے حبس بے جا ہے

کیا پردہ قید ہے؟:ایک منطقی بحث

از:--------------------------

آج فی الزمانہ لبرلز اور سیکولرز کی طرف سے عورت کے پردہ کی مخالفت میں مختلف باتیں پڑھنے اور سننے کو ملتی رہتی ہیں ، ہمیں کئی جگہوں پر یہ بھی پڑھنے کو ملا کہ مولویوں نے عورتوں کو قید میں رکھا ہوا ہے انکو کسی قسم کی آزادی نہیں دیتے ہیں ۔اول تو ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہیے کہ جناب ! بلآخر موئی قید کہتے کس شہ کو ہیں ؟

ہم بتاتے ہیں قید حبسِ خلاف طبع (طبیعت/چاہت کے خلاف قید) کو کہتے ہیں اور جو امر حبسِ خلاف طبع نہ ہو اس کو قید ہر گز نہ کہیں گے۔مثلا باتھ روم میں آدمی اپنی مرضی سے پردہ ڈال کر بیٹھتا ھے، اب اگر ہر حبس /پردہ قید ہے تو اسے بھی قید ہی کہنا چاہیے اور یہ ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ جناب! آج ہم بھی اتنی دیر قید میں رہے مگر خیر اتنا تو طے ہے کہ اس کو کوئی بھی قید نہیں کہتا ہے کیونکہ یہ امر حبس طبعی کی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

ہاں اگر اُسی باتھ روم میں کسی کو بلاضرورت بند کر دیا جائے اور باہر سے تالا لگا کر ایک پہرہ دار کھڑا کر دیا جائے اور اس سے کہہ دیا جائے کہ خبرداریہ آدمی یہاں سے نہ نکلنے پائے تو اس صورت میں بے شک یہ فعل حبسِ خلاف طبع کی قسم میں شمار ہو گااور اس کو لازماً قید ہی کہیں گے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر حبس بیجا کا مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

چناچہ یہ امر ثابت ہوا کہ ہر حبس کو قید نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ صرف حبس خلاف طبع کو قید کہہ سکتے ہیں۔
اعتراض کرنے والوں کو پہلے اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ جو مسلمان عورتیں ج پردے میں رہتی ہیں ۔وہ پردہ عین ان کی طبیعت کے موافق ہے یا مخا لف ہے؟ یہ حبسِ طبع ہے یا خلافِ طبع ہے ؟اس کے بعد انکو ایسا کہنے کا کیا حق ہے؟۔

سب جانتے ہیں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے لیے خلاف طبع نہیں ہے،کیونکہ مسلمان عورتوں کے لیے حیاہ امر طبعی ہے،لہذا پردہ حبس طبعی ہوا اور اس کو قید کہنا بلکل غلط ہے بلکہ ظلمِ بیجا اور خلاف طبعی و فطری امر ہے، بلکہ اب اگر ان خواتین کو بے پردہ رہنے پر مجبور کیا جائے، انکے حجاب پر پابندی لگادی جائے ،جیسے آج کل آزادی کے چئمپین اپنے اپنے ممالک میں لگارہے ہیں تو جناب! یہ پابندی ظلمِ بیجا ہے اور بلکل خلافِ طبعی ہوگی ۔ اور قید اسی کو کہنا چاہیے ، اور ہمارے ان موجودہ ترقی پسندوں کے لیے ایسا کہنا ہی خود انکے لئے نقصان دہ ہے ۔ کیونکہ الٹااس حبس یا پابندی کے خلاف دو جملے بولنے سے ہی ان روشن خیالوں کی زبانوں پر چھالے نکل آتے ہیں۔

عورت کا وراثت میں حصہ آدھا کیوں ہے؟

از : محمد سلیم

اعتراض :ذرا قرآن کھول کے سورہ النِسا پڑھوجس میں یہ صاف تحریری حکم ملتا ہے کہ عورت کو وراثت میں سے آدھا حصّہ ملے گا ۔ (یعنی بھائی کو دوحصے ملیں گے اور بہن کو ایک حصہ ملیگا)۔

رفع اشکال:

اول تو یہ امر واضح ہوجانا چاہئے کہ اس بحث میں کسی شک کی گنجایش نہیں ملتی ہے کہ اسلام کے قانونِ وراثت ہیں میں عورت کا حصہ مرد سے آدھا رکھا گیا ہے ، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے،اور کن وجوہات کی بنا پر ایسا حکم مقرر کیا گیا ہے ؟ کیا مرد اور عورت کا حصہ برابر نہیں ہو سکتا تھا ؟

اگر آپ اس معاملے کو گہرائی میں جا کر پرکھیں تو محسوس ہو گا کہ عورت کا حصہ آدھا ہونے کے باوجود مرد سے زیادہ ہے اور مرد کا حصہ دگنا ہونے کے باوجود عورت سے کم ہے ۔ جیسا کہ سورہ **النساء کی آیت نمبر: 33** کو پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے ۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ حقوق و فرائض کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے ،مثلاً اگر میں دو میں سے ایک شخص کو سو روپے دوں اور دوسرے کو پچاس روپے دوں ۔ تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ میں نے دوسرے کو آدھا دے کر اس کا حق مارا ہے ۔ مگر اگر میں سو روپے والے شخص کو پابند کر دوں کہ پچاس روپے والے شخص کی پوری زندگی کا تمام خرچہ تم نے اٹھانا ہے تو اب زیادتی کس کے ساتھ ہو گی ؟

سوچیئے ؟ پچاس روپے والے شخص کے پاس پچاس روپے باقی رہیں گے کہ اس کا کوئی خرچہ نہیں ہے،یہ ایک الگ بحث ہے کہ وہ اپنے پچاس روپے کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے انہیں مھحفوظ رکھتا ہے،زیاں کرتا ہے یہ ان سے مذید کمائی کا کوئی طریقہ اختیار کرتا ہے، اس امر میں وہ عین فایدہ ہی فایدہ میں ہے ۔ اس کا اپنا خرچہ بھی دوسرا اٹھا رہا ہے اور سو روپے والا شخص کچھ ہی عرصے میں سارے پیسے خرچ کر بیٹھے گا مگر فرض ساقط پھر بھی نہیں ہو گا ۔ پھر وہ اپنی کمائی بھی اُسی پہ خرچ کردے گا ۔

عین اس مثالِ محولہ بالا سے متلا جلتا یہی معاملہ اسلام میں عورت اور مرد کے مابین وراثت کی تقسیم کے ضمن میں ملتا ہے ۔ ہم جابجا اپنے مشرقی ومسلم معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ اللہ نے عورت کو معاش کی فکر سے بہت حد تک آزاد رکھا ہے ۔ایک عورت جب پیدا ہوتی ہے تو مکمل طور پر باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے ، باپ اس کے کھانے پینے کپڑوں اور رہائش کے بندوبست کا پابند ہوتا

ہے ۔ باپ مر جائے تو وہ شادی ہونے تک بھائی یا کسی اور قریبی محرم کی ذمہ داری ہوتی ہے، شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کی ذمہ داری بن جاتی ہے ۔

جب شوہر مر جائے تو وہ بیٹوں کی ذمہ داری یا اگلے شوہر کی ذمہ داری میں شمار کی جاتی ہے ،یعنی کہ عورت کے پیدا ہونے سے مرنے تک اس پر نہ تو کمانا فرض کی گیا ہے اور نہ ہی کسی کی کفالت کرنا اسکے ذمہ مقرر کیا گیا ہے،ماسوا کچھ استثنیات کہ ۔ حد یہ کہ اس سے یہ مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جو رقم اسے باپ کی جائداد میں سے ورثے میں مل رہی ہے اسے وہ گھر کا خرچہ چلانے میں صرف کر دے ۔ ہاں اگر اپنی مرضی سے کچھ کرنا چاہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے،کیونکہ بحرحال وہ اس کا مال مانا جاتا ہے جسکو وہ جس طرح چاہے خرچ کرے اس امر میں وہ آزاد ہے ۔

مگر مرد کا معاملہ اس سے مذہب و معاشرت کی رو سے قطعاً مختلف نوعیت کا حامل ہے، اس پر معاش کی ایک بھاری تنگی اور ذمہ داری کل حیات تک کے لئے ڈالی گئی ہے ، جبکہ اس بیچارے کے سکون کا زمانہ صرف اس کی معصومیت کا زمانہ ہی ہوتا ہے ۔ جیسے ہی بالغ ہو گا اسے اپنے باپ کے ساتھ مل کر معاشی جدوجہد شروع کر دینی پڑتی ہے ، اپنے ماں باپ کا سہارا بننا پڑ جاتا ہے ، اپنی بہنوں کی کفالت اٹھانی پڑتی ہے ۔ پھر شادی کے بعد تاحیات اپنی بیوی اور بچوں کا ہر قسم کا خرچہ اٹھانا پڑتا ہے ۔ وہ نا ہی ان سب سے بھاگ سکتا ہے اور نا ہی ان ذمہ داریوں کا انکار کر سکتا ہے ورنہ گناہ گار تسلیم کیا جائیگا ۔

یقیناً یہ سب ذمے داریاں کسی شک کے بغیر صرف وراثت سے حاصل کردہ رقم سے پوری نہیں کی جا سکتیں ہیں ۔

‘‘ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم عورت کے وراثتی حقوق کا مطالبہ اسلامی معاشرے سےکرتے ہیں اور عورت کے فرائض اہلِ مغرب سے مستعار لیتے ہیں ،یعنی حقوق ،مذہبی معاشرے سے مانگتے ہیں اور لذت،انبساط اور بلا تحدید آزادی کے مطالبے مغرب سے اخذ کرتے ہیں،اور ترجیح فکر مغرب کو دیتے ہیں بلاشبہ یہ ہماری علمیاتی منافقت کا اعلی نمونہ ہے،جس میں پدر دری نظام کی سہولیات و حقوق سے لطف اندوز ہوکر فکری زاویہ کو مغرب سے اخذ کرکے مذہبی آثار،روایات اور پدرسری معاشرت کی تخریب و تباہی کا سامان پیدا کیا جاتا ہے’’[10]۔

یقیناً مغرب میں عورت مرد کے ساتھ ہر معاملے میں پچاس فیصد کی شریک ہوتی ہے،مگر اس ضمن میں شروط و کا تعین بھی کیا جاتا ،کچھ عقود و معاملات دونوں فریقین میں اس ضمن میں بروئے کار لائے جاتے ہیں،جن کی پابندی سے بچنے کے لئے ،مرد و عورت دونوں شادی کرنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ اس عمل سے بہت سی سیاسی،قانونی،اور معاشرتی ذمہ داریاں ان پر مغربی معاشرت و ریاست کی رو سے قایم ہوجاتی ہے جبھی وہ جنسی افعال سے لیکر رہایش گاہ تک کے معاملات باہمی رضا سے طے کر لیتے ہیں اور نکاح کی پابندی سے نجات حاصل کرکے،بچے کی پیدایش سےانکار کی حکمت عملی پر کاربند رہتے ہیں ، جسکی وجہ سے وہ قانونی دایرہ کار و چارہ گوئی سے بچ نکلتے ہیں۔

[10] **ڈاکٹر محمد علی جنید**

اگر چہ وہاں غور کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا یہ حق تو وہاں اس حد تک تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ باپ کی جائداد میں سے اسے پچاس فیصد حصہ پائیگی ،مگر ساتھ میں اس کا یہ بھی فرض جانا جاتا ہے کہ اس مساواتی برابری کی رعایت سے فایدہ اٹھا کر وہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر گھر کا آدھا بوجھ بھی اٹھائے ، اگر گھر کا کرایہ ہزار ڈالر ہے تو اس میں سے پانچ سو ڈالر عورت بھی ادا کرے گی ورنہ وہ شوہر کے ساتھ زیادتی کی مرتکب مانی جائے گی ،اسی طرح شوہر کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اسے اپنے گھر سے نکال دے،کیونکہ وہاں نکاح ایک معاہدہ زوجیت ہے جسکے کچھ سیاسی،قانونی اور معاشرتی تقاضے بحر حال ریاست کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں ،جنکی خلاف ورزی کی صورت میں عدلیہ سے رجوع کیا جاسکتا ہے ۔ [11]

اسکے علاوہ گھر کے باقی ماندہ اخراجات جن میں کھانا پینا کپڑے وغیرہ بچوں کے اخراجات ہر قسم کے امور شامل ہیں ۔ غرض جو بھی گھر کے اخراجات ہوں گے اس میں بیوی اپنا پچاس فیصد حصہ ڈالے گی ۔

'' اب سوال یہ ہے کہ وہ اتنا پیسہ لائے گی کہاں سے ؟ باپ کی جائداد میں سے کتنا حصہ مل گیا ہو گا ؟ ظاہر ہے مسلم معاشرہ ہویا مغربی معاشرہ ہر فرد کے پاس قارون یا بل گیٹس جتنی دولت تو ہوگی نہیں،نا ہی ایک دو امیروں پر کل دنیا کی عوام کی مالی حالت کو قیاس کرنا جایز تصور کیا جاسکتا ہے، خیر یہاں مغربی معاشرت و قانون اسلام کے زمہ دارانہ معاشرت کے برخلاف صاف کہتا ہے کہ مجھے تمہاری حالت زار سے کچھ لینا دینا نہیں ہے،اب اے عورت جا ! جہاں سے مرضی لا ، جاب کر ،سڑکیں کھود ، لوگوں کا مال ڈھو، تو جو چاہئے پیٹ پالنے کے ضمن میں کر یہ مغرب کےمرد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ الٹ تیرے مساواتی برابری کے مطالبے و حق کے سبب اب تیرا بھی مسلہ ہے ،کچھ نہیں تو انفرادی لبرل حریت کی رو سے جب تو ہی اپنی معبودِ حقیقی ہے ،تو ہی خود اپنی عبد بھی ہے ،لہٰذا تیرا جسم تیری مرضی بیچ دے اسے ،روزاسے کتنوں سے نچوا ،بس جا پیسہ کما ،خود بھی کھا اور ریاست کو بھی ٹیکسوں کی صورت میں کھلا،تو یہ سب کریگی تو ہی ریاست سے کچھ لینے کی اہل گردانی جائیگی ۔

جبکہ اس مغربی تصور کے بڑخلاف صدیوں سے اسلام عورت کو ایسی مشقت بھری زندگی نہیں دینے کے موقف پر قایم ہے ۔ مذہب و تخلیق کی رو سے اللہ نے عورت کو فطرتاً کمزور بنایا ہے اور مرد کو طاقتور بنایا ہے۔ اور وہاں اسی فرق کی بناء پر فرائض لاگو کئے جاتے ہیں اور اسی فرق کی بناء پر حقوق بھی عطا کئے جاتے ہیں'' [12] ۔

---

[11] **ڈاکٹر محمد علی جنید**

[12] **ایضاً**

اسلامی قوانین میں آخر عورت کی گواہی آدھی کیوں مقرر کی گئی ہے ؟

از:محمد سلیم

عورت کی گواہی کو آدھا قرار دینے کے ضمن میں دین اسلام کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے،مستشرقین تو خیر صدیوں سے اس ضمن میں مشہور و معروف ہیں مگر خود آج کے جدت پسند مسلم ،جنکا علمی،و عقلی ماخذ مغربی اعراضات اور انکا معیار مغربی اقدار ہیں ،اس امر میں آج کل پیش پیش نظر آتے ہیں،جن میں پرویزی اور غامدی مکتبہ فکر خاص الخاص ہے،اگر چہ انکا قران پر اعتماد اور حدیث سے انکار اس ضمن میں خود ان کے درمیان علمی مسایل پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے ،کچھ اسے ڈھکے چھپے انداز میں مولوی کی شیطانی قرار دیکر قران پر براہ راست تنقید کرنے سے بچنے کی جسارت کرتے ہیں۔،اب دیکھا جائے کہ یہ ھکم قران میں اصل میں ملتا ہے یا حدیث میں تو جناب دل کھول کر سن لیں اسکی اصل قران میں ملتی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے کہ:

‘‘مومنو! جب تم آپس میں کسی معین میعاد کے لئے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں (کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ) انصاف سے لکھے نیز لکھنے والا جیسا اسے خدا نے سکھایا ہے لکھنے سے انکار بھی نہ کرے اور دستاویز لکھ دے۔ اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے اور خدا سے کہ اس کا مالک ہے خوف کرے اور زر قرض میں سے کچھ کم نہ لکھوائے۔ اور اگر قرض لینے والا بےعقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔ اور اپنے میں سے **دو مردوں کو (ایسے معاملے کے) گواہ کرلیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں** جن کو تم گواہ پسند کرو (کافی ہیں) کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلادے گی۔ اور جب گواہ (گواہی کے لئے طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔ اور قرض تھوڑا ہو یا بہت اس :کی دستاویز) کے لکھنے میں کاہلی نہ کرنا۔ یہ بات خدا کے نزدیک نہایت قرین انصاف ہے اور شہادت کے لئے بھی یہ بہت درست طریقہ ہے۔ اس سے تمہیں کسی طرح کا شک وہ شبہ بھی نہیں پڑے گا۔ ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو اگر (ایسے معاملے کی) دستاویز نہ لکھوتو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور جب خرید وفروخت کیا کرو تو بھی گواہ کرلیا کرو۔ اور کاتب دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح نقصان نہ کریں۔ اگر تم (لوگ) ایسا کرو تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہے۔ اور خدا سے ڈرو اور (دیکھو کہ) وہ تم کو (کیسی مفید باتیں) سکھاتا ہے اور خدا ہر چیز سے واقف ہے ’’[13]

یہ امر البقرہ کی محولہ بالا آیت سے واضح ہے کہ ہے یہی وہ قرآنی آیت ہے جس کی رو سے آمت مسلمہ نے عورت کی آدھی گواہی کا حکم اخذ کیا گیا ہے، مگر آپ اگر یہاں بہ نظر غایر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک کاروباری لین دین کی بابت بات ہو رہی ہے ناکہ کسی اور معاملے کی بابت

---

[13] سورہ البقرہ : آیت 282

گفتگو کی جارہی ہے ۔ یہ بات تو میں اپنی ایک سابقہ تحریر بابت وراثتِ نصفہ متعلق از النسا میں بیان کر چکا ہوں کہ عورت پر معاش کی فکر لاگو نہیں کی گئی ہے ، لہٰذا یہ معاملہ یقیناً عورت کی دلچسپی سے باہر کا معاملہ مانا جاتا ہے ۔

جیس کہ خود آیت میں یہ بات بھی بیان کی گیی ہے کہ اگر ایک عورت بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی،اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا ہے کہ عورتیں شائد بھلکڑ قسم کی جنس ہوتی ہیں ،جبھی اسی طرف اشارہ دیا گیا ہے میرا کہنا ہے کہ معاملہ کچھ عین ایسا نہیں ہے،جیسا اسے سمجھا یا بتایا جارہا ہے چونکہ سائنسی لحاظ سے بھی یاداشت کا تعلق انسان کی دلچسپی اور عدم دلچسپی کے امور سے متعلق ہوتا ہے ناکہ دماغ کی کمزوری سے تعلق رکھتا ہے ۔ جیسا کہ آپ اس ضمن میں ایک مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ آپ کسی سائنسدان سے اس کی مشکل ترین تھیوریز مطالبہ کرکے فرفر سن سکتے ہیں ۔ مگر دوسری جانب اس سے یہ پوچھیں کہ اس نے کھانے میں کیا کھایا تھا تو شاید ممکن ہے کہ وہ علمی شخصیات کی معروف غایب الدماغی کے تناظر میں سوچ میں پڑ جائے گا کیونکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کھانا کھاتے وقت بھی اس کی دلچسپی کھانے کے بجائے اپنی تھیوریز میں ہی پھنسی ہوتی ہے عین یہی معاملہ عورتوں کے ساتھ بھی متعلقہ ہے چونکہ اس آیت کے عہد اور مسلم معاشرت کی طرف سے محبوب جانی گئی پدر سری معاشرت کی رو سے ہمارے خارجی دنیاوی کاروباری معاہدے چونکہ خارجی حد تک عورت کی دلچسپی کے موضوعات نہیں ہوتے ہیں ، لہٰذا یہاں دو عورتوں کی قید لگادی گئی ہے ۔

مزید یہ بھی جان لیا جائے کہ گواہی ایک ذمہ داری ہوتی ہے جس میں 100 فیصد اعتماد درکار ہوتا ہے، اور اگر کسی نے غلط گواہی دے دی اور پھر وہ پکڑے گئے تو اس پر سزا ملتی ہے اور اگر بچ گئے تو ساری عمر ضمیر چین نہیں لینے دیتا ہے آج کل اور بھی زیادہ بڑے جھنجٹ اس ضمن میں جابجا پائے جاتے ہیں ، بار بار تھانے کچہریوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ لوگ گواہیاں دینے سے بھاگتے ہیں، جرم ہوتا دیکھ کے کہتے ہیں ہمیں نہیں معلوم کس نے کیا ہے ۔

اسی لئے ایسے سنیجدہ و متین حساس مقدمات جن میں یہ ذمہ داریاں اور ذیادہ بڑی اور پرُ بوجھ ہوجاتی ہیں وہاں اللہ تعالی نے اکیلی عورت سے اس ذمہ داری کو ہٹا دیا ہے، مثلا قتل یا زنا کے معاملات وغیرہ ۔ ایسے مقدمات کی گواہی میں شرعاً و احتیاطاً دو عورتوں کو اکٹھا کردیا گیا ہے کہ وہ آپس کے مشورے کے بعد تسلی کے بعد حقیقت بیان کردیں۔عورت کو چونکہ اللہ نے نرم دل کا مالک بنایا ہے لہذا ایک عورت ممتا ، ترس،رحم اورخُدا خوفی کی وجہ سے بڑی سے بڑی غلطی کو نظر انداز کر سکتی ہے،پھر جب عورت زخمی ناگن کی طرح ہوتی ہے تو مرد کی سفاکیت،دشمنی،نفرت،و عناد اس کے مقابل ہیچ ہی رہتا ہے،اس امر سے تجربہ کار عورتیں بخوبی واقف ہیں ۔

اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ :اکثر اوقات اس پر اس کی عاطفت و نرمی و رحمدلی غالب آ جاتی ہے، جہاں سزائے موت کا معاملہ ہو وہاں اکیلی عورت اپنے احساسات، جذبات پر کیسے قابو رکھ سکے گی ؟ یہ کیفیت عورت میں مرد کے مقابلہ میں اکثر پیدا ہوتی رہتی ہے ، مرد غصہ اور فرحت کی دونوں حالتوں میں اپنے احساسات اور عواطف کا مالك ہوتا ہے اور اس پر بہت تک عموماً قابو رکھتا ہے، لیکن عورت حالات و ظروف کی کمیت و کیفیت،شدت و حدت کے قلیل سے سبب سے بھی متاثر ہو جاتی ہے اور یہ تو عام سا مشاہدہ ہے کہ اس کے آنسو کسی چھوٹے سے حادثہ پر بھی امڈ آتے ہیں. گواہی چونکہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے یہ سخت دلی، مضبوط اعصابی قوت، احساسات اور جذبات پر کنٹرول کا تقاضا کرتی ہے اس لیے شرعاً خالقِ نسا و رجال نے عورت کے ذمہ کو کم رکھا ہے

اور اس کا اطلاق میری ناقص رائے کے رو اسکے متعلقہ سارے معاملات پر نہیں ہوتا ہے ۔مثلا اگر مسئلہ رضاعت(عورت کے کسی کو دودھ پلایا جو اسکی اولاد نا تھی وہ اسکا رضائ بیٹا ہوگا)۔ یہاں عورت کی گواہی 1000 مردوں پر بھاری ہوسکتی ہے۔ مطلب اگر عورت عدالت میں کسی بچے کے متعلق یہ کہے کے یہ میرا رضائی بیٹا ہے اور اس کی مخالفت میں کتنے ہی مرد کھڑے ہوجائیں، اس اکیلی عورت کی ہی گواہی قبول کی جائے گی۔

کیا مسلمانوں کے نزدیک عورت ناقص العقل ہے؟

از:---------------------------

اعتراضات بابت النسا اور ان پر اسلامی تشخص کے ضمن میں مغرب ذدہ اشکالت وارد کرنے کے سلسلے میں یہ امر اکثر جانچا پرکھا گیا ہے کہ مغرب ذدہ افراد مستشرقین کے اتبع میں یا پھر اپنی ذاتی جہالت کے سبب ایک صحیح حدیث کو لے کر یہ اعتراض بڑے شد ومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں ہے کہ اسلام میں عورت کو ناقص العقل و دین سمجھا جاتا ہے۔

پہلے ہم ذیل میں مذکورہ الذکر حدیث اور پھر بعد ازاں اسکیشرح مفسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں حدیث معرتضہ کچھ یوں ہے کہ:
:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

آپ نے فرمایا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدالاضحیٰ یا عیدالفطر میں عیدگاہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ عورتوں کے پاس سے گزرے اور فرمایا : اے عورتوں کی جماعت ! صدقہ کرو ، کیونکہ میں نے جہنم میں زیادہ تر تم ہی کو دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا : یا رسول اللہ ، ایسا کیوں ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو ، باوجود عقل اور دین میں ناقص ہونے کے ، میں نے تم سے زیادہ کسی کو بھی ایک عقلمند اور تجربہ کار آدمی کو دیوانہ بنا دینے والا نہیں دیکھا۔ عورتوں نے عرض کیا : یا رسول اللہ ہمارے دین اور ہماری عقل میں نقصان کیا ہے ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا : کیا عورت کی گواہی ، مرد کی گواہی سے نصف نہیں ہے؟ انہوں نے کہا : جی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا : یہی اس کی عقل کا نقصان ہے۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا : کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت حائضہ ہو تو نہ نماز پڑھ سکتی ہے ، نہ روزہ رکھ سکتی ہے؟ عورتوں نے کہا : ایسا ہی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا : یہی اس کے دین کا نقصان ہے[14]۔

رفع الاشکال:

مجھے یہ محسوس ہونا ہے یہاں اول غلطی جو اس ضمن میں کی جاتی ہے وہ،لغت و ترجمہ کی غلطی و کوتاہی کے سبب پیدا ہوتی ہے:
اس حدیث کو سمجھنے میں بنیادی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اس میں لفظ ناقص سے اردو والا ناقص مراد لے لیا جاتا ہے جس کا مطلب نقص اور عیب دار ہونے کے ہیں. جبکہ درحقیقت یہاں عربی والا ناقص مراد لیا جانا چاہئے جیسا کہ اُس کا مطلب درحقیقت مقدار میں کم ہونا ہوتا ہے ۔ ویسے بھی دو نوں زبانوں میں موجود معترضہ لفظوں کے مطالب میں فرق کیفیت اور کمیت (مقدار) کا واقع ہوا ہے۔

---

[14] صحيح بخاري ، كتاب الحيض ، باب : ترك الحائض الصوم ، حديث : 305

یوں حدیث کے مطابق ناقصات الدین سے مراد یہ ہے کہ عورت کے بعض ایام ایسے آتے ہیں کہ جس میں وہ دین پر عمل نہیں کرسکتی، نماز اور روزے نہیں رکھتی اس طرح اس کے دینی عمل میں کمی رہ جاتی ہے،جیسا کہ سوال و جواب کے ضمن میں عورتیں نبی اکرمﷺ کے اس بیان و اعتراض کو نا تو رد کرتی ہیں بلکہ بحث کے مطابق اصل بات کو پا لیتی ہیں۔

اسی طرح عقل کے ناقص کی وضاحت میں جیسا کہا آپﷺ نے فرمایا تھا کہ :خدا نے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا ہے ۔اس سے بھی کمیت مراد ہے نہ کہ کیفیت... کیونکہ دو آدھے ایک کامل صحیح کے برابر تو ہوسکتے ہیں لیکن دو آدھے عیب دار ایک صحیح کے مساوی نہیں ہوسکتے ہیں۔

مزید یہ جان لینا چاہئے کہ عقل کی دو قسمیں ممکن ہیں:

۱:عقل شرعی۔
۲:عقل عرفی۔

جہاں تک عقل عرفی کا تعلق ہے تو خاکسار کے مطابق عورتوں میں عقل عرفی بہت اعلی درجے کی ہوتی ہے۔ اس بحث میں جس عقل کے ناقص ہونے کا معاملہ زیر بحث آیا ہے اور اصل میں عقلِ شرعی ہے شریعت نے عورتوں کے ناقصات العقل ہونے سے جومراد لی ہے اس سے مراد یہاں عقل شرعی ہے، عقل عرفی عورتوں میں بہت زیادہ ہوتی ہے، خود حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ یہ عورتیں ہوشیار مرد کو بھی بوتل میں اتارنے والی ہوتی ہیں ، گھر میں بھی اس کی حکومت چلتی ہے اور باہر بھی اسکی حکومت چلتی ہے اور دلوں پر اسکی حکومت کا حال ہر عقل مند ،بالغ ،ہوشمند اور حسن بے مثال کی مالک عورت اچھی طرح جانتی ہے،بلکہ ادا ،ناز و انداز سے عام عورت یہ جادو جگاتی رہتی ہے،جبھی عرف عامہ پر استوار عقل یہاں مراد نہیں ہے،حلانکہ خود دنیا،اور مغرب بھی عورت کو عقل و طاقت کے تناظر میں مرد کے برابر نہیں جانتی ہے،جن لوگوں نے اس ضمن میں اسکی مساوات کے لئے کچھ کام کیا ہے یا اسکی مرد سے مساوات کا ڈھنڈھورا پیٹتے ہیں وہ بھی اس کی حقیقت سے واقف ہیں،بس نظری بحث اور موقف کی رو سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں اور دل و نقطہ نظر کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایسی بودی باتیں کرتے ہیں۔

عقل شرعی کی کمی ویسے بھی مردوں کے مابین باہم بھی متغیر ہوتی ہے اور کسی صورت میں بھی مساوی نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ عقل بہت حد تک ،علم،تقوی،سیادت،قابلیت،اہلیت ،صلاحیت،حزم و احتیاط،عدم جذبات،خوف خدا،محنت،لیاقت و ملکہ خداوندی پر استوار ہوتی ہے،اس ضمن میں اتقا،حزم و احتیاط اور مضبوط اعصاب کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔جبھی عورت کی عقل عامہ یا عرفی کے ضمن میں کمزوری ہر ایک پر واضح ہے،جبکہ عقل شرعی میں تو جب ہر عام و خاص مرد بھی یکساں و مساوی نہیں ہوتے ہیں ، بلکہ یہ تو جانی مانی بات ہے کہ دو خاص عالم دین بھی اس ضمن میں یکساں ملکہ،ذکاوت فھم و فراست کے مالک ہو نہیں سکتے تو عورت مرد کی بحث کا کیا فایدہ یہاں بنتا ہے ۔[15]

---

[15] **ڈاکٹر محمد علی جنید۔**

جبکہ عقل عرفی میں بھی عورت کا یہ کمال ملتا ہے کہ نتائج کا نہیں سوچتی ہے، جب کوئی فرد نتیجے پر غور ہی نہیں کرتا ہے تو اسے نقصان بھی لازمی اٹھانا پڑتا ہے، جیسے کوئی عورت یہ کہتی ہے کہ فلاں فلاں موقع آرہا ہے اور اس پر ہمیں اتنا خرچ کرنا ہے، ختنے میں اتنا خرچ کرنا ہے، شادی میں اتنا خرچ کرنا ہے اور منگنی میں اتنا خرچ کرنا ہے، اور فلاں رسم اس طرح ہونی چاہئے، تو وہ بڑے آسانی سے پانی کی طرح شوہر اور باپ کے مال کو انہی آسائیشی چیزوں میں اڑاتی پھرتی ہیں،شادیاں بیاہ میں اسکی دولت کو مہنگے کپڑوں،زیوروں،عیاشی،شو شاہ میں خرچ کرتی رہتی ہیں،یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ مرد اس دولت کو بڑی آسانی سے کما کر لاتا ہے،یہ دولت کہیں پیڑوں پر اگی ملتی ہے، بس سمجھو مرد گھر سے باہر گیا اور دولت و زر توڑ کر لے آیا ،اور پھر مذیٰد دولت ساری زندگی آتی رہیگی ،اس پر یہ طرفہ کہ کمانے والے مردوں میں باہم بڑائی چھوٹای امیری و غریبی کا غرور و تکبر اتنا زیادہ محسوس نہیں ہوتا ہے جتنا انکی بیویوں،بیٹیوں اور دیگر عورتوں میں پایا جاتا ہے، اس معنیٰ میں ان کو ناقصات العقل کہا گیا ہے کیونکہ وہ نتائج و عواقب کی بابت زیادہ سوچتی نہیں ہیں[16]۔

ناقص العقل ،فہم و فراست کی محدود اہلیت کے حامل سیکولر لبرل اور ملحدین اس حدیث کو لے کر مذہبی لوگوں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ عورت کو ناقص العقل سمجھتے ہیں' خود یہ 'ایجوکیٹڈ' سیکولر لبرل عورت کی کتنی قدر کرتی ھے اور انکی محافل میں عورت کو کیسے کیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے اور کیسی نظروں سے دیکھا بلکہ گھورا جاتا ہے یہ کسی سے ڈھکا چھپا امر نہیں ہے ، جبکہ ہزار برائیاں سہی مذہبی رجحان کے حامل لوگوں کے ہاں انکے برخلاف بہت زیادہ عورت کا عزت و وقار اہم جانا جاتا ہے، اسکی وہاں ایک خاص غیرتی اہمیت ہے اسکو وہاں اپنی عزت و وقار کی علامت اور دل کا سکون سمجھا جاتا ہے ، عورت کی نیلامی نہیں کی جاتی ہے، بھرے بازاروں میں نچوا نچوا کے پامال نہیں کیا جاتا ہے، وہاں نوچ نوچ کر کھانے والی نگاہوں کے ساتھ یا پھر کوئی گدھ بن کر شب وروز تاڑا نہیں جاتا ہے۔

روشن خیال لوگوں! تمھارے سیاہ کرتوت کتنےمیں کہاں تک بتا پاؤں گا،قطار در قطار لپکتے چلے آرھے۔میرا قلم حیا سے شرماگیا ہےمگر تم عورت کو ہر طرح عریاں کرنے سے بھی نہیں ھچکچارہے ہو،یہ قلم تمہاری جسدی و فکری عریانیاں کو مزید بیاں کرنے خود قاصر و مجبور محسوس کرکے تمہارے اعمال و افکار کو خداوند بزرف و برتتر کے سپرد کرکے قلم کو مقید کرنے پر مجبور ہے۔

---

[16] ایضاً

مرد ، عورت اور مساوات کی بحث

از :مزمل بسمل

دیکھو دیکھو ذرا کہ :

آج وہ ہم سے پوچھ رہے تھے کہ تم چھوٹی ذہنیت والے کچھ معاملوں میں مرد کو بڑا اور عورت کو چھوٹا کیوں تصور کرتے ہو؟
کیوں تم عورت کو پیچھے اور مرد کو آگے بڑھانا چاہتے ہو؟
کیوں تم انصاف سے کام نہیں لیتے ہو ؟
کیا تم لوگوں کے نزدیک مرد اور عورت دونوں یکساں نوعیت کے حامل انسان نہیں ہیں؟
اگر دونوں انسان ہیں تو پھر اس تفریق کا بلآخر کیا فائدہ ہے؟

ہم نے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ عرض کیا کہ : جناب عورتوں سے نا انصافی کا جتنا درد آپ کے دل میں ہے اس سے کہیں زیادہ میرے دل میں بھی ہے، اس پر گفتگو پھر سہی، لیکن یہاں آپ کی بنیادی دلیل ہی اول غلط ہے،آپکا عورت کو "عین" مرد کے بالمقابل کھڑا کردینا یا ایسا مساواتی مجرد تصور پیش کرنا ہی میرے نزدیک بزاتِ خود ایک انتہا پسندی ہے جو کہ مخالفین کی انتہا پسندی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے -

یہاں بحرحال اعتدال قایم کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے، منطقی بنیادوں پر کچھ معاملات ایسے بھی جہاں میں موجود ہیں کہ جن میں عورت اور مرد برابر نہیں ہوسکتے ہیں ، جس طرح فوج کا سپاہی اور جرنیل. یاسلطنت کا بادشاہ اور رعایا. یا ملک کا وزیر اعظم اور عوام ایک پلڑے میں برابر نہیں ہو سکتے ہیں عین اسی طرح عورت اور مرد کے منصبوں و فرایض میں بھی تھوڑا بہت فرق فطرت نے تخلیق سے قبل ملحوظ نظر رکھا تھا۔

ہمیں اتنا تو خیر معلوم ہے کہ انسان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں کوئی وقت بھی ایسا وقت نہیں گزرا ہے جب عورت مرد پر غالب رہی ہو،یہاں واضح رہے گفتگو جنسی،رومانوی تناظر میں یا عقل شرعی کے تناظر میں نہیں کی جارہی ہے،بکہ عقل سلیم کے تناظر میں تذکرہ چھیڑا جارہا ہے، در اصل یہ تفریق نہیں ہے بلکہ قدرتی امر،جلبت،فطرت و تقدیر ہے کہ ان دونوں میں مزاجی، طبعی اور نفسیاتی طور پر بھی بہت کچھ فرق پائے جاتے ہیں مگر بحرحال اس میں کیا شک ہے کہ انکا اتنا کہنا بھی درست ہے کہ عورت انسان ہی ہے.

لیکن آپ کی یہ دلیل ان دونوں اصناف کو بالکل ایک مقام پر لا کر رکھ دینے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی ہے، اگر آپ انسانیت میں مشترک ہونے کی دلیل کو تھوڑا اور کشادہ کر کے حیوانیات تک لائیے تو آپ کو گائے، بھینس، بھیڑ اور بکروں کو بھی اس میں شامل کرنا پڑے گا. آپ اپنے بقا کے لیے ان سے گوشت حاصل کرتے ہیں جو کہ ان کے ساتھ نا انصافی ہے، حالانکہ حیوانیات کے قبیل میں شمار ہونے میں علم حیات کی رو سے انسان اور جانور سب مشترک شمار کئے جاسکتے ہیں. اسی طرح ایک قدم اور آگے بڑھ کر تمام جانداروں کو اس چادر میں سمیٹ لیجیے تو بقا اور آسائش سمیت زندگی کے تمام ہی پہلو کافی حد تک اس انصاف کے نتیجے میں متاثر ہوتے سکتے ہیں.

.در اصل یہاں انصاف کی بحث ہی کافی حد تک بے کار ہی ہے
یہ دراصل منصب کی بابت گفتگو ہے،یہ عددی کمال اور عدم کمال کا زماں و مکاں میں مقید نادرو نایاب جنسی وصفی مکالمہ ہے اور اتنا تو خیر آپکو بھی اقرار ہوگا ہر جگہ لاکھ ظلم کے باوجود باشعور اذہان کے نزدیک حق دار کو اس کا حق دینا ہی انصاف کہلاتا ہے.

جس طرح تمام جانداروں میں انسان بطور حیوان ایک اعلی منصب کے حامل باشعور قوت تدبر،اختراع،نظم و تخلیق کی حامل مخلوق جانا جاتاہے اسی طرح انسانوں میں جنسی بنیادوں پر ہمیشہ سے مرد کا منصب بڑا تسلیم کیا گیا ہے اور موجودہ ویسٹرن ہیومن رایٹس ڈسکورس سے قبل تمام مرد و عورت اس پر صدیوں سے متفق چلے آرہے ہیں،یہ تو سرمایہ دارانہ،جمہوریت،انسانیت پرستی کی سیکولر لبرل لھر ہے جس نے عورت کی لیبر فورس کے حصول کے لئے اسے کئی سطھوں پر دولت و لذت کے لئے اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ وہ اس سرمایہ دارنہ،ترقی کی ذہنیت کی اسیر ہوکر مقلدانہ دلایل میں وقت ضایع کر رہی ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ خود مردوں میں بھی مساوات باہم عین بلکل ویسے نہیں ملتی ہے جیسے مرد و وعرت میں ملتی ہے ،اور عین اسی طرح عورتوں کے مابین بھی عورتیں خود مساوات عملی کو بروئے کار نہیں لاتی ہیں انکے باہم بھی کئی مدارجی،وصفی،جنسی،معاشرتی ،مذہبی و سیاسی مدارج پائے جاتے ہیں، بلکل سچ تو ہی ہے کہ آپ خود وصفِ مردانگی میں بھی تمام مردوں کو مشترک ایک لکڑی سے نہیں ہانک سکتے تھےاور یہی معاملہ بھی مرد و عورت کے تقابل میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔[17]

.

[17] معج

اسلام مساوات نہیں عدل و انصاف کا دین ہے۔

از: : اسلام کیو اے ڈاٹ کام

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ کچھ کم عقل مغربی و مشرقی مفکرین نے مساوات کی ایک غیر معقول اصطلاح متعارف کروارکھی ہے وہ یہ کہ انسانوں کے درمیان زندگی کے ہر شعبے میں مساوات ہونی چاہیے بلآخر معلوم ہوجاتا ہے کہ کیسے پھر مخالفینِ اسلام نے اس اصول کو لے کر اسلام پر کیسے کیسے نادر روزگار عجوبہ الفطرت اعتراضات وارد کیے ہیں ۔

کیا اس میں کسی شک کا امکان ہے کہ دینِ اسلام کا نظریہ مساوات کا داعی نہیں ہے بلکہ عدل و انصاف کی فکر پر مبنی ہے، اگر عین قطی المعیار مساوات کو نافذ کیا جائے یا اس سے معترضن کی ہی مراد لی جائے تو معاشرے میں بڑی مضحکہ خیز ڈرآمہ بازی رونما ہوجائے جیسے اسی مساوات کا یہ تقاضا بھی ممکن ہے کہ ہر انسان کو ہر جگہ برابر ٹھہرایا جائے ،لٹایا جائے،سلایا جائے،کھلایا جائے،نہلایا جائے،پلایا جائے ،رولایا جائے،مروایا جائے،گروایا جائے،پٹوایا جائے اب کون ایسی مساوات کو معقول جانے گا بلکہ اس مساوات کے مدعی کہینگے ہماری یہ مراد تھوڑی ہے ہم ایسا تھوڑی کہہ رہے تھے،آپ کیا مذاق کر رہے ہیں یا عقل سے پیدل ہیں،بلاشبہ آپ نے بجا فرمایا مگر اس میں بھی کیا شک کہ جب لفظ مساوات میں بلا تحدید حقوق کی بات ہو اور مساوات نجی طور پر بروئے کار نا لائی جائے تو بات کیسے حقوق کی پوری ہوگی؟

بلکہ ان باتوں سے تو الٹی مساوات ایک سماجی،نجی،خاندانی بوجھ بن کر رہ جاتی ہے،آزدی کی حدود اعدادوں میں مقید ہوکر طبیعت پ گراں گزرنے لگینگی،بلکہ ان سب سے اُلٹا یہ مساوات بعض جگہ ظلم بن جاتی ہے ۔ کئی لوگوں نے یہ سایلانہ نعرہ لگایا کہ مرد و عورت کے مابین کونسا فرق ہے ؟ انہوں نے مرد و عورت کو برابر کر دیا ہے، حتی کہ کیمونسٹ تو یہاں تك کہتے ہیں کہ حاکم اور محکوم کے مابین کونسا فرق ہے ؟ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی ایك دوسرے پر تسلط رکھے اور حکمرانی کرے، حتی کہ والد اور بیٹا بھی، والد کو اپنے بیٹے پر بھی تسلط اور طاقت نہیں ہے، اسی طرح آگے بڑھتے ہیں اور سماج کی ہر ترتیب کو درہم برہم کرکے رکھ دیتے ہیں ۔

دوسری طرف عدل کے معنی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر مستحق کو اس کا حق دینا جس کا وہ مستحق ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں کبھی یہ لفظ نہیں آئے کہ اللہ تعالی تمہیں مساوات یعنی برابری کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ:

۱۔

اللہ تعالی تمہیں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے [18]

۲۔

اور جب تم لوگوں میں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو ۔[19]النساء 58

بلکہ الٹا ہم دیکھتے ہیں کہ :قرآن مجید میں اکثر مساوات کی نفی کی گئی ہے جیسے:

۳۔

کہہ دیجئے کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے برابر ہیں ؟[20]

۴۔ کہہ دیجئے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں؟ یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں ؟[21]

۵۔ تم میں سے جس نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا برابر نہیں، یہ ان لوگوں سے زیادہ درجے والے ہیں جنہوں نے اس کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا ۔ [22].

مرد و عورت کا معاملہ بھی یہی ہےکہ اسلام انکے مابین بھی کسی کی قسم کی مساوات نہیں مانتا ہے بلکہ وہ الٹا انکے مابین صرف انصاف کرتا ہے اس جگہ اگر بادی النظر اگر مساوات و برابری کی بات کی جائے تو یہ درحقیقت ان پر ایک طرح سے ظلم ہی ہوگا، کیونکہ اصل میں دونوں کی اپنی اپنی ذمہ داریاں ، کمزوریاں ، صلاحیتیں ہیں انہی کی بناء پر ان میں حقوق و فرائض کی بھی تقسیم کی گئی ہے۔

شریعت کی نظر میں بحثیت انسان اور انکی مزاجی انسانیت اور ،رویوں،مزاجوں کے تناظر کی رو سے کسی حد تک یہ مانا جاسکتا ہے کہ مرد اور عورت میں اتنا فرق نہیں ہےجبھی کچھ امور میں ہم

---

[18] النحل: 91

[19] النساء: 58

[20] الزمر : 9

[21] الرعد : 16

[22] الحدید : 10

دیکھــــــــــــــــــــــــــــــتے ہــــــــــــــــــــــــــــــــیں کــــــــــــــــــــــــــــــہ
اکثر شریعت اسلامیہ کے احکام مرد و عورت پر برابر لاگو ہوتے ، عورت بھی مرد کی طرح ہی وضوء کرتی ہے ،غسل کرتی ہے، مرد کی طرح روزہ رکھتی ہے، زکاۃ ادا کرتی ہے ،حج کرتی ہے ، خرید و فروخت کرتی ہے ، صدقہ کرتی ہے ۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ معاملات فرایض و عبادات سے تعلق رکھتے ہیں ،اور جہاں عدم مساوات پائی جاتی ہے وہ دنیاوی معاملات یا فقہی و شرعی معاملات کی قبیل کے شرعی امور ہوتے ہیں جنکا تعلق شرعی ذمہ داریں کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔

بلکہ سچ یہی ہے کہ جہاں دونوں جنسوں میں فرق روا رکھا گیا ہے ، وہاں اسلام عورت کی فطری صلاحیتوں اور کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے ذمہ داریاں لاگو کرتا ہے ، مثلا مردوں پر اپنے بیوی بچوں کی کفالت کا فرض عاید کیا گیا ہے اسی طرح اس پر صنفی،جنسی اور اسکی ودیعتی فطرت و شجاعت کے لحاظ سے جہاد فرض کی گیا ہے، لیکن عورتوں پر نا کمانے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور نا مسلمانوں کے لیے جہاد و قتال کے لیے نکلنے کی ذمہ داری عاید کی گئی ہے،اب اگر مجبوراً وہ ایسا کرتی ہے یا قلت الرجال میں ایسا ہوجاتا ہے تو مرد کی سعادت کا شرعی حکم منسوخ اور معطل کرکے عورت کو یہ فرایض سونپے نہیں جاسکتے ہیں ،بلکہ حالات و واقعات کی رعایت کے استثنائی اصول و رعایت کی رو سے وہ ذاتی ذمہ داری پر ایسا کرتی ہے،اسکا ایسا کرنا یا مرد کا اسکو یہ ذمہ دینا شرعی نہیں ذاتی موقف و حکم جانا جائیگا۔

بلکہ یہاں مساوات سے الٹا عورت پر ظلم ہوتا ہے،اسکی مصروف گھریلو زندگی پر کئی گنا بھاری بوجھ عاید ہوجاتا ہے،وہ جن بنیاد پر عورت مانی جاتی ہے ،مرد سے الگ جنس جانی جاتی ہے،جن بنیادوں پر مرد اسے چاہتا ہے،اسکے نخرے اٹھاتا ہے، وہ جن وجہوں سے مرد کو لبھاتی،ہے،اسکی آنکھوں کا نور بنتی ہے،اسکے دل کا قرار بنتی ہے،وہ جسکے لئے بنتی سنورتی ہے ،حسن صیقل کرتی ہے جب یہ سب کچھ صنفی،جنسی اور وصفی بنیاد پر ہی نا رہیگاتو سمجھیں فطرت بھی مردہ ہوجائیگی دنیا کی آبادی تو کیا بڑہیگی الٹ بس دنیا ایک چکلہ خانہ،حرب خانہ بن کر رہ جائیگی ۔[23]

---

[23] معج

تحفظِ عورت، خاندان اور مارکیٹ:ایک اھم شبہے کا ازالہ

از:ذاہد صدیق مغل[24]

اس عنوان کی ایک سابقہ تحریر خاکسار کی جانب سے یہ بتایا گیا تھا کہ مارکیٹ کی معاشرت کیسے اور کس طرح سے عورت کی کفالت کا بوجھ اسکے کاندھوں پر ڈال کر الٹا اس پر ظلم کررہی ہے نیز اسے غیر محفوظ کرتی چلہ جارہی ھے۔ اس پر ایک اعتراض یہ وارد کیا جاتا سکتا ہے کہ موجودہ خاندانی نظام کے اندر بھی عورت پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہیں نیز اگر عورت بیوہ یا طلاق یافتہ ہوجائے اور اسکے باپ یا بھائی اسکی کفالت کی ذمہ داری نہ اٹھائیں یا اٹھانے کے لائق نہ ہوں تو اس عورت کیلئے تو مارکیٹ کا حصہ بننا ایک نعمت ھے، گویا مارکیٹ ایسی خواتین کیلئے بہترین متبادل فراہم کررھی ھے۔

مگر اس مقام پر معترضہ اعتراض کا سقم و محدودیت اس امر سے واضح ہوتی ہے کہ صاحب اعتراض نے خاندان کا نقشہ بس 'ماں باپ اور بچوں' تک محدود سمجھ لیا ہے اب یہ تو ظاھر ھے کہ جسے آج ہم خاندان بمعنی 'برادری' یا 'قبیلہ' کہتے ہیں وہ محض ان تین تعلقات کا نام نہیں ہے، بلکہ اس سےبہت وسیع تر معنی و مفہوم کا مالک ھے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ خاندانی نظام اگر وہ واقع کہیں موجود ہو تو وہاں عورت کی قوت اسکی برادری و خاندان جانا جاتا ھے خالی اکیلی عورت ہی مکمل خاندان نہیں ہوتی ہے، لہذا اسے دبوچ کر اس پر ظلم کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو عورت بیوہ ہوجائے یا اسے طلاق ہوجاۓ تو اس کا مداوا بھی یہی نظام کردیتا ھے۔ مثلا ہمارے یہاں آج بھی ہمارے یہاں اس امر کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی بیوہ اور اسکے بچوں کو سہارا دینے کیلئے (اپنی تمام تر خواہشات کی قربانی دے کر) اس سے نکاح کرلیتا ھے۔[25] اگر نکاح ممکن نہ ہو تب بھی دادا یا دیگر بھائی وغیرھم ملکر خاتون خانہ اور اسکے بچوں کی کفالت کرتے رہتے ہیں،اگر آج اس امر میں کوتاہیاں در آئیں ہیں تو وہ بھی دراصل کافی حد تک مغربی ذہنیت اور افکار جدیدہ کے سبب ہے ،جس نے مشرقی اقدار و روایت تک حامل افراد کو متاثر کردیا ہے۔

آج ہمیں اپنے معاشرے اور خاندانوں میں ہر سو پھیلی یہ مثالیں نظر نہیں آتیں ہیں ، ہاں چند ظلم کرنے والے مرد نمایاں طور پر نظر آجاتے ہیں، اسی طرح اگر طلاق ہوجائے تو بھی عورت بے یارومددگار نہیں ہوجاتی ہے (ویسے یہ بھی عجیب ذہنیت ھے کہ جدید ذہن کو طلاق کے بعد ہمیشہ عورت ہی کی فکر دامن گیر رہتی ھے، مرد اپنے بچوں کی پرورش کے حوالے سے جو پریشان ہوتا ھے وہ تو اسکے یہاں کسی کھاتے میں ہی نہیں شمار ہوتا ہے)۔

---

[24] November 21, 2014

[25] **کچھ دور کیوں جائیں زوال سلطنت مغلیہ کے آخری ادوار میں،بدعات کے طوفان بدتمیزی،حقوق النسا کے ضمن میں سید احمد شہیدؒ نے اپنی بھابھی سے ،خاندان و معاشرے کی مخالفت کے باوجود صرف اس لئے نکاح کیا تھا کیونکہ شریعت اسکی اجازت دیتی تھی مگر ہندووں سے اختلاط سے جو شرک،کفر،گمراہیاں اور بدعات مسلمنان ہند میں در آئیں انھی میں نکاحِ بیوہ کو معیوب سمجھنا بھی شامل تھا لہذا آپ نے اپنی اصلاحی تحریک میں اسی ضمن میں کام کیا۔معج**

چنانچہ مسئلہ تب ہی پیدا ہوتا ھے جب فرد کی ان بنیادوں پر تربیت نہ کی جائے یا ممکن نہ رھے جو خاندانی نظام کے کرائسز مینیجمنٹ پروسسز کو اکٹیویٹ کرتی ھے، اور اس تربیت سازی میں بہت بڑی رکاوٹ خود جدید تعلیم وتربیت کی کمی اور مارکیٹ بیسڈ سوسائٹی کا پھیلاؤ ھے، جو فرد کو خود غرضی کی عقلیت و جبر قبول کرنے پر راضی کرتی ھے۔ خواہشات و ذاتی اغراض کا اسیر یہ 'فرد (یا ھیومن بینگ) ناصرف ماں باپ کو ہی گھر سے نکال باہر کرتا ھے، تو اس پر کسی بیوہ یا مطلقہ عورت کا رونا کیا روئیں ہم ۔ گویا خاندان کا تحفظ ختم ہونے سے خالی صرف 'روایتی عورت' (ماں، بہن، بیٹی، بیوی) ہی غیر محفوظ نہیں ہو جاتی ہے بلکہ 'بوڑھے' (ماں باپ) بھی غیر محفوظ ھوجاتے ہیں۔

درحقیقت مارکیٹ یا سول سوسائٹی انفرادیت کے ہر روایتی اظہار یا تعلق کو غیر معقول و لایعنی بنا کر انکے وجود کو 'غیر محفوظ' کردیتی ھے۔ ایسا اس لئے ہوتا کیونکہ ہماری عصری جیدی مارکیٹ یا سول سوسائٹی صرف'مجرد فرد' کی تکمیلِ اغراض کی خاطر وجود میں آنے والے تعلقات کا نظام ھے۔ اس معاشرت میں 'اغراض سے ماوراء' ہر تعلق غیر معتبر ھوجاتا ھے لہذا محبت و صلہ رحمی کی بنیاد پر تشکیل پانے والی اجتماعیتیں (مثلا خاندان و قبائل) تحلیل ھوجاتی ھیں۔

ھیومن رائٹس پر مبنی اس معاشرت میں ہر فرد کا اپنا ذاتی اقداری دایرہ ہوتا ہے اور جہاں اسکی

ذاتی زندگی کے حقوق کا وہ دائرہ جس[26] 'کسی' کی مداخلت جائز نہیں ہے،اور جہاں ہیومن کا تحفظ اور اس کے حقوق میں توسیع ہر دوسری شے سے زیادہ عزیز تر ھوتی ھے، لہذا اس معاشرت میں خاندان لازما تحلیل ھوکر رھتا ھےچنانچہ جس معاشرت میں ھیومن رائٹس کے نام پر بچوں کی شکایت پر ماں باپ کو عدالتوں اور تھانوں میں طلب کیا جارہا ھو بھلا وہاں خاندان کیسے باقی رہ سکتا ھے؟ یہی بلکل این خیال است محال است کا معاملہ ہے، آزادی و اغراض کا فروغ لازما رحمی رشتوں کو مخاصمت میں تبدیل کرکے رکھدیتا ھے۔

لہذا خوب دھیان رھے کہ ہمارا بلخصوص اور یورپ کا بلعموم خاندانی نظام بس یونہی شکست و ریخت کا شکار نہیں ھورھا ہے بلکہ یہ بذات خود ایک مارکیٹ نظم کا نتیجہ ھے، جوں جوں مارکیٹ کا دائرہ پھیلتا جارھا ھے، ویسے ویسے روایتی معاشرت کی شکست و ریخت کا عمل تیز تر ھوتا جارھا ھے نتیجتاً ہر روایتی تعلق (بشمول 'روایتی عورت') روایتی تحفظات سے محروم ھوکر غیر محفوظ ھونے لگتا ھے اور اسے اپنی آخری پناہ گاہ بادل ناخواستہ مارکیٹ میں تلاش کرنا پڑتی ھے۔ درحقیقت مارکیٹ کسی دوسرے نظام کے ستائے ھوئے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ خود اپنے پیدا کردہ ظلم کے مارے چند لوگوں کو بھی اپنے اندر سمولیتی ھے اور بڑی اکثریت کو این جی اوز، پروفیشنل خیراتی اداروں اور سرمایہ دارانہ ریاست کے تھپیڑوں کے حوالے کردیتی ھے۔

اور پھر ذرا تصور کیجئے ان عورتوں کے بارے میں بھی جو یا تو سرے سےکمانے کے لائق نہیں ہے یا پھر بہت کم کماتی ہیں آخرکار یہ موجودہ مارکیٹ نظام انکے ساتھ کر کیا رھا ھے؟ ھوسکتا ھے آپ کہیں کہ وہ اپنی انشورنش کروائیں، مگر اسکے لئے تو رقم چاہئے ہوتی ہے جو کمائے بغیر ممکن نہیں ہوتی ہے، ھوسکتا ھے آپ کے ذہن میں یہ خیال مچل رھا ھو کہ انکی کفالت ریاست کرے

[26] Area of non-encroachable'

گی مگر اس دنیا کی کتنی ریاستیں ہیں جنکے پاس اتنے وسائل ہیں کہ وہ اپنی ساری محروم آبادی کیلئے آمدن کا بندوبست کردے؟ تو سوال یہ ھے کہ یہ جو اتنی کثیر تعداد میں خواتین بے یارومددگار گھوم رہی ہیں ان کیلئے اس نظام میں کیا ھے؟

تو یہاں کوئی جدید ذہن کیوں یہ سوال نہیں پوچھ رہا کہ 'اے ظالمو جب تمہارے پاس ان خواتین کے بندوبست کا کوئی نظام موجود ہی نہیں تھا تو کیسے تم نے خاندان کو تحلیل کرکے مارکیٹ نظم قائم کرلیا؟' کیا یہ جدید ذھن کا کھلا تضاد نہیں ہے کہ دینی طبقے سے تو دین پر عمل پیرا ہونے کیلئے پہلے 'ہر مسئلے کا پکا پکایا متبادل' فراہم کرنے کی شرط لگادیتے ھو مگر خود اپنے نظام سقم پر عین یہی سوال نہیں اٹھاتے ہو؟

تو موجودہ مارکیٹی عصریت جو بحرانوں کا شکار چند عورتوں کو سپورٹ کررھی ھے وہ بس یونہی نہیں کررہی ہے، بلکہ معاشرے سے اسکی پوری قیمت وصول کررہی ھے۔

پس خاندان کا کام آج صرف کسی فرد کو مارکیٹ میں ضم کردینا نہیں ہے (کہ یہ تو اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ھے) بلکہ مرد کی 'درست تربیت' پر توجہ دینا بھی ھے تاکہ وہ اپنی 'ذمہ داری' کو پہچانیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، اس مارکیٹ نظم کو تحلیل کرنا اس تربیت سازی سے بھی زیادہ ضروری عمل ھے کہ جسکے بنا یہ تربیت کبھی بھی عام نہ ہوسکے گی۔

تحفظِ النسا، خاندان اور مارکیٹ : حقیقت اور افسانہ

از:ذاہد صدیق مغل[27]

ذرا تصور کریں اس عورت کے بارے میں جسکا خاوند، باپ، بھائی یا بیٹا (یا کوئی دوسرا قریبی رشتہ دار) اسکی معاشی کفالت کا پورا ذمہ اٹھائے ہوئے ہے، بلکہ گھر سے باہر آتے جاتے وقت اسکے تحفظ کی خاطر اسکے ساتھ ہونے کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، اسکی ضرورت کی ہر شے اسے گھر کی دہلیز پر مہیا کرتا ہے، اپنی عمر بھر کی کمائی ہنسی خوشی تک اس پر خرچ کردیتا ہے، اسے اچھا کھلاتا اور پہناتا ہے، اسکی عزت کی حفاظت کیلئے اپنی جان تک قربان کردینے کیلئے تیار رہتا ہے، اور 'بالآخر' (بادل ناخواستہ ہی صحیح) گھر کے معاملات بھی اسی عورت کی جھولی میں ڈال دیتا ہے (یہ تصور کہ ہمارے معاشرے میں خاندانی نظام کی عورت کے پاس فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ایک افسانہ ہے، خاندانی نظم کے اندر بچوں کی عمر ذرا زیادہ ہونے کے بعد عورت بالعموم کس قدر بااختیار ہوجاتی ہے اسکا اندازہ ہر شوہر کو ہوتا ہے)۔

ہم نے مذکورہ بالا سطور میں جس عورت کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے وہ کوئی تخیلاتی عورت نہیں ہے ۔ بلکہ ہمارے معاشرے میں آج بھی خواتین کی غالب ترین اکثریت کم و بیش اسی قسم کی زندگی گزار رہی ہے (کچھ اس خاندانی نظام کی شکست و ریخت اور کچھ مارکیٹ نظم کا حصہ بن جانے کی وجہ سے مظالم کا شکار ہیں، ان مظالم کا تعلق ہرگز خاندانی نظام کے ڈھانچے سے نہیں ہےجیسا کہ ہمارا لبرل طبقہ جھانسا دینے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اس صورت میں یہ غالب ترین اکثریت بھی ان مظالم سے محفوظ نہ ہوتی ہے)۔

اب اسکا موازنہ کریں اُس عورت کی زندگی سے جو اپنی معاشی کفالت کی خود ذمہ دار ہے، گھر اور بچوں کی ذمہ داری بھی اسی کے کاندھوں پر آگئی ہے، صبح ناشتہ بھی بناتی ہے، بچوں کو تیار بھی کرتی ہے، انکے لنچ کا بندوبست بھی کرتی ہے، آفس کے جبر کو بھی برداشت کرتی ہے، باس کی باتیں بھی سنتی ہے، شام کو سب کیلئے کھانا بھی بناتی ہے، لانڈری بھی کرتی ہے۔ اگر قسمت نے یارانہ کیا تو شاید عمر بھر ساتھ نبھانے والا کوئی شوہر ہاتھ آجائے وگرنہ یہ سارا بوجھ اکیلے ہی اٹھائے پھرے گی۔ یہ نقشہ ہے جدید و ترقی یافتہ معاشروں کی غالب ترین خواتین کی زندگیوں کا۔ اس قسم کی عورت کو اپنے تحفظ و بقا کیلئے ان پروسزز ، اشیاء و خدمات کی ضرورت ہے جنہیں مارکیٹ سے 'خریدنا' پڑتا ہے، لہذا یہ عورت اس نظام کے تحت مجبور ہے کہ اپنی قوت خرید کو برقرار رکھنے کیلئے مارکیٹ کا حصہ بنی رہے،چناچہ حقیقیت یہ ہی ہے کہ اس نظام کا عورت پر

[27] November 21, 2014-

بڑا جبر ھے،مگر جسے نظریہ سازی اور جدیدیت سازی کے فکری دھندوں نے اس سوچنے سے روک دیا ہے۔

نفس معاملہ یہ ھے کہ ہیومن رائٹس اور اسپر مبنی مارکیٹ اور جمہوری نظم معاشرے اس عورت کی ذمہ داری کی قدر کو یا عورت کی کفالت کی ذمہ اکائی مانکر اسکی فردیت[28] تک محدود کرکے الٹا عورت کی کاندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔

یہ انسانی تاریخ میں عورت پر ہونے والے بدترین مظالم میں سے عظیم تر ظلم ھے، ***اول*** اس لئے کہ یہ اس جنس پر ایک ایسا بوجھ ڈال دیتا ھے جو اسکی تخلیق کے مقصد ہی کے خلاف ھے۔***دوئم*** اس لئے کہ جدید نظام اس ظلم و شر کو عدل و خیر کے پردوں میں چھپا کر انسانوں کیلئے قابل قبول بناتا ھے (اس اعتبار سے یہ عورت کی بلا وجہ مار پیٹ کرنے سے بھی بڑا ظلم ھے کہ اس عمل کو ہر معاشرت و نظرئیے نے بہرحال برا ہی سمجھا ہے مگر عورتوں میں پروفیشنل ازم کے فروغ کے ذریعے انکی مارکیٹائزیشن کے عمل کو آزادی و خودمختاری کے خوشنما نعروں میں پیش کیا جارہا ھے)۔

آج کے مارکیٹ نظم میں عورت اور مرد صرف فردِ ذاتی ہیں، یہاں دونوں اپنے تحفظ کیلئے غیر کے محتاج ہیں، جہاں ریاست کی پہنچ نہیں ہے ،ظاہر ھےکہ ریاستی پہنچ ہر جگہ موجود نہیں ہوسکتی ،ہے وہاں طاقتور 'اکیلا' کمزور 'اکیلے' کو دبوچ لیتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ ایسی جگہوں پر کافی حد تک مارکیٹ نظم کے پھیلنے کے نتیجے میں ریپ[29] مواقع بہت بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وقوع پذیر ہوتے ہیں جبکہ ،روایتی برادری کے نظم میں عورت کے تحفظ کا دائرہ محرم ،اور بعض اوقات خاندان سے متعلقہ چند قریبی اور قابل اعتماد غیر محرم رشتہ داروں کے گرد بنایا جاتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ روایتی معاشرت میں ریپ کی وارداتیں انتہائی شاذونادر ہوتی ہیں کیونکہ ایک فرد (یا چند افراد) کے ہاتھ یہ موقع آجانا ہی خاصا مشکل امر ہوتا ھے کہ وہ ایک اکیلی عورت کو اس حالت میں کہیں پالے کہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکے اور کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے۔

ان دونوں میں سے کونسی عورت زیادہ محفوظ و آسودہ زندگی گزار رھی ھے؟ آخر ان دونوں کے حال میں اس قدر فرق کیوں ھے؟ اسکی بنیادی وجہ یہ ھے کہ ایک عورت تو وہ ہے جو اس نظم کا حصہ ھے جہاں وہ خدا کی بتائی ہوئی فطری طرز معاشرت میں وہ پنی زندگی بسر کررھی ہوتی ھے، یہ وہ معاشرت ہے جو محبت و صلہ رحمی کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ھے۔ جبکہ اسکے برخلاف ہماری دوسری عورت کی فردیت و شخصیت تسکین لذات و بڑھوتری سرمایہ کی خاطر اغراض کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے جو اسے غیر مقامی ،بیرونی و خارجی مغربی معاشرت کا ایک اہم کماو پوت پرزہ بنا دی دیتی ھے اور جس سے باہر نکلنے کی کوئی راہ یہ نظام اسے فراہم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا ہے ،بلکہ الٹا کوشش میں ہے کل اول قسم کی عورت کی خاندانی شخصیت،عصمت، و عفت کی اقدار کو بھی پامال کرکے اسے دوسرے عورت کی صفوں میں شامل کروادے ۔

---

[28] **Individuality**.

[29] **rape**-

کچھ ‘دانشوروں’ اور ‘سکالرز’ کا خیال یہ ھے کہ

چونکہ جدید، عصری،معتدل روشن خیال اقدار اول عورت کی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں اسی لئے پہلی عورت محفوظ ھے جبکہ دوسری قسم کی نسائی شخصیت انکے نزدیک انکے اقدار کے منافی ہے اس سبب وہ غیر محفوظ ہے ۔

ان جدید الخیال لوگون کی فکر میں ایک تضاد ،عملی جرات کا فقدان اشد سطح پر پایا جاتا ہے،انکے تجزئیے انہیں موجودہ نظام کے خلاف کھل کر جہاد کرنے سے روکتے ہیں کہ انکے نزدیک یہ نظام چونکہ کلی طور پر مذہبی نظام و فکر کے برخلاف فتنہ، ظلم و فساد فی الارض کا باعث نہیں بن رہا ہے،جبھی یہاں اپنی اقدار کو آہستہ آہستہ ذہن سازی کرکے رواج دیا جائے جبکہ حقیقت یہ ھے کہ کل انسانی تاریخ میں تہذیب کا ایسا اجاڑ آج تک کسی معاشرتی و ریاستی نظم نے اس منظم طور پر نہیں کیا ھوگا جتنا اس نام نہاد ترقی یافتہ جدید تہذیب نے کیا ھے۔

آخر اسکی وجہ کیا ھے کہ جدید انسان بہر حال اس محفوظ عورت کو غیرمحفوظ بنانے کیلئے اسے مارکیٹ کے مظالم و جبر کا شکار کرنا چاھتا اور ایسا کرنے کو عقل کا تقاضا بھی سمجھتا ھے (جیسے اس نے مرد کو اس ظلم و جبر کا شکار کرڈالا ھے)؟ اسکی وجہ یہ ھے کہ جدید انسان آزادی یعنی جس سے مراد خالصتاً بڑھوتری سرمایہ ہے ہی کو مقصود بالذات گردانتا ھے اور اس کائنات کی ہر شے (بشمول انسان) بھی اس کے نزدیک اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ھے، لہذا عورت بھی اس اصول سے مستثنی قرار نہیں دی جاسکتی ہے،اصل میں مادی روحانیت کی رو سے عمل تکاثر میں مہمیز اضافے کی خواہش ہی اسکی قلب کی اصل کثافت و ماہیت گردانی جاسکتی ھے۔

تعدد ازواج پر ایک جدیدیت زدہ کا اعتراض

از:زاہد صدیق مغل[30]

کچھ عرصہ قبل ماضی میں ایک جدیدیت زدہ صاحب ہم سے کہنے لگے کہ ”تعدد ازواج کی بات کرنے والے روایت پسند مذہبی لوگ عورت کے جذبات کی قدر ہی نہیں کرتے ہیں کیونکہ عورت انکے نزدیک انسان ہی نہیں ہے، بلکہ مرد کے استعمال کی ایک چیز ھے۔ یہی وجہ ھے کہ یہ لوگ دوسری شادی کرنے کی وجہ سے پہلی بیوی کو پہنچنے والی رنجش کو کسی کھاتے میں نہیں لاتے ہیں “۔

اس ناچیز نے ان سے عرض کیا کہ بھائی جان! نہ صرف یہ کہ شریعت میں بلکہ دنیا کے کسی بھی معاشرے میں کسی عمل کے جائز یا ناجائز ہونے کی یہ کوئی حتمی بنیاد نہیں ہوتی کہ اسکے نتیجے میں کسی بھی شخص کو امکانی طور پر کسی قسم کی رنجش یا دکھ تو نہیں پہنچے گا۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو نکاح کے بعد لڑکی کی لڑکے کے ساتھ رخصتی بلکہ نکاح ہی کے عمل پر پابندی لگادینی چاھئے۔ آخر دنیا میں وہ کونسے ماں باپ ہیں جنہیں اپنی نازونعم میں پلی بیٹی کسی کے حوالے کرتے رنجش نہیں ہوتی ہے ؟ اور دنیا کی وہ کونسی لڑکی ھے جسے اپنا گھر چھوڑ کر پرائے گھر جاتے رنجش نہیں ہوتی ہے ؟ اور لڑکے کی ماں، جس نے اپنے لاڈلے کو پال پوس کر بڑا کیا ہوتا ھے، کیا اسے اپنا بیٹا کسی کے ساتھ شئیر کرتے کوئی رنجش نہیں ہوتی ہوگی ؟ تو اس سارے عمل کا مطلب کیا یہ سمجھا جائے کہ لوگ شادی کے عمل سے 'رنجور' ان لوگوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے ہیں نیز یہ انہیں خواھشات پورا کرنے کا آلہ سمجھ رھے ہیں؟

اسکول، کالج و یونیورسٹیوں میں کتنے ہی طلبا ہر سال فیل ہوجاتے ہیں، تو کیا انہیں کوئی رنجش نہیں ہوتی ہے ؟ کیا نوکری کے انٹرویو کے بعد نوکری نہ ملنے والے امیدوار کو کوئی رنجش نہیں ھورہی ہوتی ہے ؟ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ اساتذہ فیل ہونے والے طلبا کو انسان نہیں سمجھتے ہیں نیز انٹرویو کرنے والی کمپنیاں رد کئے جانے والے امیدواروں کو کیا سرے سے انسان نہیں سمجھتیں ہیں ؟ کیا لوگوں کی رنجش کی وجہ سے اس سارے عمل کو روک دیا جائے؟

یہ نت نئی اور مہنگی قسم کی گاڑیاں جو ہر طرف رواں دواں ہیں کیا امیروں کو انہیں استعمال کرتا دیکھ کر غرباء کو رنجش نہیں ہوتی ہوگی ؟ یہ مہنگے کھانوں کے ریسٹورانٹس اور عالی شان گھر کیا کسی کے ارمانوں کا خون نہیں کرتے ہیں؟ تو کیا مطلب، یہ گاڑیاں چلانے والے اور ان ریسٹورانٹس میں کھانے والے لوگ ان غریبوں کو انسان نہیں سمجھتے ہیں ؟ کیا کسی علاقے میں گاڑیوں کی تیز رفتار آمد ورفت کو ممکن بنانے کیلئے ایک ہائی وے بن جانے سے پیدل چلنے

[30] November 13, 2014

والوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے کیونکہ انہیں اب بلا وجہ پیدل پل پر چڑھ کر سڑک کراس کرنی پڑتی ھے، ذرا سوچتے جائیے، یہ عمل کہاں تک جاسکتا ھے۔

الغرض کسی عمل کے جائز یا ناجائز ہونے کی یہ سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ اس سے امکانی طور پر کسی کو رنجش ھوسکتی ھے،یا رنجش نہیں ہوسکتی ہے، اگر یہ اصول مان لیا گیا تو زندگی گزارنا محال ھوجائے گی اور الٹا حریت پسند طبیعتوں کو بھی عذاب لگنے لگے گی اور وہ عنقریب اس کے مخالف بنکر میدان میں اتر آئینگے ،جیسے اس قسم کے سوالات پیدا کرنے آپ اتر آئے ہیں ،پھربھی ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ دوسری شادی کو شرعی طور پر جایز جانکر اسکی حمایت کرنے والوں کی ذرا تحقیق کرکے دیکھ لیں ؟خود انھونے کتنی دوسری شادیاں کی ہوئی ہیں۔

حقیقیت یہی ہے کہ انھونے ۹۹۔۹فیصد دوسری شادیاں کی ہی نہیں ہوتی ہیں اور ان لوگوں میں سے ایک عظیم اکثریت نا ہی مذہبی رجحانات کی حامل ہوتی ہے، ہم جانچتے ہیں کہ لوگوں !ایمان و عمل کا بڑا گھرا تعلق ہوتا ہے،مگر ہم کسی ایمانی شہ پر عقیدہ رکھتے اس فرد کو جو اس پر عامل نا ہو کافر نہیں کہتے ہیں کیونکہ اسکے اعتقاد کی رو سے وہ شہ شرعاً فرض یا سنت کے قبیل سے تعلق رکھتی ہے یہ اسکی ذاتی کوتاہی،کمزوری ایمان ہے کہ وہ عمل سرانجام نہیں دیتا ہے،وہ نماز،نہیں پڑھتا ہے،مگر ایمان اس پر ضرور رکھتا ہے،روزہ نہیں رکھتا ہے مگر ایمان اس پر لازم رکھتا ہے،جہاد نہیں کرتا ہے مگر حمایت اسکی زور شور سے کرتا ہے بھلے اسکی کمیت و کیفیت میں کچھ وہ تفریق کرتا ہو مگر نفس مضمون کا منکر نہیں ہوتا ہے،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسکا ایک رب ہے، اور چونکہ وہ ایک مسلمان ہے ،اس سے کچھ گناہ اور کوتاہیاں سرسز ہوئی ہیں اور یہ ایمان و اعتقاد کچھ سزا کے بعد اسے کہیں نا کہیں عذاب الہی سے بچا لیں گے یا وہ کسی حد تک یہ سوچتا ہے کہ جلد وہ توبہ کرکے وہ نیکی کرنے لگے گا،اب اسکے برخلاف اس فرد کو دیکھیں جو الٹا اس اعتقادوو ایمان پر ہی سوال اٹھادیتا ہو ،اور اسے ظالمانہ جاننے لگے اسکے باوجود اسکا اصرار ہے کہ وہ مسلمان ہے،اسے مسلم ملت سے منسوب حقوق دئے جائین تو اسے جناب منافقت کہیں گے[31]۔

-

اصل بات یہ ھے کہ انسانی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں، ان میں سے بعض بعض پر فوقیت رکھتے ہیں۔ بسا اوقات کسی اھم تر مقصد کو حاصل کرنے کیلئے کسی کم اھم شے کو قربان کرنا ہی پڑتا ھے۔ یہی معاملہ تعدادِ ازواج کا بھی ھے۔ چنانچہ شرع نے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت اس مفروضے پر نہیں دی کہ اس سے پہلی بیوی یا کسی اور کو کسی قسم کی رنجش کا امکان ھے ہی نہیں بلکہ اس بنیاد پر دی ھے کہ دیگر بہت سے معاشرتی مسائل کا حل اس رنجش سے زیادہ لائق التفات ھے۔

[31] معج

شادیاں حرام اور زنا حلال

از:------------------------

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ہمارے معاشرے میں شادی کے معاملےمیں یہ بات رواج پکڑ گئی ہے کہ لوگ ہندوؤں کی طرح دوسری شادی کو ناجائز سمجھنے لگے ہیں، دوسری شادی کے خلاف عجیب و غریب تاویلات گھڑی جاتی ہیں۔

پھر اکثر و بیشتر

ایک یہ دلیل بھی عام سننے کو ملتی ہے کہ بھئی دونوں بیویوں میں انصاف نہیں کرسکتے ہیں ، قطعی و کامل انصاف تو کوئی اپنی اولاد میں بھی یکساں و مساوی نہیں کرسکتا ہے،ملازمیں میں نہیں کرسکتا ہے،دوستوں،رشتہ داروں اور اہل محلہ تک میں نہیں کرسکتا ہے،تو اسکا متلاشی بننے کا عذاب کیوں سہا جائے۔

باقی وہ صاحب دوسرے معاملات میں چاہے جتنا چاہیں اپنی مرضی سے کرپٹ ہوں، صرف اس معاملہ میں انصاف ہڈی بن کر انکے گلے میں اٹک جاتا ہے، ٹرینڈ ایسا چل پڑا ہے کہ جو بندہ اپنے معاملات میں عادل ہوتا ہے اسکو بھی روک لیا جاتا ہے کہ جی معاملہ بہت سخت ہے ایک پر ہی گزارہ کرو چاہے وہ عورت ایک بانجھ عورت یا ایک بے وفا عورت ہی کیوں نہ ہو یا چاہے اسے جنسی رغبتوں ،احتیاجات و ضروریات کے لحاظ سے گندی عورتوں میں ہی منہ کیوں نہ مارنا پڑجایے۔ زنا کرنا ہزار گرل فرینڈیں پالنا،کئی سو فیس بک لڑکیوں کو ایڈ کرنا اسکے نزدیک ٹھیک ہو،کل ایک پرسوں دوسری کے بغل میں بیٹھنا جایز جانتا ہو مگر دوسری شادی کرنا ٹھیک نہیں ہے،کیونکہ وہ کسی دوسری بیوی کا مذید و مستقل خرچ اٹھا نہیں سکتا ہے،ذمہ داری اسے پہلی کی ہی بھاری پڑ رہی ہے،یعنی وہ معاشرتی جایز ذمہ دارنہ تعلقات کو قایم رکھنے کے انصاف کی فکر کو بھی اہمیت نہیں دیتا دھوکہ بازی کے ناجایز رشتوں کی حمایت پر جان لڑا دیتا ہے،دراصل یہ ایک نئی جدید بدعت ہے جو ہماری منافقانہ معاشرت میں عود آئی ہے۔[32]

ایک شادی پر اکتفا کرنے والے لوگوں کی تعریف بھی کی جاتی ہے کہ دیکھو جی فلاں مرد کتنا اچھا ہے اس نے ایک بیمار عورت کیساتھ ساری زندگی گزار دی، فلاں شخص کو دیکھو اس نے کتنی قربانی دی ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد صرف بچوں کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی نہیں کی

---

[32] معج

ہے، ہماری کل جدید عصری سوسائیٹی کسی مرد کی خواہش و خوشی کی جگہ عورت کی خواہش و رضا کی حمایت میں ایک ایک غیر منطقی طوفان بدتمیزی مچا کر رکھ دیتی ہے۔[33]

یہ رویہ تو خیر ان لوگوں کا ہے جو دوسری شادی کی جائز وجہ موجود ہونے کے باوجود مثلا بیوی کے بانجھ ہونے، فوت ہوجانے، کسی بیماری میں مبتلا ہو جانے کے باوجود شادی نہیں کرتے ہیں، جبکہ اسوقت معاشرے میں ضرورت اسکی ہے کہ ہر وسعت رکھنے والے شخص کو دوسری شادی کرنی چاہیے۔

میرے خیال میں کافی حد تک اس وقت دنیا میں عورتوں کی تعداد ہر جگہ مردوں سے ذیادہ ہی ہے ، ہر گھر میں اوسطا دو تین لڑکیاں پائی جاتی ہیں ، لڑکے ہر جگہ نسبتاً کم ہی ملتی ہیں، دوسری طرف ایک کارنامہ ہمارے میڈیا نے بھی سرانجام ہے کہ شہوانی جذبات کو ایک انتہائی لیول تک بڑھا دیا ہے، لڑکے لڑکیاں شروع بلوغت میں ہی خواہش پوری کرنے کے راستے ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں۔

اس ساری صورتحال کو دیکھتے ہوئے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہمیں اپنی موجودہ جدید نسل کو گندگی کی طرف جانے سے بچانے کے لیے شادیوں کو آسان بنایا جانا چاہئےتھا اور ایک سے زائد شادی کو رواج دینا تھا اور اسکو سراہا جانا چاہئے تھا ، لیکن یہاں اس کے بالکل الٹ کیا جارہا ہے معاشرے میں ناصرف شادیوں کو انتہائی مشکل ومہنگا کردیا گیا ہے بلکہ دوسری شادی پر بھی پابندی لگادی گئی ہے۔

مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ مذہبی گھرانوں میں بھی ایک شادی پر اکتفا کو عقیدے کا درجہ دے دیا گیا ہے ، پہلے انکے ہاں بچیوں کی جدید تعلیم پر پابندی عاید تھی اب یہی والدین اپنی بچیوں کو دنیاوی تعلیم صرف اس دلیل کے سہارے دینے لگ گئے ہیں کہ طلاق ہوجانے کی صورت میں چھوٹی موٹی نوکری کرکے اپنا گزر بسر خود کرسکے گی ، کسی کی محتاج تو نہیں ہوگی۔ مطلب طلاق ہوجانے کی صورت میں دوسری شادی کی سوچ رکھنی بھی گوارا نہیں کی جارہی۔

ایک اور بات جو ہمیں جابجا عام دیکھنے کو ملتی ہے کہ لوگ اپنے بیٹوں کی شادیاں اس وجہ سے لیٹ کرتے ہیں کہ انکی بہنوں کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہوتی، چاہے لڑکا بوڑھا ہورہا ہو یا زنا کی طرف مائل ہورہا ہو اس بات کو عیب سمجھا جاتا ہے کہ کسی کی بہنیں موجود ہوں اور وہ اپنی شادی کی بات بہی کرے۔ اس طرح شادی کے قابل لڑکوں کو شادی سے روک کر مردوں کی تعداد کو مزید کم کردیا جاتا ہے، اسکی ایک مثال دیتا ہوں ، ایک بستی میں جتنے گھر ہیں ان سب گھروں میں جوان لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں، اب ہر گھر یہی سوچ رہا ہے کہ پہلے لڑکی کی شادی ہوجائے پھر لڑکے کی کریں گے، آپ بتائیں کیا وہاں کسی لڑکی کی شادی ہوسکے گی۔

---

[33] ایضاً

آزادی نسواں کا فریب

از:-------------------------

ہمیں زیادہ دور نہیں جان پڑتا جب ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں عورت پوری دنیا بلعموم میں اور عرب معاشرہ میں بلخصوص کس آزمائش سے گزر رہی تھی، بر صغیر ہند میں عورتوں کی کیا حالت تھی؟، مذہب عیسائیت میں عورت کے حقوق کیا تھے ، یہودیت میں عورت کا کیا حال تھا اس کی تفصیل نیٹ پر اور کتابوں میں موجود پائی جاتی ہے، اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے آکر عورت کو بے وقعتی،ناقدری، زبوں حالی ،کسمپرسی ، ذلت اور رسوائی کی پستیوں سے اٹھایا اور وہ عزت و تکریم اور مقام و مرتبہ دیا جس کی مثال نہ کسی اور مذہب میں اور نہ ہی کسی قانون میں مل سکتی ہے -

اس موضوع پر پوری ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے، ہم فی الحال یہاں اسکا تذکرہ نہیں کرتے ہیں ، بلکہ اسکی چند مثالیں پیش کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو جو آزادی عطا کی اس سے انہوں نے کیسے فائدہ اٹھایا؟:
اسلام کے زیر سایہ اور ‘حیاء اور پردے کے ساتھ’ صنف نازک نے ہر وہ کارنامہ انجام دیا جو صرف اسی کا حصہ تھا۔ اسلام نے عورت کو میدان جہاد میں تلوار چلانے سے منع کیا ہے نہ[34] مسجد میں جانے سے، غزوہ احد میں ام عمارہ رضی اللہ عنہا کے ابن قمئہ پر تلوار سے وار کا کون انکار کرسکتا ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید کرنے کی خبر اڑا دی تھی اور مسجد نبوی میں انصار و مہاجر عورتوں کی حاضری ناقابل تردید حقیقت ہے۔[35]

خنساء رضی اللہ عنہا اور جہاں گیر کی بہن زیب النساء کی شاعری کی داد نہ دینے والا آپ بے بہرہ ہے۔

---

[34] صحیح آثار سے معلوم پڑتا ہے کہ ایسے واقعات و دلایل اسلامی جہاد،ریاست مدینہ کے قیام کے اولین ادوار سے تعلق رکھتے ہیں،پھر ان میں سے اکثر آثار کی اسناد بھی محل نظر ہیں،بقیہ بڑی تعداد کے واقعات پانچ ہجری قبل آیت پردہ کے نزول سے قبل کے واقعات ہیں۔پھر ایک اور کلیہ اس ضمن میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر مسلمان مرد کم ہوں اور جہاد میں مشغول ہوں،اور دیگر متعلقہ فرایض سرانجام دینے والے نا ہون تو عورت پردے کے ساتھ طوعاً و کراہاً اس قسم کی سرگرمیاں سرانجام دے سکتی ہیں۔مگر اسے ہمیشہ رخصت پر ہی محمول کیا جانا چاہئے نا کہ کوئی مستقل حکم و آزادی تصور کرنا چاہئے۔معج

[35] اس دلیل کا تعلق الگ الگ امور سے ہے اول یہ کہ یہ خواتین دوران نماز شریک ہوتی تھیں اور سب سے آخری صف میں ہواکرتی تھیں یہ جماعت کے اختتام پذیر ہوتے ہی اپنی صف چھوڑ دیا کرتی تھیں،دویم اب ان خواتین اور نبی اکرمﷺ کی ملاقات یا تو کھلے مجمعوں میں جیسے،عیدین کے خطبات،حج اور عمرے کے اجتماعات میں ہواکرتی تھی،یا کسی حادثہ اور موقع پر،ایک اور طریقہ ملاقات کا انکا کسی ازواج المطہرات کے حجرے میں آنا تھا جس دن نبی اکرمﷺ کی وہاں باری ہوا کرتی تھی ،یا پھر کسی باقاعدہ کسی شرعی فیصلے کے قضا و افتا کے ضمن میں سامنہ ہوتا تھا۔جبھی اسے کوئی بلا تحدید آازدی کے ضمن میں دلیل نا مانا جائے۔معج

اندلس کی مشہور محدثہ ام سعد علم حدیث میں با کمال تھیں، قرطبہ کی لبانہ علم حساب وہندسہ کی بڑی ماہر تھیں، الجبرا اور مساحت و پیمائش کے نہایت پیچیدہ مسائل وہ چٹکیوں میں حل کر دیتی تھیں۔

ایمرجنسی اور انتہائی نا گزیر حالت میں عورت کسی بھی معاملہ کی قیادت کرسکتی ہے، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی جنگ جمل میں فوج کی قیادت تاریخ اسلام کا ایک اہم روشن باب ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے دوڑ کے مقابلہ کا واقعہ تو ایک کھلی مستند روایت سے ثابت ہے۔
سردار دو جہاں محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح حدیبیہ کے موقع پر ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی رائے کو قبول کر کے اس پر عمل کرنا، عورتوں کی عزت و تکریم کا زریں باب ہے، غرض کہ کون سے شعبہ ہائے حیات ہیں کہ اسلام نے عورت کو ان کے اپنے دائرے میں رہ کر کار ہائے نمایاں انجام دینے کی اجازت نہیں دی ہے۔

ہمیں یہ جانکر کر افسوس ہوتا ہے کہ آج کی نام نہاد روشن اور ماڈرن جاہلیت میں عورتوں کو آزادی کے نام سے دوبارہ اسی ظلم ، بے وقعتی، بے قدری، ذلت اور رسوائی کی طرف دھکیل دیا گیا ہے۔دور حاضر میں یورپ و امریکہ اور دوسرے صنعتی ممالک میں عورت ایک ایسی گری پڑی مخلوق ہے جو صرف اور صرف تجارتی اشیاء کی خرید و فروخت کے لیے استعمال ہوتی ہے ، وہ اشتہاری کمپنیوں کا جز ء لا ینفک ہے ، بلکہ حالت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اس کے کپڑے تک اتروا دیئے گئے ہیں اوراس کے جسم کو تجارتی اشیاء کے لیے جائز کر لیا گیا ہے،اور ریپ جو ان اشتہار بازی کے نتیجے سے نمودار ہوتا ہے پر شورشرابا مچایا جاتا ہے،مطلب علت و سبب کو فراموش کردیا جاتا ہے اور نتایج پر واویلا مچایا جاتا ہے۔

اور ایسے مردوں پر کیا کم اللہ کی لعنت مسلط ہوگی جنھونے اپنے بنائے ہوئے قانون سے اسے اپنے لئے ہر جگہ پر اس کے ساتھ کھیلنا ہی مقصد بنا لیا ہے
عورت نے اس نعرے کے فریب میں آکر جب گھر سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا شروع کیا تو اسے ہوٹلوں میں ریسیپشن پر، ہسپتالوں میں بطور نرس، ہوائی جہازوں میں بحیثیت ایئر ہوسٹس، تھیٹروں میں بحیثیت اداکارہ یا گلوکارہ، مختلف ذرائع ابلاغ میں بحیثیت اناؤنسر بٹھا دیا گیا، جہاں وہ اپنی خوبروئی ، دلفریب ادا اور شیریں آواز سے لوگوں کی ہوس نگاہ کا مرکز بن گئی، فحش رسائل و اخبارات میں ان کی ہیجان انگیز عریاں تصویر چسپاں کر کے مارکیٹنگ کا وسیلہ بنایا گیا تو تاجروں اور صنعتی کمپنیوں نے اسی نوعیت کی فحش تصویر اپنے سامان تجارت اور مصنوعات میں آویزاں کر کے انہیں فروغ دینے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جس کی نظر آج کی فحاشی و عریانیت پر ہے وہ اچھی طرح واقف ہے کہ مس ورلڈ، مس یونیورس اور مس ارتھ کے انتخابی مراحل میں عورت کے ساتھ کیا کیا کھلواڑ نہیں ہوتا ہے، نیز فلموں میں اداکاری کے نام پر اور انٹرنیٹ کی مخصوص سائٹس پر اس کی عریانیت کے کون سے رسوا کن مناظر ہیں جو پیش نہیں کئے جاتے ہیں،
اگر یہی عورت کی آزادی اور اس کی عزت و تکریم اور اس کے حقوق پانے کی علامت ہے تو انسانیت کو اپنے پیمانہ عزت و آنر پر لازماً بار بار نظر ثانی کرنی چاہئے ۔

یاد رہے کہ یہ سب معاملہ عورت کے ساتھ اس وقت تک رکھا جاتا ہے جب تک اس میں مردوں کے لئے کشش ، ابھرتی جوانی کی بہار ، دل ربا دوشیزگی کا جوبن اور شباب و کباب کی رونق قایم رہتی ہے ، لیکن جب اس کے جوبن میں پژ مردگی آ جاتی ہے، اس کی کشش میں گھن لگ جاتا ہے ، بازاروں میں اس کی قیمت لگنا بند ہو جاتی ہے، اس کے ڈیمانڈ کو دیمک چاٹ جاتی ہے اور اس کی ساری مادی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے تو یہ کافر معاشرہ اس سے منہ موڑ لیتا ہے ،وہ ادارے جہاں اس نے جوہر کمال دکھائے تھے اس کو چھوڑ دینے میں عافیت سمجھتے ہیں اور وہ اکیلی یا تو اپنے گھر میں کسمپرسی کی زندگی گزارتی ہے یا پھر پاگل خانوں میں سر پٹکتی رہتی ہے۔

یہ ہے آزادی نسواں کی موجودہ کڑوی حقیقت اور یہ ہے اس کا حتمی برا انجام ، آزادی نسواں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مغربی مصنف یوں رقم طراز ہے:

‘‘وہ نظام جس میں عورت کے میدان عمل میں اترنے اور کارخانوں میں کام کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اس سے ملک کو چاہے کتنی بھی دولت و ثروت مہیا ہو جائے، مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس سے گھریلو زندگی کی عمارت زمیں بوس ہو کر رہ جاتی ہے، کیونکہ اس نظام نے گھر کے ڈھانچہ پر حملہ کر کے خاندانی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور معاشرتی تعلقات و روابط کے سلسلہ کو درہم برہم کر دیا ہے’’۔

ایک دوسری مغربی مصنفہ نے جو کہ پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر بھی ہے، وہ اپنے مغربی معاشرے کے اندر رونما ہونے والے بحرانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں خامہ فرسا ہے:

‘‘خاندانی زندگی میں رونما ہو نے والے بحرانوں کا سبب اور معاشرے میں جرائم کے بکثرت بڑھ جانے کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ عورت نے گھر کی چار دیواری کو الوداع کہدیا ہے، تاکہ خاندان کی آمدنی دوگنی ہو جائے، اور واقعی آمدنی تو بہت بڑھ گئی مگر اس سے معیار اخلاق انتہائی نچلی سطح تک گر گیا، تجربات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ آج نسل نو جس بحران میں مبتلا ہے، اسے اس سے بچانے اور نکالنے کا صرف ایک ہی راستہ اور طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ عورت کو دوبارہ اس کے اصل مقام یعنی گھر میں واپس لایا جائے’’۔

مسلم عورت کو **مسٹر پیر کریٹس** اس طرح خراج پیش کرتا ہے:

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے برقعہ پوش مسلم خواتین کو ہر شعبہ زندگی میں وہ حقوق ‘‘ حاصل ہو گئے ہیں جو بیسویں صدی میں ایک تعلیم یافتہ عیسائی عورت کو حاصل نہیں ہیں[36]۔

یہاں پہنچ کر بے ساختہ علامہ اقبال کا یہ مصرعہ زبان پر آ جاتا ہے:

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں ، معذور ہیں، مردان خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادی نسواں کہ زمرد کا گلو بند

[36] اعتراف حق: صہ: 209۔

دوسری شادی اور عدل کا معاملہ

از:------------------------

عصر حاضر میں عورتوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے والے جدید مفکرین کہتے ہیں کہ مشاھدے کے مطابق دوسری شادی کے بعد مرد عموما عدل نہیں کرتے ہیں لہٰذا دوسری شادی کیلئے پہلی بیوی سے قانونی اجازت لینا ضروری ہونا چاھئے تاکہ عورت ظلم کا شکار نہ ہوپائے، تو جنابؒ! اگر یہی منطق ہی صحیح ٹھرای جانے لگے تو یہ منطق بھی اسکے مد مقابل نمودار ہوگی کہ پھر دوسری شادی کیا شہ ہے، مردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد تو اپنی پہلی بیوی ہی کے حقوق پورے نہیں کررہی ہے،ایسے دعوے بھی جا بجا انھی مشہورِ عامہ پہلی بیویوں کی طرف سے سامنے آتے ہیں۔

معاملہ اتنا ہی نہیں ہے بلکہ ان پہلی بیویوں کایہ بھی کہنا ہے کہ یہ مشہور سماجی رتبہ کا مالک مرد شوہر ان پر ظلم بھی کرتا ھے۔ لہٰذا عورتوں کے حقوق کو محفوظ کرنے کیلئے پہلی شادی کیلئے یہ قانون بنانے کی سخت ضرورت ھے کہ مرد پہلی شادی کیلئے عدالت یا کسی سرکاری میریج ادارے سے اجازت لینے کا قانونا پابند ہو، جہاں قرآئن کی روشنی میں وہ یہ ثابت کرے کہ جس عورت کو وہ بیوی بنانے جارھا ھے اسکے ساتھ وہ عدل کرسکتا ہے نیز اسکی تمام شرعی ذمہ داریاں ادا کرسکتا ھے یا نہیں ؟ منطق اگر ایماندارانہ بنیادوں پر اجتماعی فیصلے کرنے کی عادی ہے تو اسے پہلی اور دوسرے دونوں شادیوں میں عدل منطقی روا رکھنا چاہئے ۔

لہٰذا یہاں بی بی منطق ! کو یہ کرنا چاہئے کہ جس کسی کے پاس یہ "عدل سرٹیفیکیٹ" نہ ہو قاضی اسکا نکاح ہی نہ پڑھا نا چاہئے ۔ اس مجوزہ قانون کے نتیجے میں ظلم سے بچنے والی خواتین کی تعداد یقینا اس موجودہ قانون (کہ دوسری کیلئے پہلی سے اجازت لینا لازم ھے) سے بچنے والی خواتین سے بہت زیادہ ہوگی کیونکہ دوسری شادی تو بہت کم مرد کرتے ہیں جبکہ پہلی شادی تقریبا سب ہی کرتے ہیں، لہٰذا زیادہ ضرورت اس پر نظر رکھنے کی ھے:اس سے ایک فایدہ محکمہ بھبود آبادی اور مشہور عامہ یہودی سازش کرنے والوں کو یہ ہوگا کہ،پہلی شادی جو آج دوسرے سے زیادہ مشکل ہے میں بھی کمی آجائیگی جس سے ،آبادی میں کمی کرنے میں آسانی میسر آئیگی،نا بجے گا بانس نا بجے گی بانسری۔

اوراب یہاں تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں جو بہو کے مقابل ساس کے ساتھ پیش آتا ہے جہاں بہو ،ساس کے حقوق اور ساس بہو کے حقوق ضبط کرنے میں جرات مند واقع ہوئیں ہیں کہ :ایک دوسرے کے حقوق کی مخالفت میں دونوں اپنے اپنے بیٹے اور شوہر کو استعمال کرتی رہتی ہیں،اور وہ وہاں قربانی کا ایسا بکرا ہوتا ہے جسے اپنی بلی چڑھنے کا بھی اندازہ نہیں ہوتا ہے، کی ماں کی بابت گفتگو کی جائے گی ،وہی ماں جو حقوق کی بحث سے صرف لفظ ماں کے سماجی و خاندانی رتبے کے سبب محروم کردی جاتی ہے۔

اس لڑکے کی ماں بچاری کا اس بحث میں فراموش کیا جانا ایک سنگین زیادتی اور عدم انصاف ہوگا کہ بھو و ،بیوی کے روپ میں وہ انصاف پائے مگر ماں کے روپ میں محروم رہے، اس بیچاری کا یہاں کیا قصور ھے جس نے پال پوس کر اس بیٹے،کو بڑا کیا ھے؟ اکثر دیکھا گیا ھے کہ شادی کے بعد لڑکے ماں کے ساتھ عدل نہیں کرتے ہیں ، لہذا عورتوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے لازم ھے کہ لڑکے کی طرف سے لڑکے کی ماں کو حق طلاق دے دیا جائے کہ یہاں بیٹے نے اپنی بیوی کی وجہ سے اپنی ماں پر ظلم کیا وھاں ماں نے مسئلے کی جڑ (بیوی) کو گھر بھیج دیا،یہ حق استرداد عین ویٹو پاور کی طرح ہوگا اس سے بین الاقوامی تعلقات کی تربیت کا امر بھی کافی رایج ہوجائیگا؟

بھلا اس حقِ طلاق کو منتقل کئے بغیر بھی ماں (عورت) کے حقوق کوتحفظ دیا جاسکتا ھے؟ ھرگز نہیں، تو فورا یہ قانون بنادیا جانا چاہئے، بلکہ نکاح نامے میں اسے بطور ایک شق داخل کردینا چاھئے کہ جوں نکاح ھو یہ حق بھی ماں کو منتقل ھوجائے تاکہ معاشرے میں عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد میں موجود مقام (ماں) کے حقوق محفوظ ھوسکیں،یقین مانیں اس کے بعد شادیوں کی تعداد کئی گنا کم ہوجائیگی اور جتنی ہونگیں ،وہ سب عورت کے حقوق کے تناظر میں خود ہی جلد ختم ہوجائینگیں،کیونکہ ہماری ڈراموں کی سو کالڈ ساس ،نند اس حق کی روشنی میں اپنی بھو کو فارغ کرنے لگیں گیں، جس سے صنفی تضاد دو جنسوں کے مابین نا رہے گا ،بلکہ ایک ہی جنس میں سمٹ آئیگا،اس طرح ظلم،زیادتی،اور ناانصافی کا الزام بھی عورتیں عورتوں کو لگانے لگیں گی۔ویسے بھی بات جب دور نکلتی ہے تو بھت دور تک جاتی ہے،اگر خواتیں حقوق کی بحث کو منطقی انجام تک پہنچانا چاہتی ہیں تو جان لیں اسی موئی منطق نے انکو بھی ڈس کر نہیں چھوڑنا ہے، کیونکہ اسکے منہ کو جو فضول دانش مندی کا خون لگ چکا ہے اسے وہ وہ بار بار چکھے بغیر نا چھوڑے گی۔[37]

---

[37] معج

دورِ جدید میں غلام اورباندی بنانےکاتصور

از: ڈاکٹر محمد مشتاق

چئیرمین شعبہ قانون،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ، اسلام آباد

ابھی کچھ عرصہ قبل ہی معلوم پڑا کہ جناب عمار خان ناصر صاحب! نے جنگی قیدیوں کو غلام و باندی بنانے سے متعلق داعش کے نقطہ نظر کا ذکر کیا تھا اور اس کے لیے کن دلائل کا سہارا لیا جاتاہے، کی بابت وہ ان الفاظ کے ساتھ سوال اُٹھاتے ہیں کہ:

‘‘ حال ہی میں دولت اسلامیہ (داعش) کے ترجمان جریدے میں جنگی قیدیوں کو غلام باندی بنانے کے حق میں مضمون ایک دیکھا گیا تھا جسکی رو سے داعش کا مؤقف یہ ہے کہ جو حکم اللہ کی شریعت میں بتایا گیا ہے، اس کو انسان کیسے تبدیل کر سکتے ہیں؟ جدید دور میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی ممانعت سے اتفاق کرنے والے مسلم فقہاء عموما اس پابندی کا جواز ‘‘معاہدے’’ کے اصول پر ثابت کرتے ہیں۔ یعنی غلام بنانا چونکہ واجب نہیں، بلکہ مباح ہے جسے کسی دوسرے اخلاقی اصول کے تحت ممنوع کیا جا سکتا ہے، اس لیے بین الاقوامی معاہدے کے تحت اس پابندی کو قبول کرنا شرعی طور پر درست ہے یہ ایک قابل فہم فقہی استدلال ہے۔

البتہ اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاہدے کی پابندی تو اسی فریق پر لازم ہوتی ہے جو معاہدے کا حصہ ہو،جبکہ اسکے برخلاف داعش وغیرہ تو جدید بین الاقوامی قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی انھوں نے اس قسم کےکسی معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔ چناچہ اگر وہ اس پابندی پر عمل نہ کریں تو شرعی طور پر ان پر کیا اعتراض بنتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ جدید بین الاقوامی عرف میں اس کو غیر اخلاقی سمجھا جاتا ہے تو پھر یہ اصولی سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو شریعت میں اخلاقی طور پر جائز مانا گیا ہو، کیا اس کے متعلق سماج کے اخلاقی پرسپشن[38] میں تبدیلی کیا شریعت کے عطا کردہ اخلاقی جواز کو ختم کر سکتی ہے؟ ایک دوسرے پہلو سے یہ سوال یوں بنتا ہے کہ کیا شریعت نے غلامی کو اخلاقی جواز انسانی پرسپشنز سے ماورا ہو کر دیا یا اس بنیاد پر دیا کہ چونکہ انسان اسے اخلاقی طور پر جائز مان رہے ہیں، اس لیے یہ جائز ہے؟ اگر غلامی کا اخلاقی جواز عرف اور انسانی پرسپشن سے ماورا ہے تو داعش پر اعتراض بظاہر نہیں بنتا ہے، کیونکہ وہ تو سرے سے بین الاقوامی معاہدات کو قبول ہی نہیں کرتی ہے۔

---

[38] Perception .

البتہ اگر اس کے اخلاقی جواز میں عرف اور انسانی پرسپشنز کا بھی دخل ہے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ داعش کا موقف درست نہیں ہے،اس بابت علمائے دین کیا فرماتے ہیں ؟

"

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد نے کمنٹس کی شکل میں ان اشکالات کے جو جواب دیے ہیں، انھیں قارئین کے لیے یکجا کرکے پیش کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد لکھتے ہیں کہ:

پہلے تو اس پوسٹ میں کارفرما چند "ٹویسٹس" ملاحظہ کیجیے:

۱۔ پہلا ٹویٹ : ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کےلیے اس بار بھہ یا تو ماضی کی غلامی کی بات کی گئی ہے کہ جب مسلمان، کسی بھی وجہ سے، کسی کو غلام بنالیتے تھے، یا آینده کی بابت گگتگو کی گئی ہے جب مفروضہ طور پر مسلمان کسی وقت اس پوزیشن پر آجائیں گے کہ وہ پھر سے دوسروں کو غلام بناسکیں گے۔ جہاں تک عصری غلامی کے موجودہ مغالطہ کا تعلق ہے تو صرف اس مثال کی جو مسلمانوں کے ایک بہت ہی محدود گروہ نے بہت ہی محدود پیمانے پر اختیار کی ہے سے کیا نتیایج اکذ کرنا مکن ہے؟۔

ماضی (میں جو ہوگیا اور مسلمانون نے جو فتوحات حاصل کرلیں تھیں کو کیا مستقبل میں دہرانا ممکن ہے ؟) فرض کریں کہ مستقبل میں اگر کبھی مسلمان سیاسی طور پر دنیا میں غالب آئے، حالانکہ آپ کے استاد گرامی (جاوید احمد غامدی) کے بقول نہ امام مہدی نے آنا وانا ہے، نہ ہی مسیح نے کبھی دنیا میں نمودار ہونا ہے، تو مسلمانوں کے عالمی سیاسی غلبے کا مفروضہ انکی سوچ کے تناظر میں مفروضہ کی حد تک ہی غلط ہوا؟ لیکن بہرحال اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو اس وقت کے مسلمان جو کچھ کریں گے، اس کا جواب ابھی سے ہم کیوں دیں؟ ماضی کے لوگوں کو ماضی کا جواب دینے دیں، مستقبل کے لوگ اپنا جواب دے لیں گے۔

ہم موجودہ عصر کی بات کیوں نہ کریں اور یہ کیوں نہ دیکھیں کہ اس وقت غلامی کی رائج شکلوں کے رواج میں ہمارا کتنہ حصہ ہے اور وہ حصہ کس حد تک ہمارے آزاد اختیار پر مبنی ہے؟

۲۔ دوسرا دلچسپ ٹویٹ یہ ہے کہ: داعش، یا کسی بھی گروہ، کی جانب سے کی گئی ایسی کسی بھی کارروائی کو "مسلمانوں کے مؤقف" کے طور پر کیوں دیکھا جائے جبکہ مسلمان ایک سیاسی وحدت کے طور پر باقی ہی نہیں رہے ہیں؟ کیا اسی قیاس پر گوانتاناموبے کی غلامی کےلیے پوری مغربی مسیحی/یہودی دنیا کو ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ اگر مسلمان ایک سیاسی وحدت ہوتے، داعش کی

خلافت موجود ہوتی، اور ایسے میں داعشی خلیفہ کی جانب سے ایسا کوئی اقدام ہوتا اور اسے مسلمانوں کے مؤقف کے طور پر دیکھا جاتا، تو کوئی بات بنتی بھی تھی۔

سردست تو آپ زیادہ سے زیادہ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ داعش کا جن علاقوں پر اور جن لوگوں پر مؤثر کنٹرول حاصل رہا، کیا وہ علاقے اور وہ لوگ موجودہ عالمی بندوبست سے نکل سکتے ہیں؟ لیکن سوال یوں ہوتا تو کیا ہی بات ہوتی پھر متوقع طور پر جواب بھی پھر بہت سیدھا سادہ ہوتا نا کہ یہ کہ اگر وہ اس عالمی بندوبست سے نکل سکتے ہیں تو انھیں اس عالمی بندوبست میں کون جکڑے رکھ سکتا ہے؟

بہرحال یہاں ٹویسٹ[39] یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک اکائی فرض کرکے، ان کے حاشیے پر موجود ایک معمولی گروہ کے طرزِ عمل کو یہ معلوم کرنے کےلیے استعمال کیا جا رہا ہے کہ مستقبل بعید میں، جب امام مہدی اور سیدنا مسیح کے نہ آنے کے باوجود مسلمان کسی وجہ سے عالمی سیاسی غلبہ حاصل کرلیں گے، تو یہ والا طرزعمل اختیار کرنے میں ان کےلیے شرعی مانع کون ہوگا؟

۳۔ تیسرا ٹویٹ یہ ہے کہ : لمحہ موجود(عصر حاضر) کے نام نہاد اخلاقی اقدار کو مستقل اور غیرمتبدل فرض کرکے یہ سوال اٹھایا جارہا ہے کہ ماضی میں خواہ غلامی کو برا نہ سمجھا جاتا رہا ہو لیکن اب جبکہ انسانیت اس کی برائی پر متفق ہوچکی ہے تو پھر مستقبل میں اگر کبھی مسلمانوں کو عالمی سیاسی غلبہ حاصل ہوا، تو وہ یہ کام کیسے جائز تصور کرسکیں گے جسے آج انسانیت برا سمجھنے پر متفق ہوچکی ہے؟

سوال میں پنہاں سادگی اور قطعیت پر نظر کیجیےاور دیکھیے کہ کیسے لمحۂ موجود کے متعلق مفروضات پر قائم احساس کو موہوم مستقبل پر لاگو کرکے آج کے مسلمان کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کرکے اس سے سوال کیا جارہا ہے؟

۴۔ چوتھا ٹویٹس: جو اس موضوع پر پچھلی ڈیڑھ صدی میں لکھے گئے لٹریچر کی عمومی خصوصیت ہےوہ یہ ہے کہ "غلامی" کو ایک جامد اور عالمی طور پر متفق علیہ یکساں تصور کے طور پر پیش کیا گیا ہے حالانکہ مختلف ادوار میں، مختلف معاشروں میں، مختلف نظامہاے قوانین میں، غلامی کے عنوان کو مختلف نوعیت کی علمیاتی فلسفیانہ جکڑبندیوں کی صورت میں دیکھا پرکھا گیا ہے ۔

غلام کو بطور مثال کے جیسے رومی قانون میں غلام کہا جاتا تھا، ماضی میں اسلامی قوانین میں بھی اس غلام کا عین وہی تصور تھا؟ کلاسیکی (اور چونکہ "کلاسیکی" کا لفظ آاپ کو بہت مرغوب ہے، اس لیے یہاں استعمال کرنے کی جسارت کررہا ہوں) اس میں کیا شک ہوگا کہ رومی قانون میں غلام

[39] Twist.

کو شخص کی بجائے عموماً مال قرار دیا گیا ہے،وہں اسکی اس سے زیادہ کوئی وقعت نہیں تھی، اسکا ذاتی شخصیاتی تشخص ویسا نا تھا جیسا اسلامی قوانین میں اخلاقی تناظر میں پایا جاتا ہے ۔[40]

اسی طرح اگرہم قانون میں دیکھیں تو اس کا قانونی اثر یہ تھا کہ گائے، بھینس، زمین، لکڑی یا کسی بھی دوسری چیز کی طرح، جسے مال مانا جاتا تھا، غلام کے کوئی قانونی حقوق نہیں ہوتے تھے (خواہ عملاً ان کےلیے کچھ نہ مانا جاتا رہا ہو، لیکن قانون میں ان کے کوئی حقوق نہیں تھے)۔ قانونی حقوق کےلیے پہلے قانونی شخصیت کا ماننا لازم پڑتا ہے اور وہ شخصیت اس غلام کو میسر نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے بہت سے "قاری" فوراً کہہ اٹھیں گے کہ فقہائے کرام نے بھی تو غلام کو مال مانا ہوا ہے؛ جی ہاں، یقیناً مانا ہوا ہے لیکن صرف مال نہیں مانا ہے، شخص بھی مانا ہے ؛ بلکہ پہلے شخص مانا ہے پھر مالتصور کیا ہے اور اس وجہ سے اسلامی قانون میں غلامی کا تصور کلاسیکی رومی قانون کے غلامی کے تصور سے اپنی اساس اور جوہر میں بلکل ہی مختلف ہوجاتا ہے۔

شخص[41] ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غلام کے کچھ حقوق ایسے تسلیم کیے گئے جن پر آقا کا اختیار نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ حقوق شریعت نے متعین کیے ہیں اور شریعت کے دیے گئے حقوق کو چھیننے کا اختیار نا ہی آقا کے پاس ہے، اور نا ہہی ریاست کے پاس بھی تھا۔ اسلامی قوانینِ غلامی کے بعد کی دنیا میں غلامی کی مختلف نوعیتیں دنیا میں رائج رہی تھیں، اور اب بھی کسی ان کسی شکل میں رائج ہیں، اور وہ آج بھی بنیادی طور پرقریباً انھی دو قسموں میں تقسیم ہیں:

۱۔ غلام بطور مال ۔

۲۔ غلام بطور قانونی شخص اور مال؟۔

اگر دوسری قسم یہاں مراد ہے تو اس کے بھی مختلف مدارج ہیں کہ کسی میں قانونی حقوق زیادہ ہیں اور کسی میں کم ہیں لیکن بہرحال کسی نہ کسی درجے میں "کسی کی ملکیت"میں بھی ہیں۔

اب ذرا گرد و پیش پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ یہ دو قسمیں آج بھی رائج ہیں یا نہیں ہیں ؟ اب ذرا بالکل ہی آخری سطح پر آکر دیکھیں کہ کیا بعض انسانوں کےلیے قانونی شخصیت کا انکار آج بھی ہورہا ہے یا نہیں ہورہا ہے؟ اگر ہورہا ہے تو پھر آج کے مسلمانوں کو ماضی کے مسلمانوں کے کیے گئے کاموں کی بنیاد پر کیوں ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کیا جارہا ہے؟ آج کے انسانوں سے آج کے کرتوتوں کا کیوں نہ پوچھا جائے؟ لیکن نہیں ذرا رکیں کیا یہ سوال "مدرسہ ڈسکورسز" کے اہداف و مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، اس لیے اس کا نہ اٹھایا جانا ہی اوفق للمصلحۃ ہے۔

[40] معج

[41] Person/

ان تمہیدی نکات کے بعد اب صلبِ موضوع پر چند نکات ملاحظہ کیجیے:

۱۔ معاصر بین الاقوامی نظام کے متعلق یہ مفروضہ کہ اس نے غلامی کا خاتمہ کردیا ہے، محض پروپیگنڈا سے زاید کچھ نہیں ہے اور غلامی کی محولا بالا دونوں قسمیں (غلام بطور مال اور غلام بطور شخص و مال) معاصر دنیا میں نہ صرف رائج ہیں بلکہ بین الاقوامی قانون کی رو سے انھیں تسلیم بھی کیا گیا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ نوے کی دہائی میں سعودی عرب نے اپنے ایک شہری کو (اس شہری کا نام خوفِ فسادِ خلق کی وجہ سے نہیں لے رہا) حقوقِ شہریت سے محروم کردیا تھا[42] ۔ یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی تنہا سعودی عرب نے یہ کوئی منفرد کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ بلکہ عصر حاضر کے بہت سے ممالک نے بارہا بہت سارے لوگوں کو حقوقِ شہریت سے محروم کیا ہوا ہے اب دور کیوں جائیں؟ روہنگیا اور بہار کی مثالیں دیکھ لیں [43]۔

سوال یہ ہے کہ حقوقِ شہریت سے محرومی کا قانونی مطلب کیا ہے بالخصوص جب آپ دوسری ریاستوں کو بھی مجبور کریں کہ وہ اس شخص کو شہریت تو کیا "سیاسی پناہ" بھی فراہم نا کرے؟ حقوقِ شہریت سے محروم وہ شخص جو کسی بھی ریاست کا شہری نہ ہو[44]، جسے بین الاقوامی قانون کی زبان میں غیر ریاستی فرد کہا جاتا ہے، کے قانونی حقوق کیا ہوتے ہیں اور کیا ،کس حد تک ممکن ہیں؟

پھر یہ بھی یاد کیجیے کہ بین الاقوامی قانون کی رو سے انسانی حقوق کےلیے مطالبہ ریاست سے کیا جاتا ہے۔ پھر اس پر ایک سوال یہ پید اہوتا ہے کہ جب ایسا شخص کسی ریاست کا شہری ہی نہیں ہے تو اس کے حقوق کا مطالبہ کن سے کیا جائے؟وہ کسی ریاست میں کیسے رہیگا اور خارج الریاست ہوگا تو کہاں،کیسے بلا پاسپورٹ جائیگا،اسکا جواب بین القوامی قانون کے پاس شافی نہیں ہے ہاں، اس سوال پر بھی ضرور غور کیجیے کہ اس کی حیثیت قانونی طور پر اس غلام سے کیسے مختلف ہے جس کےلیے قانونی شخصیت تسلیم کی گئی ہے؟

دوسری مثال گوانتانامو بے کے قیدیوں کی ہے، بین الاقوامی قانون کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ جنگ میں آپ کے مخالف فریق یا تو مقاتل ہیں اور یا غیر مقاتل ہیں اور پھر دونوں قسموں کےلیے قانونی حقوق و فرائض متعین کئے گئے ہیں۔ امریکا نے کہا کہ یہ لوگ نہ مقاتل ہی ہیں، اور نہ ہی غیر

---

[42] **غالباً اسامہ بن لادن کی طرف اشارہ ہے۔واللہ علم**

[43] **اس ضمں میں بھارت میں بہار،آسام کے اجنبی مسلمانوں کے اخراج کے لئے قانون ساسی نیشنل سیٹیزن رجسٹر،سی۔اے۔اے کے قوانین کے ذریعے مسلمانوں کو شہریت سے خارج کرکے دیگر مذاہب کے تارکین وطن کا بھارتی شہرہتی کھاتے میں اندراج نے،۲۰۱۹،۲۰۲۰ میں بھارت میں بلوے،ریساتی جبر،جلاق گھیراو،مسلم ہندو فساد کے دروازے کھول دئے،بے۔جے۔پ۔آر۔ایس۔ایس بھارتی ہندو ریاستی جبر کی پشت پناہی سے مسلمانون پر ٹوٹ پڑیں جس پر مسلمان مرد و زن معتدل مزاج ہندو سماج کی مدد سے احتجاج کے لئے باہر نکل آئے،یہ احتجاج جاری تھا کرونا کے سبب احتجاج ملتوی رکنا پڑا ۔**

[44] stateless person

مقاتل طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ، اور اس وجہ سے بین الاقوامی قانون میں موجود دونوں قسموں کے قانونی حقوق سے محروم ہیں۔

مزید براں انھوں نے ان کو امریکا سے باہر گوانتانامو کے جزیرے میں رکھا ہوا تاکہ وہ امریکی قانون کی پہنچ سے بھی دور رہ سکیں۔

سوال اب بھی یہی ہے کہ گوانتانامو میں موجود قیدیوں کو کس بنیاد پر غلاموں سے مختلف گروہ مانا جائے؟ جبکہ یہاں یہ گوانتانامو تو محض ایک مثال ہے، چاہے برطانیہ کی بل مارش جیل ہو، عراق کی ابوغریب جیل ہو، افغانستان کی بگرام جیل ہو یا پاکستان کے قبائلی علاقوں میں موجود انٹرنمنٹ کیمپس ہوں، اس نوعیت کی غلاموں کی فیکٹریاں تقریباً ہر ریاست نے بنا رکھی ہیں[45]۔

مقدار اور معیار کا فرق ضرور ملحوظ، نظر رکھنا ہوگا لیکن نوع ایک ہی ہے، پھر اس تناظر میں ''**مسنگ پرسنز**'' کو غلام نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟ ان کی بھی قانونی شخصیت کا ہمارے یہاں انکار کیا جاتا ہے، انکی قانونی بین الاقوامی حیثیت کا تعین کرنا بھی ضڑوری ہے ، ہمیں کیا پتا وہ کہاں ہیں؟ شاید جہاد کےلیے گئے ہوں گے کچھ کی بابت سنا ہے گوادر میں انکی بوریوں میں بن لاشیں مل گئی ہیں، ہم آپ بچ گئے شکر کریں۔

سب سے بڑھ کر آج تو ریاست کی غلامی نا صرف سب سے عظیم غلامی بن پھر کارپوریٹ غلامی[46] چکی ہے بلکہ اس وقت یہ بین الاقوامی قانون کا رکنِ رکین ہے۔

اب ذرا اپنے دستوری نظام میں ہی کو دیکھیں، جسکی رو سے آج پاکستان میں جو کچھ ہے اور جو کوئی بھی ہے، وہ پاکستان کی ملکیت ہےاور پاکستان کے ساتھ غیرمشروط وفاداری اس کا ناقابل تنسیخ فریضہ ہے۔ آپ فلم کو بے شک **مالک** کا عنوان دیں اور شوق سے کہیں کہ میں اس ملک کا مالک ہوں لیکن قانونی طور پر تو ملک مالک ہے اور میں اور آپ صرف مملوک ہیں[47] ۔ چند دن قبل میں نے عرض کیا تھا کہ پاکستان میرا نہیں ہے، بلکہ میں پاکستان کا ہوں۔ یقین نہ ہو تو جبری خدمت کا قانون

---

[45] **اس قسم کو ریاستی جبری غلام کہ سکتے ہیں** ۔معج

[46] **corporate slavery-**

[47] **یہاں صاحب نظر کو شرعی ریاست و امارت اور مغربی تصور ریاست کی تفریق کرنی چاہئے تھی،شر میں ریاست اصل نہیں بلکہ ذریعتہ المقاصد ہے،جبکہ مغرب میں ایک فریق فرد کو اصل کہتا ہے دوسرا ریاست کو ،مگر حقیقت یہی ہے کہ عملی معبود وہاں اور انکے مقلد معاشروں میں ریاست ہی ہوتی ہے۔معج**

ہی دیکھ لیجیے، ریاست کیسے ہم سب کو زبردستی کام کرنے پر مجبور کرسکتی ہے،ینگ ڈاکٹرز[48] کے خلاف کارروائی اسی قانون کے تحت ہی تو ہوتی ہے[49]۔

اگر تم ریاست کے غلام ہو تم اسکا انکار کیسے کرسکتے ہو؟ جبری تعلیم بھی اس تناظر میں دیکھیں تو عمدہ ہوگا، آپ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ کے بچے کو تعلیم دیں گے اور اسے وہ کچھ پڑھائیں گے جو ہم چاہیں گے۔ جبری ویکسینیشن کو ہی دیکھ لیں۔ آپ لاکھ چیخیں چلائیں، آپ کے بچے کو ہر بار وہ پولیو کے قطرے پلائیں گے وغیرہ وغیرہ[50]۔ اب کہیے کہ اس جبر میں اور غلامی میں فرق کتنا ہے؟۔ میں مان لوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس غلامی اور اُس غلامی میں بھی فرق واقع ہوتا ہےاور غلامی کی بہت سی قسموں کو لمحۂ موجود میں بھی بین الاقوامی قانونی نظام نے تسلیم کیا ہوا ہے۔

اس لیے یہ سوال ہی غلط ہے کہ کل کو اگر مسلمان عالمی سیاسی غلبہ حاصل کرلیں گے تو وہ غلامی کو کیسے رائج کرسکیں گے؟ بے فکر رہیں، انسانوں نے غلامی کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور آیندہ بھی تسلیم کرتے رہیں گے، ہاں، مغربی سیاسی نظام کی منافقت یہ ہے کہ ''غلامی'' کے عنوان پر پابندی لگادی ہے خواہ غلامی کی کئی نئی بدترین شکلیں انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ اسی نظام نے رائج کی ہیں۔

۲۔ یہ سوال بھی معاصر بین الاقوامی قانون کی اساس سے بے خبری (یا تجاہل) کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ریاست اس وقت ان معاہدات میں شامل نہ ہو جو غلامی پر پابندی عائد کرتے ہیں تو کیا غلام بنانا شرعاً اس کےلیے جائز ہوگا؟ معاصر بین الاقوامی قانونی نظام کے تحت آپ ''ریاست'' یا ''نظم اجتماعی'' کی صورت تبھی اختیار کرسکتے ہیں جب پہلے ان معاہدات کو تسلیم کرلیں؛ ورنہ بصورتِ دیگر آپ کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو کلاسیکی رومی قانون نے اپنے مظلوم غلاموں کے ساتھ کیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سو سال قبل اوپن ہائم نے ، جس کی کتاب کو آج بین الاقوامی قانون کے کلاسیکس میں شمار کیا جاتا ہے، صراحتاً کہہ دیا تھا کہ یہ بین الاقوامی قانونی نظام یورپی مسیحی اقوام کا تشکیل کردہ ہے؛ اس میں غیر یورپی اور غیر مسیحی اقوام تین شرائط پر شامل ہوسکتی ہیں:

۱)۔ ایک یہ کہ وہ تہذیب کی ایک خاص سطح تک پہنچی ہوئی ہوں ۔

---

[48] **یہاں صاحب مضمون ڈاکٹرز کی مفادی تنظیم بازی،جبری سیاست و دباو کی روش اور انکے سبب انسانی جانوں کے تلف کرنے کو فراموش کرگئے،ابھی ۲۰۱۹ میں ہی ان ڈاکٹروں اور وکیلوں کے برادری کے تصادم کے نتیجے میں لاہور میں کئی بے گناہ مریض اپنی جانون سے محروم کردئے گئے۔معج**

[49] **اس معاملہ میں نا ایسا کوئی قانون ہماری معلومات میں ہے نا مقامی قوانین کا اس سیاق و سباق سے ظاہراً تعلق بنت انظر آتا ہے،عمومات سے تخصیصی نتایج قایم کرنے سے قبل موصوف ذرا یہاں متعلقہ قانون کا حوالہ فراہم کردئتے تو ہم کم علموں کو آسانی میسر آجاتی؟**

[50] **ریاست کے جبر ی فلسفہ کی سیادت و حقیقت اپنی جگہ مگر موصوف کی بحث سے نراجیت کا ثبوت مل رہا ہے،باقی تربیت و جبر کا فرق روا رکھنا یا پھر مریض کو اس کی حیات کی بقا کے لئے زبردستی دوا پلانا جبر نہیں تحفظ حیات ہے۔معج**

۲)۔ دوسری یہ کہ وہ اس نظام کی شرائط اور قیود قبول کرلیں۔

۳)۔ تیسری یہ کہ اس نظام میں پہلے سے شامل (یورپی مسیحی) اقوام انھیں اس نظام میں شامل کرنے پر آمادہ بھی ہوں۔

اب اگر ان شرائط کے اثرات دیکھنے ہوں تو اوپن ہائم کی یہ بات بھی نوٹ کیجیے کہ امریکا تو یورپی ہے؛ اور ایتھوپیا اگرچہ مسیحی ہے لیکن ابھی وہ تہذیب کے اس خاص extension مسیحی اقوام کی ہی مقام تک نہیں پہنچا ہے کہ اسے اس نظام میں شامل کیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس نظام کو اقوام متحدہ کی تنظیم کے ذریعے نافذ کیا گیا ہے اور اب بھی اقوام متحدہ کی تنظیم کے چارٹر میں دیکھ لیجیے کہ کون سی شرائط پوری ہوں تو اس کے بعد ہی آپ کو اس نظام میں شامل سمجھا جاسکتا ہے؟ چین ہی کی مثال لے لیجیےجب 1949ء میں کمیونسٹ چین نے قوم پرست چین کو شکست دے دی تھی تو 1970ء تک اس کمیونسٹ چین کو اقوام متحدہ کا رکن ہی بننے نہیں دیا گیا تھا۔

ہاں، جب ساٹھ کی دہائی میں اس نے ایٹمی دھماکا کیا اور دوسری طرف کمیونسٹ بلاک میں روس کی اجارہ داری کے سامنے لیڈرشپ کے ایک نئے امیدوار کے طور پر وہ بھی سامنے آگیا ، تو امریکا نے پاکستان کے ذریعے چین کے ساتھ فاصلے کم کیے اور پھر اسے اقوام متحدہ کا رکن بننے دیا۔ اسی طرح جب کبھی کوئی مسلمان ریاست اتنی طاقت حاصل کرلے گا کہ اسے تسلیم کرنا مجبوری بن جائے تو اسے غلامی کی ان تمام شکلوں سمیت قبول کرلیا جائے گا جو اس مسلمان ملک میں رائج ہوں گی، جیسے چین میں رائج غلامی کی لاتعداد شکلوں کو قبول کرلیا گیا ہے، تب تک کیا ہوگا؟ تب تک یہ ہوگا کہ اوپن ہائم کی ذکر کردہ شرائط پر آپ کو ناپا اور تولا جائے گا۔

آج کل پہلی شرط (تہذیب کی ایک خاص سطح) کےلیے معیار نام نہاد حقوقِ انسانی کے معاہدات ہیں،ہم ان معاہدات کو مانے بغیرموجودہ سسٹم کا حصہ نہیں بن سکتے ہیں،انکی مخالفت پر بلکہ ہم کو اسی طرح کچلا جائے گا جیسے افغانستان میں طالبان یا عراق و شام میں داعش کو کچلا جارہا ہے اور اس ضمن میں حقوق، آزادی، غلامی کے سارے تصورات غیرمتعلق ہوجاتے ہیں۔ اس لیے یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ کوئی ریاست اس نظام سے الگ رہ کر اپنے تصورات رائج کرے گی (اپنا نظام غلامی رائج کرے گی) تو کیسے کرے گی؟

۳۔ یہ بھی ایک ادھورا سچ ہے کہ معاہدے کی پابندی تو اسی فریق پر لازم ہوتی ہے جو معاہدے کا حصہ ہو، یہاں اس کے ساتھ دو اور باتوں کا اضافہ کرلیجیے تو پورا سچ سامنے آجائے گا: (۱) ایک یہ کہ معاہدے کی پابندی کا مطالبہ وہی فریق کرسکتا ہے جو خود معاہدے کی پابندی کرتا ہو؛ خود معاہدے کی دھجیاں اڑانے والا فریق دوسرے فریق سے معاہدے کی پابندی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔(۲) دوسری بات یہ کہ جب تک کوئی گروہ خود کو معاہدے میں پہلے سے شامل فریقوں سے الگ تسلیم کروا نہیں لیتا ہے، تب تک وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا ہے کہ وہ معاہدے کی پابندی پر مجبور نہیں ہے۔

مثال کے طور پر پاکستان نے بہت سے معاہدوں پر دستخط کیے ہوئے ہیں، اب اگر پاکستان میں کوئی گروہ اٹھ کر یہ اعلان کرتا ہے کہ ان معاہدات کی پابندی اس پر لازم نہیں ہے ، تو اس کی یہ بات تب تک تسلیم نہیں کی جائے گی جب تک وہ پاکستان سے الگ اپنی مستقل حیثیت کو منوا نہیں لیتا ہے؛ اور یہ منوانا حقیقتاً قانون سے زیادہ سیاسی طاقت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ بین الاقوامی قانون کی کیا بات کریں؟ ملکی قانون میں ہی دیکھ لیجیے ،کچھ عرصہ قبل میں نے سوال اٹھایا تو بہت سے لوگوں کو عجیب لگا کہ اگر ہمارا دستور ایک معاہدہ ہے تو میں اس کی پابندی پر مجبور کیوں ہوں جبکہ میں اس معاہدے میں اپنی مرضی سے شامل نہیں ہوا ہوں؟ نہ میں پاکستان میں اپنی مرضی سے پیدا ہوا ہوں، نہ ہی دستور پاکستان کے تحت اپنی اور ریاست و حکومت کی حیثیت متعین کرنے میں میرا کوئی کردار شامل ہے۔

پھر آخر کس بنیاد پر مجھ سے اس دستور کی پابندی کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور کیوں مجھ پر اس ریاست سے غیرمشروط وفاداری کا فریضہ عائد کیا جاتا ہے؟ ہاں، اگر کوئی گروہ اس حد تک طاقت حاصل کرلے کہ وہ اس بند و بست سے باہر نکل سکے تو اسے بنگلہ دیش کی طرح مستقل حیثیت مل جاتی ہے اور وہ دستورِ پاکستان کی پابندی اور پاکستان سے وفاداری کی ذمہ داری سے فارغ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اگر داعش، یا کوئی اور حربی و غیر حربی گروہ، بین الاقوامی قانونی نظام کی جکڑ بندیوں سے الگ ہونا چاہے، تو جب تک وہ اس نظام سے الگ نا ہوجائے اسکو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا ہے ،جب وہ اسکے برخلاف کر گزرے تو تو اس کے بعد بے شک وہ یہ دعویٰ کرنے کا حق رکھتا ہے کہ وہ اس نظام کا پابند نہیں ہے۔

لہٰذا تردیدی دعویٰ اور عمل تخریب معاشرہ سے قبل تک تو سب کو اس نظام کی جکڑبندیوں کے اندر رہ کر ہی جدوجہد کرنی ہوگی، جیسے ہم میں سے بہت سے لوگ اسی نظام کے اندر عدالت اور دیگر ذرائع استعمال کر نے ہونگے ،چاہے ہم ان سے دل میں کتنی ہی پرخاش رکھتے ہوں ہاں، اگر کوئی گروہ اس پورے نظام سے تو الگ نہ ہوسکے لیکن اس نظام کی کسی اکائی کے اندر، یا اس سے باہر، اپنی مستقل حیثیت منوالے تو موجودہ بین الاقوامی نظام بھی اس کی یہ حیثیت تسلیم کرتا ہے کہ وہ صرف ان معاہدات کا پابند ہوگا جو اس نے اپنے طور پر مانے ہوں۔

جینوا کال[51] نامی تنظیم ایسی مسلح تنظیموں سے باقاعدہ ان معاہدات پر دستخط کرواتی ہیں جنھیں یہ حربی مضاحمتی تنظیمیں اپنے لیے قابل قبول مانیں اور یہ مثالیں اس سے پہلے جنیوا معاہدےسے ثابت ہیں ، 2017ء میں جنیوا میں بین الاقوامی قانون کے ماہرین کی ایک ورکشاپ میں جنیوا کال کی ایک خاتون نے اپنی پریزینٹیشن دی تو ہم میں سے ایک نے ان سے پوچھا کہ آپ داعش سے کیسے معاہدات منوا سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ منواسکتے ہیں کیا شہ ہے ؟، جناب! ہم تو منواچکے ہیں تو اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب تک کوئی گروہ، داعش، طالبان، یا انہیں کوئی بھی نام دیں، اس پوزیشن میں نہیں آتا کہ وہ پہلے سے موجود اکائیوں (ریاستوں) سے ا]نی الگ حیثیت منوالے، تب تک وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا ہے کہ مجھ پر ان معاہدات کی پابندی لازم نہیں ہے؛ ہاں، وہ اس پوزیشن میں آجائے تو بے شک وہ بعض معاہدات مانے اور بعض معاہدات نہیں مانے (اور پھر نہ ماننے کے نتائج بھگتیں؟)۔

[51] Genva Call -

۴۔ مقدمات کی ترتیب درست کرنے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کی اپنی سی کوشش کے بعد سوال کا شرعی جواب بہت ہی آسان اور نہایت ہی مختصر ہے۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کے سوا آزاد انسان کو غلام بنانے کی سب شکلیں حرام ہیں، جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاسکتا ہے، اگر ایسا کرنا مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت میں عمدہ و موثر ہو اور اس سے کسی معاہدے کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوتی ہو۔ لہذا معاہدے کی پابندی مسلمانوں کے اسی گروہ پر لازم ہوگی جو معاہدے میں شامل ہو، اور یہ پابندی دوطرفہ طور پرکی جائیگی۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا فریق اس معاہدے کی پابندی نہیں کرتا ہوتو مسلمانوں پر بھی اس معاہدے کی پابندی لازم نہیں ہوگی۔ عین اسی طرح معاہدے کی خلاف ورزی مسلمانوں کے کسی گروہ کی جانب سے ہو تو ذمہ داری اسی متعلقہ گروہ پر ہی عاید ہوگی اور دوسرے مسلمانوں سے اس سلسلے میں نہیں پوچھا جاسکتا ہے تم نے ایسا کیوں،کیسے اور کس لئے نہیں کیا ہے؟کیونکہ یہ سوالات دخول معاہدہ نہیں خارج از معاہدہ ہیں۔ البتہ اگر عالمی طور پر مسلمان ایک سیاسی وحدت بن جائیں اور پھر اس سیاسی وحدت کی جانب سے معاہدہ بھی ہو تو اس کی پابندی سب مسلمانوں پر لازم ہوگی، سوائے ان کے جو اس سیاسی وحدت سے الگ مستقل حیثیت رکھتے ہوں۔ غلام بناچکنے کے بعد ان غلاموں کو وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت نے ان کو دیے ہیں۔

اب جس کے جی میں آئے ، وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا سرعام

لونڈیوں کی خریدوفروخت اور ستر سے متعلقہ امور

از:ذاہد مغل[52]

موجودہ عصر میں جہاں بہت سے مباحث مخالفین اسلام کی نگاہ میں اسلام پر طنز و تنقید کرنے کے ضمن میں ہدف بنتے نظر آتے ہیں، وہیں جنگی قیدیوں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کے مسایل بھی نمایاں ہوکر مخالفینِ دین و ملت کی تحریروں میں سامنے آتے رہتے ہیں ،حلانکہ عصر حاضر کی رایج قحبہ گیری سے ،اغوا شدہ لڑکیوں کی خرید و فروخت کی عالمی صنعت گیری تک میں جہاں اسلام کے ماسوا دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے لیکر ملحدین تک اس مذموم کاروبار میں شامل نظر آتے ہیں وہاں بہ حیثیت مجموعی اغلباً مخالفین اسلام کا خاص ہدف صرف اسلام بنتا نظر آتا ہے حلانکہ ایسا نہیں ہے کہ سر اسلام ہی ہدف تنقید کا محور ہے ، کیونکہ خود یورپ و امریکہ میں بھی مذہبی و غیر مذہبی مباحث میں ملحدین انکے مقامی رایج مذہب پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں مگر صدیوں سے اسلام پر اس ضمن میں تنقید مخالفین اسلام چاہے وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی ہوں یا پھر ملحدانہ نظریات و جھکاو کے مالک ہوں کا اسلام مخالفت میں مذکورہ بالا عالمی رویہ ایک طوفانِ بدتمیزی کی صورت میں نمودار ہوا ہے ۔[53]

چونکہ صدر اول میں اسلام کو ایک قبائلی معاشرت سے واسطہ پڑا تھا جہاں غلامی کا رواج پہلے سے ہی موجود تھا،ویسے بھی کسی بھی قبائلی نظم کی ایک خصوصیت اجتماعی طرز معاشرت ہوتی ہے جہاں اکیلے فرد کی زندگی کا تصور ممکن نہیں ہوتا ہے (جدید مارکیٹ سوسائٹی، جہاں معاشرت کی بنیاد فرد ہے، میں آنکھ کھولنے والے افراد کے لئے اسے سمجھنا آسان نہیں ہے)۔ پھر اگر یہ اکیلا فرد باہر کا ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام دشمن کیمپ سے تعلق رکھنے والا ہو تو اس کی زندگی کا تو تصور ہی ممکن نہیں ہے ۔ ماضی میں اسلامی اساس اور معاشرت کے مطالعے و مشاہدے سے یہ امر آشکار ہوا کہ اسلام نے جنگی قیدیوں کے حقوق میں ایسی ترمیمات کیں ہیں جن کے نتیجے میں ان غلاموں ،لونڈیوں اور کنیزوں کی معاشرتی شمولیت میں بدستور اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اور فرض کریں کہ اگر آج دنیا کے کسی خطے میں ایسے حالات موجود ہوں جہاں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کے سواء دیگر آپشن کم تر معقول نظر آتے ہوں تو ایسی صورت میں غلام بنالینا شرعا حرام نہ ہوگا، اگرچہ یہ بات یاد رہے کہ غلام بنانا شرع کا کوئی مطلوب ابدی حکم نہیں ہے کہ گویا اسے باعث ثواب سمجھ کر کرنا لازم سمجھا جائے[54]۔

---

[52] **August 13, 2016-**

[53] **معج**

[54] **اسلامی نظام میں کسی کو بلخصوص پہلے سے آزاد مسلمان کو غلام بنانے کو ممانعت پائی جاتی ہے بلکہ صحیح احادیث میں اسکی سخت ممانعت پائی جاتی ہے،بلکہ اسلام گناہوں،کوتاہیوں کے کفارے میں انکے آزاد کرنے،کا قاعدہ قایم کرتا نظر آتا ہے ،اسکے ساتھ مکاتبت جیسے طریقوں سے بتدریج معاشرے سے غلامی کو ملیا میٹ کرنے کی روش قایم کرتا نظر ہے۔معج**

پھر بھی فقہ کی کتابوں میں درج بعض احکامات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلامی معاشرے گویا غلاموں سے لبا لب بھرے ہوا کرتے تھے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح بعض مسلمان شرع کے دیگر احکامات کی ادائیگی میں سخت سستی سے کام لیتے رہتے ہیں (مثلا بیویوں پر ظلم) غلاموں کے حقوق کی ادائیگی میں بھی اس قسم کی زیادتیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ غلاموں اور باندیوں پر ظلم توڑنا گویا پورے معاشرے کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔

<u>لونڈی کی خرید و فروخت اور اس سے متعلقہ امور :</u>

کہنے کو تکریم انسانیت کے تصورات سماجی پہلوؤں کے تناظر میں مختلف ہوسکتے ہیں لہذا کسی ایک کی بنیاد پر تمام معاشروں کو جانچنا درست زاویہ نگاہ نہیں ہے، اس کے لئے موجود خدمات کا مثلا ایک ایسے زرعی ورک ایتھکس[55] سے موازنہ کیا جاسکتا ہے جہاں ایک کسان اپنی مرضی سے اپنے کھیت پر کام کرنے جاتا ہے اور کسی باس کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا ہے۔ جدید کارخانوں کے ڈسپلن پر مبنی ورک ایتکھس (جو اب یونیورسٹیوں میں بھی لاگو ہے) میں کام کے 8 یا 10 گھنٹوں میں ورکر کو اپنی مرضی سے کوئی کام کرنے (گپ لگانے، ادھر ادھر گھومنے، آرام کر لینے وغیرہ) کی اجازت نہیں ہوتی ہے،لہذا جو مالکان کہتے ہیں بس وہی کرنا ہوتا ہے، درمیان میں 20 منٹ کھانے کا بریک ہوگا اسی وقت میں کھانا کھانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ ایک ایسا معاشرہ جہاں لوگ اپنی مرضی سے اپنے کھیت میں کام کرنے کی ایتکھس کو نارمل تصور کرتے ہونگے یقین مانیں انہیں ہمارے اداروں کا ورک ایتھکس انسانیت کی تذلیل محسوس ہوگا۔ اور یہ کوئی فرضی بات نہیں ہے، جو لوگ اپنا کاروبار کرتے ہیں وہ کسی کی نوکری کرنے کو بعینہٖ اس لئے پسند نہیں کرتے ہیں کہ انکے نزدیک یہ کسی کی غلامی کرنے مترادف ہوتا ہے جس سے انکی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ اگر پرانے دور کے اساتذہ ہماری یونیورسٹیوں کو دیکھ لیں تو ہمیں سخت برا بھلا کہیں کہ تم استاد کے پیشے کی تذلیل کروارہے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انڈسٹرئیلائزیشن کی ابتداء میں جب مل مالکان سروئیلئنس کی کوشش کرتے تھے تو مزدور اسے اپنی توھین سمجھ کر سخت خفا ہوتے تھے جبکہ آج کل ہر مزدور (بشمول اساتذہ) بخوشی اپنی سالانہ اپریزل رپورٹ بخوشی بھر کے دیتے ہیں، وہ بھی اس امید پر کہ شاید اس سبب ہمیں دوھرا انکریمنٹ مل جائے۔

چناچہ کہنے کا مقصد یہ کہ یہ سوال کہ "ایک لونڈی اس ساری صورتحال کے نتیجے میں کیسا محسوس کرتی ہوگی؟" اس کا جواب بیسویں اور اکیسویں صدی کی معاشرت کا باسی طے نہیں کرسکتا ہے ، اس کا جواب تو اس معاشرے کی لونڈی اور اس زمانے کے لوگ ہی بتا سکتے ہیں جن کو بنیاد بنا کر آج یہ تنقیدی کھیل کھیلا جارہا ہے۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب اس سوال کا جواب "ہم اپنے اصولوں کے تحت" طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ھمارے اس جواب کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع لونڈی بھی ایسی ہی تذلیل محسوس کرتی ہوگی جیسے آج ہم محسوس کرتے ہیں، لہذا جب تک یہ ابتدائی طور پر ـــہ فرض نہ کرلیا جائے کہ "ایسا ھونا تذلیل خالصتاً ہی ہے "۔

---

[55] **work ethics**۔

لہذا یہ مفروضہ عین ایسا ہی ہے جیسے ہماری حقوق نسواں کی تحریکات کی خواتین یہ کہتی ہیں کہ ہمارے معاشرے کی عام گھریلو خاتون کی زندگی پسماندہ اور پسی ہوئی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں خواتین کی عظیم ترین اکثریت ایسا نہیں سوچتی ہے۔

باندیوں کے کچھ احکامات اور بے حیائی کے تصورات:

یہ امر کچھ تفصیل طلب ہے، لہذا ذرا طوالت کے لئے معذرت۔ باندیوں سے متعلق سترکے بعض احکامات کو سمجھنے کے لئے اس پہلو کو مد نظر رکھنا چاہئے کہ "بے حیائی" اصلا ایک شرعی تصور ہے اگرچہ اسے پہچان سکنے کی بنیاد اللہ کی طرف سے انسان کی فطرت میں ودیت کردہ بھی ہے۔ بظاہر فی نفسہ ایک ہی فعل ایک شخص یا تناظر میں بے حیائی جبکہ دوسرے میں بے حیائی شمار نہیں ہوتا ہے اوراس فرق کی اصل بنیاد "فعل کی نوعیت" میں تبدیلی نہیں بلکہ "حکم اللہ" اور اس حکم کو قبول کرنے کے نتیجے میں نفس کے اندر پیدا ہونے والی کیفیت کی تبدیلی پر مبنی ہوتی ہے۔

مثلا مجامعت کا عمل غیر محرم منکوحہ سے ہو تو شرع کی نظر میں اس میں کوئی بے حیائی نہیں، اسی بنا پر اہل ایمان اس عمل میں کوئی بے حیائی محسوس نہیں کرتے ہیں ، لیکن اگر یہی عمل بغیر نکاح یا محرم کے ساتھ ہو تو قابل گرفت اور نفس پر شدید شنیع گزرتا ہے۔ اسی طرح ایک محرم خاتون گھر میں بسا اوقات بغیر دوپٹہ بھی ہمارے سامنے گھوم رہی ہوتی ہے، کام کاج کے دوران بعض اوقات اس کی کلائیاں بھی دکھائی دے رہی ہوتی ہیں لیکن ہم اسے بے حیائی نہیں سمجھتے ہیں، لیکن غیر محرم خواتین کے لئے ایسا عمل پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ تصورات کا یہ فرق بنیادی طور پر حکم اللہ اور اسے قبول کرکے استوار ہونے والی نفس کی کیفیات کی تبدیلی کی بنا پر مبنی ہے۔ پس اس سے یہاں معلوم ہوا کہ بے حیائی اصلا ایک شرعی تصور ہے، نفس میں موجود یہ صلاحیت کہ وہ کسی عمل کو بے حیائی سمجھ کر نفس کو اسے ترک کرنے کی ترغیب دے گی اس کا تعلق جہاں دیگر امور سے ہوسکتا ہے، وہاں حکم اللہ سے بھی ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ باندیوں سے متعلق بعض احکامات کو بے حیائی کے پیمانے پر جانچنے سے قبل یہ دیکھنا بھی لازم ہے کہ کیا شرع (نصوص) نے بھی انہیں اسی طرح بے حیائی قرار دیا ہے جیسا کہ عین اسی عمل کو آزاد غیر محرم خاتون کے لئے ناپسندیدہ کہا گیا ہے؟ اگر شرع نے ایسا نہیں کیا ہے تو بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نفس کی کیفیاتی تعمیر (جسے معیار بنا کر حکم کو جانچا جارہا ہے) میں حالات، معاشرت و اقدار کی تبدیلی کی وجہ سے شاید کچھ تنوع اور جھول واقع ہوگیا ہے۔ اس حوالے سے لازم نہیں کہ ہر معاشرت کا فرد اسے ایک ہی طرح دیکھتا رہا ہوگا۔ چنانچہ باندیوں کے حوالے سے بعض احکامات (مثلا یہ کہ ان کے ستر میں سر یا پنڈلیاں وغیرہ کیوں شامل نہیں) پر اس بنا پر اعتراض کرنا کہ "دیکھو جب ایک آزاد خاتون کے ستر میں یہ سب شامل ہے تو باندی کے کیوں نہیں ہیں؟" تو یہ سوال اپنی بنا میں کچھ ایسا ہی بیانیہ ہے کہ "دیکھو جب میری بہن یا ماں میرے سامنے بنا دوپٹہ گھوم سکتی ہے تو پڑوسی کی بہن یا ماں کیوں نہیں ایسے گھوم رہی ہیں ؟"

یہاں منطق کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ اس دلیل میں دراصل کیٹیگری مکس[56] کرنے کی غلط جاتی ہے، یعنی اگر محرم آزاد سے غیر محرم آزاد اور غیر محرم آزاد سے باندی کی کیٹیگری بدلنے

[56] **category mixing mistake-**

سے حکم اللہ بدلتا ہے تو لازم ہے کہ اس حکم الہی کو قبول کرنے والے نفس کے تصورات کی کیٹیگری بھی بدلنی چاہئے۔ سب معاملات کو ایک ہی کیٹیگری میں رکھ کر احکامات کا حلیم پکالینا، یہ درست طریقہ و تجزیہ نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوجانی چاہئے کہ چند لوگوں کے سامنے دو بول پڑھنے کے بعد بیوی کے ساتھ مجامعت کو بے حیائی کے دائرے سے نکال باہر کرنے والا عمل وہ دو بول نہیں ہیں بلکہ خدا کی عطا کردہ اجازت اور نفس کا اس پر راضی ہوجانا اصل حکمت ہے، لہذا باندی کے ساتھ مجامعت کے مبنی بر حق ہونے میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے،کیونکہ یہ ایک ریاستی و شرعی مالکانہ حق سے استفادہ کا نام ہے۔

<u>لونڈیوں کے متعلق بعض تفصیلات کا پس منظر:</u>

ماضٰ قدیم کے جس دور میں غلاموں کا ستر سمیت کوئی حق ہوتا ہی نہیں تھا ایسے دور میں اسلام نے غلاموں کے کچھ ذاتی اور معاشرتی حقوق متعین کئے تھے ۔ ماضی کی دیگر اقوام (بشمول ہیومن رائٹس کی چمپین اقوام) نے انھی محولہ بالا غلاموں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ آج سب پر ہی واضح ہے۔ البتہ یہ سب الگ بحثیں ہیں جو فی الوقت گفتگو کا اصل موضوع نہیں ہے۔ شرع میں آزاد لوگوں کے مقابلے میں غلاموں سے متعلق بہت سے احکامات میں جس بنا پر فرق روا رکھا گیا ہے ان میں سے اہم تر "تخفیف" اور "مجبور طبقے کی رعایت" کا اصول ہے۔ انسانی نفسیات سے واقف حضرات یہ جانتے ہیں کہ دشمن کے جو لوگ جنگ میں قیدی بن کے آتے ہیں انکا معاشرتی مقام کبھی دوسرے لوگوں کے مساوی نہیں ہوا کرتا ہے۔

لونڈیاں ان معاشروں میں جس قسم کی عمومی سروسز مہیا کرنے پر مامور ہوا کرتی تھیں اس کے پیش نظر ہی قرآن نے زنا کے معاملے میں ان کی سزا میں تخفیف کی ہے، کیونکہ معاشرتی طور پر زیادہ ایکسپوزڈ اور مجبور ہونے کی وجہ سےانکی بابت جنسی و جسمانی مسایل زیادہ وابستہ تھے لہذا ان سے ایسا گناہ ہونے کا خدشہ زیادہ تھا۔

اسی اصول کے پیش نظر شرع نے لونڈی کے ستر میں بھی تخفیف سے کام لیا ہے، ستر میں اس تخفیف کو سمجھنے کے لئے یہ ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ اس دور میں لونڈیاں بالعموم ادنی درجے کی خواتین سمجھی جاتی تھیں جن کی طرف لوگوں کی ایسی توجہ نہیں ہوتی تھی (مثلا سمجھنے کے لئے یوں کہ جیسے گھروں میں کام کرنے والی عام سی خدو خال والی خواتین)۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص جس نے کسی آزاد خاتون سے نکاح کیا ہو فقہاء اسے لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ یہ اس آزاد خاتون کے لئے باعث عار امر سمجھا جاتا تھا۔

تصور کیجئے کہ دیار غیر میں بھٹے پر کام کرنے والی کسی مجبور خاتون کو ستر و پردے کے ان احکامات کا پابند بنانے کی کوشش کتنی ممکن ہوسکتی ہے جو مؤمن آزاد خواتین کے لئے مشروع کئے گئے ہیں۔ پس لونڈیوں سے متعلق ان احکامات کو بیان کرنے کا مقصد اگر تو غامدی صاحب کے مؤقف کو قابل غور بتانا ہے ، جو شاید نہیں ہے ، تو پھر بھٹے پر کام کرنے والی مجبور و مقہور خواتین کے

احکامات میں تخفیف کا مسلہ شاید قابل غور نہ ہو مگر کالج و یونیورسٹیوں میں پڑھنے والی آزاد بچیوں کی ہو؟۔

بعض اقوال سے لوگوں نے یہ تصور قائم کرلیا ہے گویا لونڈیاں بس ناف سے گھٹنے تک ملبوس لباس میں آدھی ننگی بازار میں سر عام گھوما پھرا کرتی ہونگیں؟۔ اس مسلے کو ذرا مرد کے فقہی ستری مسلے سے تقابلہ کرکے دیکھیں تو کیا اصول موضوعہ کے تناظر میں کیا رائے قایم ہوگی،رائے یا حالات کے لحاظ سے کمتر اہلیت و قابلیت کیا زاید کی مامعت کرتی نظر آتی ہیں؟نہیں بلکہ نہیں دیکھیں جیسے فقہ میں مرد کا ستر ناف سے گھٹنے تک بیان کیا جاتا ہے مگر کیا ہمارے ارد گرد ہر طرف مرد کیسے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں کیا بازار گھروں کے ساتھ ساتھ ہماری مساجد سب مرد حجرات صرف اتنے ہی مختصر وقلیل لباس میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں؟ انسانی معاشرے بالعموم قانونی زبان میں بیان کردہ "کم از کم ایسا مطلوب جس کے بعد جرم و گناہ کی حد شروع ہوجاتی ہے" کے ارد گرد تشکیل نہیں پاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سرکاری قانون کہتا ہے کہ 33 فیصد نمبر لینے والا فلاں فلاں امتحان میں کامیاب تصور ہوگا،تو کیا تینتیس فیصد سے زاید اعداد ینے والا کیا فیل تسور کیا جائیگا کیونکہ اس نے کم از کم حد کی پیروی سے تجاوز کرکے صلاحیت و قابلیت میں اصراف سے کام لیا ہے ، فرض کریں مستقبل یا کسی دوسرے معاشرے کے نظام تعلیم میں کامیابی کا معیار یا طریقہ کچھ مختلف ہو اور اس کا باسی کہنے لگے "دیکھو یہ سب کے سب 33 نمبر لیا کرتے تھے"۔ جس طرح اس کا یہ تصور غلط ہے اسی طرح باندیوں سے متعلق کچھ احکامات سے قائم کیا جانے والا تصور بھی غلط ہے۔

ایک ایسا معاشرہ جہاں غلام اور لونڈی کے معاشرتی کردار و حیثیت ہم میں سے کسی نے دیکھی ہی نہیں ہے اور جس کا تصور کرنا بھی شاید ہمارے لئے بہت مشکل ہے، ایسے ماحول میں برادر عمار خان نے لونڈیوں سے متعلق بعض فقہی اقوال کو جس طرح بیان کیا ہے اس کے بعد آج کا جدید طبقہ آنکھیں بند کرکے یہ تصور باندھے بیٹھا ہے گویا "فنکاروں کے ایوارڈ" نامی کسی پروگرام یا "ماڈلنگ کے کسی شو" میں بالی وڈ کی حسین و جمیل ہیروئنز جیسی لونڈیاں فقہاء کے بیان کردہ ان قانونی احکامات کے مطابق کیٹ واک کرتی جیو ٹی وی پر نشر کی جارہی ہیں اور لوگ گھر بیٹھے اس سے محظوظ ہورہے ہیں،اب یہ نادر منطق بازی ان ماڈلوں کے حسن کے ساتھ ساتھ حسن معاشرت اور کاروباری سماجی رتبے کی مبادیات کو بھی ناگوار گزرینگی ،کہ ہماری بابت کیا خوب زبان طرازی کی جارہی ہے ،اب زرا نھی ماڈلوں کو ماضی میں لے جائیں اس دور کا سماج کس اصول و تناظر میں ایسی عورتوں کو کیا نام دیتا تھا،اس قیاس میں آپ خود آزادی سے غور و فکر کرکے خود ہی ہوشربا نتایج اخذ کریں ہم کو اس سے معاف فرمائیں:انکے جسم انکی مرضی آپکی سوچ آپکی مرضی؟ [57]۔

---

[57] **معج**

لونڈیوں کی خرید وفروخت کی بابت کچھ روایات کی تحقیق۔

از: تحقیق: مولانا علی عمران اور مولانا عبداللہ اعظمی

معلوم پڑا ہے کہ ایک غامدیانہ مقلد مفکر نے لونڈیوں کے متعلق اپنی بحث میں فقہاء، محدثین کرام اور صحابہء کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حوالے سے کچھ آثار اور احادیث کا حوالے پیش کئے تھے. ہماری ایک بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ عوام توعوم ہمارے خواص یعنی علماء کا بھی ہمارے معاشرے اور عرف میں حدیث کے ساتھ تعامل بہت کم و محدود نوعیت کا حامل رہا ہے، اس وجہ سے کچھ روایات سے ذہنوں میں الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں اور ہم نے کئی احباب کو پڑھا جو اس سبب نا صرف بدظن ہوئےبلکہ یہاں تک کہ صحابہ کرام کے بارے میں بھی عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے کی شکایات سامنے آنے لگیں ہیں۔

متعلقہ غامدی مفکر نے جن آثارکو اپنی دلیل کے طور پر ذکر کیا تھا، تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ ساری ہی ضعیف ہیں اور ان سے استدلال کرنا درست ہی نہیں ہے،اس پر مستزاد .اُن آثار معترضہ میں بنیادی طور پر کچھ باتیں وہ موجود تھیں، جن میں لونڈی کی پنڈلی یا بازو کو کھول کر دیکھنے کا ذکر ہے..ان آثار کی بھی سندی تحقیق آخر میں ذکر کردی جائیگی، تاہم یہ بات ملحوظ رہے کہ لونڈیوں اور غلاموں کا جو مقام شریعت نے بنیادی طور پر رکھا ہے اور آدمیت کے تمام تر احترام اور اکرام کے باوجود ان کی خرید وفروخت کو جس طرح جائز رکھا ہے،اور جس طرح ان کو ایک سے دوسرے کے مِلک میں جانے کو روا رکھا ہے، اس سے ان کا مال ہونا بہرحال بالکل واضح ہے اور اس سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں بنتی ہے ،عجیب بات ہے کہ "غلام کے مال میں "ہونے" پر حیرانی اس ذہن کو ہے جس کی سوشل پالیسی[58] کا اہم ترین ستون "انسانی سرمائے[59]" اضافہ کر رہا ہے۔

لہٰذا اس " مالیت " کے اعتبار سے دیکھا جائے، تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ہےکہ ان اعضاء کو دیکھا جائے، جبکہ نکاح کے لئے آزاد عورت کو بھی دیکھنے کی گنجائش بنتی ہے، اسی قسم کے امور لونڈی کے معاملے میں بھی ملتے ہیں مزید یہ عقود البیع یا انعقاد البیع جیسے کاروباری اجزا کا لونڈی میں بطور مال ہونے کے کل میں موجود ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے،لہٰذا یہ بات عین معقولی ہے کہ اس کی دوران خرید و فروخت اسکے مقاماتِ نظر بھی بنسبت آزاد عورت کے زیادہ ہوں جیسے

---

[58] **Social Policy.**

[59] **Human capital -**

پنڈلی دیکھنا، اسی طرح بازو دیکھنا یا سینے پر ہاتھ رکھنا نہ کہ پستانوں پر ہاتھ رکھنا ، ایسے امور عقلاً بھی جائز ہونے چاہیئں؟، تاکہ آزاد اور غلام کے فرق کا تعیین ہوسکے جیسے ہماری تحریروں سے اہل سنت ہونے اور غامدیانہ رجحان کے حامل ہونے کے امور آشکار ہوجاتے ہیں -

یوں اس قسم کے آثار اور فقہی روایات کے بارے میں مزید تفحص کی ضرورت اور حاجت نہیں پڑتی ہے، گو ہم نے آخر میں اس روایت کے بارے میں بھی تحقیق پیش کردی ہے اور اس کا ضعف بھی عیاں کردیا ہے،.
اس کے بعد کچھ آثار وہ ہیں، جن میں ان مواقع سے بڑھ کر کہیں زیادہ دیکھنے کا ذکر ہے. (شرم گاہ کی استثناء کے ساتھ)اس بارے میں غامدی مفکر نے حضرت علی رض کا اثر ذکر کیا ہے کہ :

"مصنف عبد الرزاق کے مذکورہ باب کی روایات کے مطابق حضرت علی سے لونڈی کی پنڈلی، پیٹ اور پیٹھ وغیرہ دیکھنے کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا " کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ لونڈی کی کوئی حرمت نہیں ہے وہ (بازار میں) اسی لیے تو کھڑی نظر آتی ہے کیونکہ ہم (دیکھ بھال کر) اس کا بھاو لگا سکیں؟"۔

اول تو عرض یہ ہے کہ اس کی سند ہی حقیقتاً بالکل واہی تباہی ہے، جس میں ایک وقت میں دو مجہول راوی ایک دوسرے سے روایت کررہے،پھر اس کی سند دیکھئے،اور اسے "بیان کرنے والوں " کی ثقاہت پر سر دھنئے:

13208 - آثارِ صحابہ:عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ: اَخْبَرَنِیْ مَنْ اُصَدِّقُ عَمَّنْ، سَمِعَ عَلِيًّا، يَسْاَلُ عَنِ الْاَمَةِ تُبَاعُ اَيَنْظُرُ اِلٰى سَاقِهَا، وَعَجُزِهَا، وَاِلٰى بَطْنِهَا؟. قَالَ: لَا بَاسَ بِذٰلِكَ، لَا حُرْمَةَ لَهَا، اِنَّمَا وَقَفَتْ لِنُسَاوِمَهَا

✵ ابن جریج بیان کرتے ہیں: مجھے اس شخص نے یہ بات بتائی ہے جسے میں سچا قرار دیتا ہوں اس نے اس شخص کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سنا کہ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ جب کوئی کنیز فروخت ہو رہی ہو تو کیا آدمی اس کی پنڈلی یا پشت یا پیٹ کو دیکھ سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے کنیزوں کی حرمت نہیں ہوتی ہے وہ اسی لئے کھڑی ہوتی ہیں تاکہ ہم ان کا بھاؤ طے کریں۔

عبـــدالرزاق[60] عـــن ابـــن جـــريج[61] قـــال اخبرنـــی مـــن اصـــدق عمـــن ســـمع علیـــاً
اس میں ابن جریج نے جس سے روایت کی ہے، اس کا ذکر نہیں کیا ہے : اوپر سے جس سے وہ خود روایت کررہا، وہ بذاتہ ایک مجہول شخص ہے..یہ بھی پتہ نہیں کہ مذکورہ راوی کونسا خارجی، رافضی یا معتزلی ہے...یہ اسناد مجاھیل سے تعلق رکھتی ہے، جس کو درست طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے ۔

ظلمـــــــــــــات بعضـــــــــــــہا فـــــــــــــوق بعـــــــــــــض
.اســی طــرح وہ تمــام اســانید جــن مــیں اس شــکل کــا ذکــر ہــے، مجاھیــل پــر مشــتمل ہــیں مثلاً اگلی سند : دیکھئے :

اقوالِ تابعین: عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ رَجُلٍ، عَنِ ابْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّهُ قَالَ: يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلٰى كُلِّ شَيْءٍ فِيهَا، مَا عَدَا فَرْجَهَا

✱✱ ابن جریج نے ایک شخص کے حوالے سے سعید بن مسیّب کا یہ قول نقل کیا ہے: آدمی کے لئے یہ بات جائز ہے کہ کنیز کی شرم گاہ کے علاوہ اس کے جسم کے کسی بھی حصے کا جائزہ لے۔

عبـــــدالرزاق[62] عـــــن ابـــــن جـــــریج، عـــــن رجـــــل عـــــن ابـــــن المســـــیب
سعید ابن المسیب نے کہا کہ لونڈی کو خریدنے کا ارادہ ہو تو شرم گاہ کے علاوہ اس کا سارا جسم "دیکھـــــــــــا جـــــــــــا ســـــــــــکتا ہـــــــــــے۔
اس میں ابن جریج اور ابن مسیب کے درمیان ایک مجہول آدمی "بیٹھا ہوا" ہے،جو ماعدا فرج کے جواز کا حکم "نشر" کررہا ہے:

اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا خداوندی دین ایسے مجاھیل سے نہیں لیا جاسکتا ہے:
اسی طرح مصنف میں اگلی روایت[63]

---

[60] **مصنف عبدالرزاق:۱۳۲۰۸**

[61] **ابن جریج ایک مدلس راوی ہیں:انھونے یہاں راوی اور سمع کو واضح نہیں کیا ہے:انکی صرف وہ روایت قابل اسناد و حجت ہیں جو وہ سمع کی صراحت سے واضح کریں یا انھیں شیخین،بخاری و مسلم نے صحیح اسناد سے متصل،مرفوع صراحت کے ساتھ پیش کیا ہو۔یہاں نا سند شیخین کی ہے بلکہ صراحت بھی نہیں ملتی ہے۔جبھی اسے تدلیساً منقطع سمجھنا چاہئے۔ڈاکٹر محمد علی جنید۔**

[62] **مصنف عبدالرزاق:۱۳۲۰۶**

[63] **ایضاً:۱۳۲۰۷**

اقوالِ تابعین: عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنِ الثَّوْرِيِّ، عَنْ جَابِرٍ، عَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ: إِذَا كَانَ الرَّجُلُ يَبْتَاعُ الْأَمَةَ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ إِلَى كُلِّهَا إِلَّا الْفَرْجَ

✱✱ امام شعبی فرماتے ہیں: جب کسی شخص نے کنیز خریدنی ہو تو وہ اس کنیز کی شرم گاہ کے علاوہ اس کے پورے جسم کو دیکھ سکتا ہے۔

میں عبدالرزاق عن الثوری عن جابر عن الشعبی....ہے "شعبی نے بھی کہا کہ شرم گاہ کے علاوہ اس کا سارا جسم دیکھا جا سکتا ہے۔" ..اس میں جابر جعفی ہے، جو کٹر شیعہ اور متہم بالکذب ہے..اور کذاب کی حدیث نہیں لی جاتی ہے سو وہ سارے آثار جن میں لونڈیوں کے جسم کے مختلف حصے دیکھنے کی بات مذکور ہیں، جیسے ..پیٹ، پیٹھ اور کمر وغیرہ..وہ ساری ضعیف اور ناقابل استدلال ہیں۔

اب کچھ اس اثر کا ذکرکرتے ہیں، جن میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے کہ وہ لونڈیوں کے جسم کے مختلف حصے دیکھ اور ٹٹول رہے ہیں یہ روایت بھی مصنف عبدالرزاق[64] سے ہی ہے:

آثارِ صحابہ: عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ نَافِعٍ، أَنَّ ابْنَ عُمَرَ: "كَانَ يَكْشِفُ عَنْ ظَهْرِهَا، وَبَطْنِهَا، وَسَاقِهَا، وَيَضَعُ يَدَهُ عَلَى عَجُزِهَا

✱✱ نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ بات نقل کی ہے: وہ کنیز کی پشت، پیٹ اور پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر دیکھتے تھے اور اپنا ہاتھ اس کی پشت پر رکھتے تھے۔

.. جن میں ان کے بقول ابن عمرؓ کے شاگرد بیان کرتے ہیں: سو یہ روایت ہے ان کے شاگرد نافع سے ..عبدالرزاق عن ابن جریج عن نافع "عبد اللہ بن عمر کے تلامذہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں جب کوئی لونڈی خریدنا ہوتی تو اس کی پیٹھ، پیٹ اور پنڈلیاں ننگی کر کے دیکھتے تھے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر دیکھتے تھے اور سینے پر پستانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر دیکھتے تھے۔" اس روایت سے استناد درست نہیں ہے، کیونکہ یہ معنعن ہے..ابن جریج اسے نافع سے عن کے صیغے کے ساتھ روایت کررہے اور عن کے صیغےسے روایت کردہ اثر میں عموماً بیچ میں براہ راست سماع نہیں ہوتا.بہت مرتبہ بیچ میں مجہول راوی ہوتے ہیں، جنکو اسناد میں سے ساقط کرکے روایت کی گئی ہوتی ہے۔

---

[64] ایضاً:۱۳۲۰۵۔

اور یہ تو معنعنِ ابن جریج ہے: وہی ابن جریج[65] جس کے بارے میں :

۱۔ امام احمد فرماتے ہیں، جب وہ قال فلاں، قال فلاں کہے اور اُخبرتُ کہے، تو وہ مناکیر بیان کرتا ہے[66].

۲۔ دارقطنی فرماتے ہیں کہ: ابن جریج کے تدلیس سے بچو،کیونکہ اس کی تدلیس سب سے بری ہوتی ہے،یہ اسی وقت تدلیس کرتا ہے، جب کسی مجروح راوی سے سماع کرتا ہے.

اور اس اثر میں ابن جریج یہی تدلیس کررہا ہے
لہذا اس بحث سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمر رض کیطرف پیٹ، پیٹھ اور سینہ وغیرہ کو کھولنے کی روایت کی نسبت درست نہیں ہے۔

اسی طرح وہ روایات[67] کہ جن میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمر رض جس لونڈی کو خریدنا چاہتے تھے، ان کے پیٹ کو دیکھا کرتے تھے اور اس پر ہاتھ رکھا کرتے تھے، وہ بھی ساری کی ساری مجروح اور متکلم فیہ ہیں.
مثلاً یہ سند دیکھئے:

آثارِ صحابہ: عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ عَطَاءٍ قَالَ: قُلْتُ لَهُ: الرَّجُلُ يَشْتَرِي الْأَمَةَ، أَيَنْظُرُ إِلَى سَاقَيْهَا، وَقَدْ حَاضَتْ، أَوْ إِلَى بَطْنِهَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ عَطَاءٌ: كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَضَعُ يَدَهُ بَيْنَ ثَدْيَيْهَا، وَيَنْظُرُ إِلَى بَطْنِهَا، وَيَنْظُرُ إِلَى سَاقَيْهَا، أَوْ يَأْمُرُ بِهِ

✵✵ ابن جریج نے عطاء کے بارے میں یہ بات نقل کی ہے: میں نے ان سے کہا: کوئی شخص کنیز خریدتا ہے' تو کیا اس کی پنڈلیاں دیکھ سکتا ہے یا اس کا پیٹ دیکھ سکتا ہے جبکہ وہ کنیز بالغ ہوچکی ہو؟ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! عطاء بیان کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسی کنیز کی چھاتیوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے وہ اس کے پیٹ کا جائزہ لیتے تھے اس کی پنڈلیاں دیکھتے تھے یا ایسا کرنے کا حکم دیتے تھے۔

---

[65] **بہ حیثیتِ مجموعی ابن جریج:عبدالملک بن عبدالعزیز مکی چھٹہ طبقہ کا ثقہ راوی ہے مگر مدلس ہے:امام بخاریؒ نے ان سے صحیح اور جز القراۃ سمیت کئی کتب احادیث میں روایات لی ہیں۔حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے التقریب میں اسے:ثقہ فقیہ الفاضل کہا ہے:التقریب:عدد:۴۱۹۳:لہذا یہ تدلیس کے سبب مشروط الصراحت راوی ہیں۔انھیں کامل ضعیف قرار دینا فرقہ پرستی کی آگ کا سبب ہے۔معج**

[66] **سیر اعلام النبلا:۳۲۹**

[67] **مصنف عبدالرزاق:۱۳۱۹۸**

مزے کی بات یہ ہے کہ ابن جریج کا عطاء سے روایت کرنا ہی ضعیف ہے.[68]

اسی طرح اگلا اثر [69] دیکھیں:

آثارِ صحابہ: اَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: اَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ: اَخْبَرَنِیْ عَمْرٌو - اَوْ اَبُو الزُّبَيْرِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ: " اَنَّهُ وَجَدَ تُجَّارًا مُجْتَمِعِينَ عَلٰى اَمَةٍ، فَكَشَفَ عَنْ بَعْضِ سَاقِهَا، وَوَضَعَ يَدَهُ عَلٰى بَطْنِهَا

** ابوزبیر نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ بات نقل کی ہے: جب وہ کچھ تاجروں کو کسی کنیز کے پاس اکٹھا دیکھتے تھے تو اس کی پنڈلی سے کپڑا ہٹا دیتے تھے اور اپنا ہاتھ اس کنیز کے پیٹ پر رکھ دیتے تھے۔

اس روایت کا حال یہ ہے کہ خود ابن جریج کو یا عبدالرزاق کو یہ تک یاد نہیں کہ مجھے یہ بات عمرو نے بتائی یا ابوالزبیر نےبتائی ہے؟ .جب راوی کی ہی تحدید نہ ہو سکتی ہو، تو روایت کا کیا درجہ ہوگا؟جبکہ یہ ابو الزبیر[70] خود ضعیف ہیں.

حال ان کا یہ ہے کہ:

نعیم بن حماد کہتے ہیں میں نے ہشام کو کہتے سنا ‘‘سمیت من ابی الزبیر ’’یہ سننا تھا کہ شعبہ نے میری کتاب چھینی اور اسے پھاڑ دیا[71].

---

[68] تہذیب التہذیب: ۴۰۶/۶

[69] مصنف عبدالرزاق: ۱۳۱۹۹

[70] محمد بن مسلم بن تدرس ابو زبیر اسدی مکی:یہ چھٹہ طبقہ کے صدوق بلتدلیس راوی ہیں:تقریب التہذیب: ۶۲۹۱:معج

یہ مسند ابو حنیفہؒ کی اکثر روایتوں کے بلکہ جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے اکثر روایتوں کے راوی ہیں،انکی روایتیں شرو ط کے ساتھ قبول کی جاتی ہیں،لہذا یہ مقبول راوی ہیں،مقبول راوی کی روایت علت و شذوذ یا سقم کے سبب ضعیف ہوسکتی ہیں ،جبھی روایت کا ضعیف ہونا اور راوی کا ضعیف ہونا الگ الگ شہ ہیں جبھی صاحب تحریر کا انکو ضعیف کہنا نقل پر اعتماد اور اصول حدیث و اسما الرجال سے عدم واقفیت کی علامت ہے۔معج

[71] تہذیب الکمال

ابن حجرؒ نے اسے مدلسین کی طبقہء ثالثہ میں شمار کیا ہے،اور طبقہء ثالثہ کے مدلسین جب تک اپنے راوی کی تصریح نہ کریں، تب تک ان کی روایت کو نہیں لیا جائیگا۔

اب یہاں مجاہدؒ کی روایت رہتی ہے، جس میں ہے کہ ابن عمرؓ نے لونڈی کی پنڈلیاں ننگی کرائیں یا سینے کے درمیان ہاتھ رکھا تھا: یہ ان روایات کی قبیل سے ہے، جسکا اپنا مضمونویسے تو کسی امرِ شنیع کا حامل نہیں ہے،تاہم اسنادی اعتبار سے یہ روایت بھی ضعیف ہے.

کیونکہ اس کی سند میں ابن نجیح ہے، جس کو ابن حجر رح نے طبقہء ثالثہ میں رکھا ہے.اور طبقہء ثالثہ کے مدلسین کا حکم ابھی بیان کردیا کہ جب تک اپنے راوی کو بیان نہ کریں، تب تک ان کی روایت نہیں لی جائیگی،اور اس روایت میں یہی ہے الفاظ دیکھئے:

"عبدالرزاق، عن ابن عیینہ قال اخبرنی ابن ابی نجیح عن مجاہد، یعنی ابن نجیح اپنے راوی کی تصریح نہیں کررہاہے ،کیونکہ عن کے ساتھ جو روایت ہوتی ہے، اس میں تعیین مشکل سے ہوتا ہے کیونکہ راوی کی شناخٹ کا مسلہ درپیش ہوتا ہے کہ راوی کون ہے یا تدلیس ہوئی ہے،گویا ابن نجیح یہاں تدلیس کررہا اور اس وجہ سے اس کی روایت نہیں لی جائیگی۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے بارے میں جتنی بھی محولہ الدلیل روایات موجود ہیں ، ان میں جہاں باندی کو چھونے کا ذکر ہے ان کی اسنادی حیثیت تو یوں ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ہے. سب یا تو ضعیف ہیں یا پھر معلول ہیں، لہذا وہ قابل استدلال نہیں ہیں .دوسری طرف غیر محرم کو چھونے پر وعید صراحتا موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان ضعیف احادیث پر اعتبار نہیں کیا جا سکتاہے۔

کیونکہ باندی کو جب تک خریدا نہ جائے تو اس سے انتفاع جائز نہیں ہوتاہے .بہرحال علی سبیل التسلیم باندیوں کے بارے میں یہ اصول ذہن میں رہنا چاہیے کہ ان کے معاملے میں یہ اصول ہے "قد یباح فی الامۃ ما لا یباح فی الحرۃ"، لہذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ باندیوں کا معاملہ صحابہ کے زمانے میں بہت عام تھا اس کے باوجود خرید و فروخت کے بارے میں انہیں چھو کر ٹٹولنا کسی اور صحابی سے اس طرح مروی نہیں ہے حالانکہ اس کا مروی ہونا تو عام ہونا چاہیے تھا چناچہ ایک صحابی کے بارے میں ضعیف روایات پر مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی ہے۔

باقی جہاں تک معاملہ ہے حضرت عمر رض کے حکم کا، تو عرض ہے کہ یہ ان کا سیاسی فیصلہ تھا، بطور حاکم...مقصود لونڈی اور آزاد عورت کے درمیان فرق ملحوظ رکھنا تھا،لہذا اس مسئلے کو وقت کے مصالح کے اعتبار سے دیکھا جائیگا، نہ کہ حکمِ شرعی کے طور پر۔ روایت میں بھی یہی وجہ بیان کی گئی ہے۔

مصنف عبد الرزاق وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے انس رضی اللہ عنہ کے خاندان کی ایک لونڈی کو سر ڈھانپے ہوئے دیکھا تو اس کو درہ لگایا اور کہا کہ او کمینی! سر کو ننگا رکھو اور آزاد عورتوں کے مشابہ بننے کی کوشش نہ کرو۔

علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نور الایضاح کی شرح مراقی الفلاح کے حاشیہ پہ رقمطراز ہیں کہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ باندی کے لئے گھونگھٹ کرنا مکروہ ہے لیکن یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے اعتبار سے ہے جہاں تک ہمارے زمانہ کی بات ہے تو باندی کے لئے گھونگھٹ کرنا ضروری ہے [72]۔

علامہ طحطاوی کی یہ عبارت اعلاء السنن میں بھی مذکور ہے ،علامہ طحطاوی کی یہ بات موید بالقرائن معلوم ہوتی ہے:

۱۔عورتوں کا نماز پڑھنا مسجد میں کہ اس کو فتنہ کہ بناء پہ ترک کردیاگیا تو جب عورتوں کی مسجد میں نماز پر اصرار صحیح نہیں ہے تو اس پر بھی اصرار کرنا بھی درست نہ ہونا چاہئے۔

۲۔ فقہ میں مسئلہ مذکور ہے کہ :محارم کے جن اعضاء کا دیکھنا جائز ہے اگر ان کے دیکھنے سے شہوت پیدا ہوجائے تو ان کا بھی دیکھنا جائز نہیں ہوگا اور اسی طرح فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کوئی محرم غلط قسم کا ہو تو اس سے پردہ کرنا چاہیے تو جب محارم کے اعضاء کا شہوت کی بناء پہ دیکھنا ناجائز ہے تو پھر یہ زمانہ جس میں بے حیائی اور ہتک محارم کا یہ حال ہے کہ الامان والحفیظ ساس اور ماں کی عزتیں تک غیر محفوظ ہیں تو فقہ کے مشہور اصول "ان کثیرا من الاحکام تختلف باختلاف الزمان " سے امام طحطاوی رحمہ اللہ کی یہ بات بدرجہ اولی درست معلوم ہوتی ہے کہ فی زماننا ھذا باندی پر بھی مکمل پردہ عائد کیا جائے اور یہ بات علامہ طحطاوی نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے کہی ہے تو ہمارا زمانہ تو اور پر فتن ہے۔

الحاصل یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم آزاد عورتوں سے تشبہ سے بچنے کے لئے دیا تھا اور چونکہ آپ رضی اللہ عنہ کا زمانہ خیر القرون کا تھا اور فتنہ کا ویسے اندیشہ نہ تھا جیسا آج درپیش ہے اور ہمارا زمانہ چونکہ فتن کا دور ہے لہذا فقہ کے مشہور اصول " ان کثیرا من الاحکام تختلف باختلاف الزمان " کہ بہت سے احکام زمان کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں کی بناء پہ بقول امام طحطاوی رحمہ اللہ باندی پہ مکمل پردہ لازم ہونا چاہئے۔

---

[72] **طحطاوی علی مراقی الفلاح: صہ: 140**

جہاں تک معاملہ ہے فقہاء کے اقوال کا تو:
عرض کیا جاتا ہے کہ فقہاء کسی حکم کو پہلے قرآن میں دیکھتے ہیں کہ کہاں کہاں پر اس معاملے میں کیا ہدایات ہیں،پھر مختلف احادیث میں دیکھتے ہیں۔ تب اس سارے مطالعے اور مشاہدے کے بعد اپنے فہم اور نورِ بصیرت کی بنیاد پر قرآن وحدیث میں مذکور حکم کی بنیاد پر اصول کی تخریج کرتے ہیں.

اس کے بعد جو مسئلہ آتا ہے، اسے ان اصولوں کی روشنی میں حل کرتے ہیں،ایسے ہی فقہاء نےلونڈیوں کے معاملے میں دو اصول نکالے ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ چونکہ ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور مِلک بنا کرتی ہیں، لہذا یہ مال ہے، اور ان پر مال ہونے کے تمام احکامات بھی لاگو ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسری اصل یہ ہے کہ یہ زندہ انسان ہیں،ان کے پاس وہ سب کچھ ہے، جو کسی بھی آزاد انسان کے پاس ہے، ہاں مگر یہ پابند ہیں
اب معاملہ یوں معلوم پڑتا کہ جس فقیہ نے ''مال '' ہونے کی اصل کو ترجیح دی، اس نے پھر اسی کے موافق دیکھنے، پرکھنے اور چھونے کی اجازت دی ہے ، جبکہ دوسری طرف جس فقیہہ کے سامنے اس کنیز کی نسوانیت کا پہلو غالب رہا ہے، اس نے اس سے منع ہی کیا ہے
اب یہاں امت کا اجتماعی ضمیر فیصلہ کرسکتا ہے کہ کس فقیہ کی بات لی جائے اور کس کی چھوڑ دی جائے.، اور امت کی روایت اور ثقافت کی تاریخ بھی اس پر دال کرتی ہے، کہ نسوانیت کا پہلو ہی عموماً غالب رہا ہے،اسی وجہ سے تاریخ ایسے واقعات کے وقوع کے متعلق عموماً خاموش معلوم پڑتی ہے۔

اسلام میں لونڈی ،غلام اور جنسی تعلقات سے متعلق ایک بحث

از:-----------------------

جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ غلامی کا مسلہ زمانہ جدید میں کئی تنقیدوں اور مباحث کا سبب رہا ہے چناچہ

اسلام میں لونڈی اور غلامی سے متعلقہ موضوع پر چار بنیادی سوالات عموماً پائے جاتے ہیں:
جو عامتہ الناس و خاص کا اذہان میں موجود پائے جاسکتے ہیں:

۱۔ اسلام کے ابتدائی دور میں غلامی کا کیا اخلاقی جواز تھا؟
۲۔ لونڈی سے مباشرت کا کیا اخلاقی جواز ہے؟
۳۔ آج کے دور میں غلامی کا کیا جواز ہے؟
۴۔ اسلام نے غلامی کو مکمل طور پر ختم کیوں نہیں کیا جبکہ امریکہ نے کیا؟

۱۔ اسلام کے ابتدائی دور میں غلامی کا اخلاقی جواز:

۱۔ ہمیں تاریخ و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں غلامی پائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ غلام بھی پائے جاتے تھے،مگر اتنا واضح رہے کہ اسلام نے اس چلن کو شروع نہیں کیا تھا، لیکن اسلام نے اس کو محدود و مقید کرنے کی موثر کوشش کی تھی چناچہ یہاں پر اس اعتبار سے پابندی لگادی کے آئیندہ ریاستی دایرہ کار میں صرف جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاسکے گا، تو یہاں پر اگر کسی قسم کا اعتراض ممکن ہوسکتا ہے تو صرف اس اعتبار سے ممکن ہوسکتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو کیوں غلام بنایا جائے؟

اب بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کہیں پر جنگ ہو اور اسلام کے اعتبار سے وہ جنگ جائز ہو تو قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک روا کیا جائے؟

اس بارے میں مندرجہ ذیل امکانات ہیں:

۱،قیدیوں کو قتل کردیا جائے، اسلام میں یہ منع ہے، ہوسکتا ہے کہ کچھ خاص قیدیوں کو کسی مصلحت کی وجہ سے قتل کیا جائے۔ لیکن عمومی اعتبار سے قیدیوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔قیدیوں کو فدیہ دے کر رہا کردیا جائے، یہ کرنا جائز ہے، اگر اس بات کو خدشہ ہو کہ یہ قیدی رہا ہو کر پھر دوبارہ جمع ہوکر مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے تو پھر یہ ایک غلط حکمت علمی تصور ہوگی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی جان و مال خطرے میں پڑ جائے گی۔

۳۔انہیں قیدیوں کے تبادلے میں رہا کردیا جائے، یہ بھی جائز ہے اور یہ ایک طرح سےقسم دویم کی ہی ایک توسیع ہوگی ۔

۴۔ان پر احسان کرکے ان لوگوں کو یوں ہی رہا کردیا جائے۔

۵۔ یا تو ذمی بنا کر مسلم معاشرے کا ایک فرد بنادیا جائے یا اپنے علاقے میں جانے کی اجازت دی جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پر وہی خدشہ ہے کہ جو کہ میں نے قسم دویم میں بیان کیا ہے، اس صورت میں ایک اور خدشہ یہ تھا کہ اگر کفار کو یہ معلوم ہوجائے کہ مسلمان جنگی قیدیوں کو یوں ہی رہا کرتے ہیں تو وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے معاملے اور زیادہ جری اور بے خوف ہوسکتے تھے، اور بلاشبہ یہ مسلمانوں کو اور انکی غیر حربی آبادی کو اور زیادہ خطرے میں ڈالنے والی بات ہوسکتی تھی۔

۶۔انہیں غلام بناکر اسلامی معاشرے کے تیسرے درجے کا شہری بنا دیا جائے۔

۷۔غلاموں کو انفرادی ملکیت میں دے کر ان کے مالک کو اختیار دیا جائے کہ مکاتبہ کر کے یا احسان کر کے انہیں رہا کردیا جائے۔

۸۔ یا پھر مالک کو یہ بھی اختیار ہو کہ انہیں غلام ہی بنا کر رکھے یا دوسروں کو بیچ دے۔ اس سے ان کی آزادی چھین لی جاتی ہے، لیکن دھیرے دھیرے دب کر یہ اسلامی معاشرتی ڈھانچے کا حصہ بن جاتے ہیں۔

۹۔ انہیں ساری عمر قیدی بنا کر رکھا جائے۔ اس طرح انسانوں کی ایک بڑی تعداد بے کار اور ان پروڈکٹیو ہوجاتی ہے، ایسے لوگ مسلم معاشرے پر ایک معاشی بوجھ بن جاتے۔ ایک انسان کو پورے معاشرے سے کاٹنا ایک غیر انسانی سلوک ہے۔

ہم محسوس کوتے ہیں کہ قرآنی احکامات کے مطابق پہلا اور آخری آپشن اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے یعنی عمومی طور پر قتل کرنا یا عمر قید کرنا جائز نہیں ہے۔(جبکہ باقی اقوام میں یہی دو آپشن اختیار کیے جاتے رہے اور کیے جاتے ہیں) اسلامی شوری کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ باقی امکانات کی جو بھی ممکنہ صورت ہو اسے اختیار کرے۔

اس پوری صورت حال میں ایک بات ذہن میں رکھنی ہے کہ اوپر مذکورہ لوگ وہ مجرم ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی اور اگر وہ جیت جاتے تو اس بات کو پورا امکان تھا کہ مسلمان قیدیوں کو قتل کرتے یا انہیں غلام بناتے،اور ہمارے مخالفین ان حربی لوگوں کی حمایت پر اسلام اور ہم پر اعتراض دایر کر رہے ہیں جنھونے جب بھی ماضی تا حال موقع ملا مسلمانوں کے ساتھ خون بہانے اور عمدہ اخلاقی رویہ کی ادائیگی میں صرف ظلم ہی روا رکھا ہے،صلیبیوں نے جو رویہ مسلم آبادی و قیدیوں لے ساتھ اختیار کیا اسکا یورپ و عیسائی دنیا کو بھی اعتراف ہے اور مسلمانوں نے جو

طرز سلوک حسن معاشرت ا ضمن میں ظاہر کی اسکا بھی انکو اعتراف ہے اور عصر حاضر کی جنگوں ،مسلم گروہوں سے یورپی امریکی قوتوں کے تصادم میں جو ہوا جیسے بگرم قید خانے سے گونٹانا بے کے قید خانے تک غلامانہ سفاکانہ رویہ اختیار کیا گیا وہ بھی سامنے ہے لہذا کوئی پاگل ریاست و مذہب ہی خود کو آگ میں جھونکنے کو انسانیت مانے گی۔[73]

ویسے مسلمانوں کی شوریٰ ان تمام امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کرسکتی ہے کہ ۲ ،۳، ۴ ، ۵ میں سے جو بھی چاہے صورت اختیار کرسکتی ہے۔ اب ان مذکورہ امکانات کو دیکھ کر کوئی ہمیں بتائے کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا کیوں غلط ہے۔ ویسے اس میں ایک انتہائی حیرت انگیز چیز بھی ہے۔ جن لوگوں کو غلامی پر اعتراض ہے ان لوگوں کو عمر قید پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ گویا کہ ان کو لگتا کہ کسی کو چار بائی چار کے کمرے میں پوری زندگی پابندرکھنا غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے۔ ہے نا حیرت کی بات؟؟ حالانکہ ایک اسلامی معاشرہ ایک غلام کو باقاعدہ فیملی لائف گزارنے کا ماحول فراہم کرتا ہے۔ ایک صاحب نے یہ سوال پوچھا تھا کہ "جو چیز ایک انسان اپنے لئے گوارا نہیں کرتا اسے کسی دوسرے انسان کے لئے کیسے گوارا کرے ؟" عرض ہے کہ جناب آپ خود بتائیں کہ اگر میں خدا نہ خواستہ جنگی قیدی بن گیا تو کیا کوئی یہ پوچھے گا کہ میں کس چیز کو گوارا کرتا ہوں؟؟ جب ایک بندہ جنگ میں حصہ لے ہی رہا ہے تو اسے پتہ ہے کیا کیا نتائج بھگتنے کے امکانات ہے اور وہ جان کر ہی اس جنگ میں حصہ لے رہا ہوتا ہے۔ تو ایسے میں میرا گورار کرنا اور نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

۲۔ لونڈی سے مباشرت کا اخلاقی جواز کیا ہے:

میں اس بحث کو دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔

۱۔ قرونِ اولیٰ میں لونڈی سے مباشرت کا اخلاقی جواز۔
۲۔عصر حاضر میں لونڈی سے مباشرت کا اخلاق جواز۔

میں فی الحال قرون اولی والی بحث کی طرف آتا ہوں، موجودہ دور سے متعلق بحث اس تیسرے نکتے کہ آج کے دور میں غلامی کا کیا جواز ہے'پر بحث کرنے کے بعد کروں گا۔ یہ معاملہ تھوڑا بہت حساس نوعیت کا حامل ہے یا موجودہ دور کے ذہن کی تربیت کچھ ایسی ہوئی ہے کہ یہ حساس بن گیا ہے ورنہ پہلے یہ سرے سے کوئی اعتراض سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ ''ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ متعلقہ بحث اور اسکے ماحول کو انھی اصول اور ادوار کے تناظر میں دیکھا جاتا جس دور سے بحث کا تعلق تھا ،مگر جدید خود ساختہ اخلاقیات تاریخ سے لیکر اخلاق تک کو مفروضات

---

[73] معج

اور عصر حاضر کی معقلولیات کی روشنی میں دیکھنے پرکھنے کی عادی ہے جبھی اسی تناظر کو سامنے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے''[74]۔

یہاں بحث میں چونکہ معاملہ جنسی ملاپ سے متعلق ہے اس لئے کچھ باتیں کھل کر کرنی ضروری ہوجاتی ہیں اور نہ کرنے کی صورت میں بہت ساروں کے ذہن میں اُٹھنے والے سوالات تشنہ رہ جائیں گے۔

صحیح تجزیہ کرنے کے لئے پہلے اس نکتہ پر بحث کرتے ہیں کہ مختلف تہذیبوں میں عورت اور مرد کے جنسی ملاپ کے کیا کیا اخلاقی جوازات رہے ہیں اور لونڈی سے جنسی ملاپ ان اخلاقی جوازات کے تناظر میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔؟جنسی ملاپ کے ویسے تو بہت سارے شرائط یا جواز ہوسکتے ہیں، لیکن دو چیزیں بالکل ہی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:

١۔ شادی یا نکاح۔
٢۔ آپسی رضامندی۔

<u>١۔ شادی:</u>

یہ تو معلوم بات ہے کہ معاشرتی، قانونی اور مذہبی منظوری کے لئے جو لفظ عام طور مشہور ہے وہ نکاح یا شادی ہے۔ ایک مرد اور عورت جب شادی کرتے ہیں تو گویا کہ وہ پورے معاشرے میں اعلان کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے میاں بیوی ہیں اور ان کے جنسی ملاپ کے حق کو پورا معاشرہ، میاں بیوی کے رشتہ دار، حکومت اور مذہب تسلیم کرتا ہے۔ اور عورت کا جو بچہ ہوگا اس کے بارے میں تسلیم کیا جائے گا کہ وہ اس کے میاں کا بچہ ہے اور اس بچے کی کفالت کی ذمہ داری اس کے میاں کی ہوگی۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس پر تقریباً دنیا کی تمام تہذیوں میں اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔ یعنی یہ اتفاق پہلے روز سے پایا جاتا تھامگر آج کے دور میں مغربی تہذیب نے اس کے معنی ومفہوم آج مکمل طور پر بدل کررکھ دئے ہیں۔

چونکہ آج کے مغرب میں جنسی میل و ملاپ کے لئے معاشرتی اور مذہبی منظوری ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے، اور قانون کی طرف سے اس ضمن میں وہاں آج سرے سے کوئی پابندی عاید نہیں ہے۔ لہذا مغرب میں شادی کے بغیر بھی جنسی ملاپ کو جائز سمجھا جاتا ہے، شادی کا مطلب وہاں پر یہ ہوتا ہے کہ جو شخص شادی کرلے وہ صرف اپنے پارٹنر کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرسکتا ہے، اسے کسی اور دوسرے فرد کے ساتھ جنسی ملاپ کی اجازت نہیں ہوتی ہے،اسکے مقابل شادی شدہ نہ ہونے کی صورت میں اسے جس سے چاہے جنسی ملاپ کی آزادی ہوتی ہے۔

پرانی تہذیبوں میں، آج کے مشرق میں اور خاص طور پر اسلام کے معاملے میں یہ معاملہ مکمل طور پر الٹا ہے، یہاں پر جنسی ملاپ بغیر شادی کے جائز ہی نہیں سمجھی جاتی ہے، اور شادی کے بعد

[74] معج

اسے جنسی ملاپ کا لائسنس مل سکتا ہے لیکن صرف ؒاُسی کے ساتھ جس سے اسکا نکاح ہوا ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے شادی کا مطلب ہی مغرب اور اسلام میں شروع سے آخر تک الگ الگ رہا ہے، اسلام میں شادی کے ذریعے ایک پابندی ہٹا کر جنسی ملاپ کی شریعی آزادی دی جاتی ہے، اور یہ آزادی صرف ان کے درمیان قایم ہوگی جو آپس میں شادی شدہ ہوتے ہیں، یعنی مکمل پابندی سے ایک یا زیادہ سے زیادہ چار کی پابندی لاگو ہوتی ہے، مغرب میں شادی سے پہلے ہر قسم کی جنسی آزادی ہوتی ہے، لیکن شادی کے ذریعے اس کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک سے جنسی ملاپ قائم کرے، یعنی یہاں اس پر لامحدود سے صرف ایک سے جنسی تعلق کی قانونی پابندی اس پر ڈالدی جاتی ہے۔

شادی کے بارے میں تشریحات میں بنیادی طور پر تین اداروں کا ذکر آتا ہے، معاشرہ، حکومت اور مذہب۔ عام طور پر یہ شادی کے بارے میں یہ تینوں ادارے ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ان کے درمیان کچھ امور پر فکری تنازعہ و اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً لڑکی کی شادی کی عمر پر یہ تینوں ادارے متفق نہیں ہوتے ہیں ، کزن میریج کے ضمن مین کچھ تہذیبوں میں یہ تینوں ادارے خاص طور پر مذہب اور حکومت باہم متفق نہیں ہوتے ہیں ، بھارت میں ایک کونسپٹ پایا جاتا ہے جسے گوتر کہتے ہیں جو کہ وہاں پر خاندانوں کی تقسیم کا ایک نظام ہے، بھارتی قانون ایک ہی گوتر کے لڑکا لڑکی کے درمیان شادی کی اجازت دیتا ہے لیکن ہندو معاشرہ اسے قبول نہیں کرتا ہے،ایسے ہی ہندو معاشرے میں محرموں کی اولادوں جیسے چچا،ماموں،خالاوں،پھپیوں کی اولادوں کے مابین نکاح ممنوع سمجھا جاتا ہے ۔

ایک دین کو ماننے والے فرد یا معاشرے کے لئے خدا کا حکم اور اس کی اجازت فائنل آتھارٹی ہوتی ہے۔ یعنی، معاشرہ جو چاہے کرے یا حکومت جیسا چاہے زبردستی قانون نافذ کرے، بہرحال اگر یہ شادی و تعلق خدا کے حکم کے مطابق جایز ہے تو پھر جنسی تعلق کا اخلاقی جواز تسلیم کیا جاتا ہے ورنہ نہیں۔ ہاں خواہ مخواہ کے تنازعوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ حکومتی قانون اسلام کے مطابق بنایا جائے تاکہ اسلام پر بھی عمل ہو اور قانون کی بھی مخالفت نہ ہوسکے۔

‘‘اب یہاں اس بحث میں لونڈی سے مباشرت کا معاملہ لیتے ہیں،اب جب اسلام لونڈی اور آقا کے درمیان جنسی ملاپ کی منظوری دے رہا ہے اور جب اس پر قرآن و دیگر مذاہب کی کتب سماوی واضح ہیں ، تو پھر اعتراض کی بنیاد کیا بنتی ہے؟کیونکہ جس طرح مابعد الطبیعاتی جدید علمیت نے یہ جواز تخلیق کرکے انسانیت کے دیوتا سے اسکا جواز غیر اخلاقی ثابت کیا ہے تو ویسے ہی اسی انسان اور اسے اضافیت شدہ انسانیتی تصور کے خالق خدا نے بھی اسی مابعد الطبیعاتی سماواتی شرعی اخلاقیت سے اسکا جواز تسلیم کیا ہے تو ترجیع مابعد الطبیعاتی بنیاد پر کس کی مانی جائیگی؟،اضافیت شدہ علمیتی فکر انسانیت کی یا اسکے اصل خالق اور کل عالم و مکائینات کے مالک کی جسکی خدائی و حکم کا تو اکثر جدید الفکر طبقہ بھی منکر نہیں ہے ؟’’[75]

---

[75] معج

چناچہ عین جس طرح میاں بیوی کے درمیان جنسی ملاپ کا اخلاقی جواز موجود ہے بالکل ہی اسی طرح لونڈی اور آقا کے درمیان اخلاقی جواز بھی موجود ہے،جسکو تاریخی اعتبار سے حکومت اور معاشرہ بھی منظور کر رہا تھا اور مذہب بھی کر رہا ہے،اس لئے یہاں پر اس اعتراض کی بنیاد پوری طرح سے ڈہ جاتی ہے۔

۲۔ باہمی آپسی رضامندی:

اب رہ جاتا ہے رضامندی والا اعتراض، مغربی معاشرے میں کسی بھی چیز کے صحیح یا غلط ہونے میں رضامندی کے عنصر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

جیسا کہ اوپر واضح ہوگیا پرانی تہذیبوں میں اور آج اس رضامندی کے نظریے کو مغرب میں کونسٹ[76] کہتے ہیں ویسے ہی مشرقی تہذیبوں میں اور خصوصاً اسلام میں جنسی ملاپ کے اخلاقی جواز کے لئے نکاح یا شادی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن آج کے مغربی معاشرے یا جن علاقوں میں مغربی تہذیب کو پوری طرح قبول کیا گیا ہے وہاں پر جنسی ملاپ کے جواز کے لئے شادی کے بجائے اہمیت کونسنٹ آف کپلز[77] بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس معاملے میں شادی کی سرے سے کوئی خاص نہیں ہے،''اسے بس قانونی معاہدے کے پیرائے میں اہم جانا جاتا ہے،مگر قدغن زدہ مہنگا بوجھ بھی تصور کیا جاتا ہے جو فرد کی آزادی کو محدود کرنے کا سبب بنتا نظر آتا ہے''[78]۔

ہمیں کافی حد تک لونڈی سے جنسی ملاپ کو اسی فرق کے تناظر میں بھی دیکھنا چاہئے،لہذا بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلام کو اپنے کسی عمومی و مخصوص اصول کے لئے ایک مغرب کے عقیدے کو کیوں تسلیم کرنے کی ضرورت ہے؟
اس معاملے ایک اور بنیادی سوال ذہن میں آتا ہےکہ نکاح کے معاملے میں باقاعدہ ایجاب و قبول ہوتا ہے، لیکن لونڈی بنانے کے معاملے میں یہ امر سرانجام نہیں دیا جاتا ہے،میرا ذاتی خیال ہے کہ لونڈی کے معاملے میں بھی ایک طرح سے ایسا ہی کیا جاتا ہے۔

ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک عورت دو طرح سے لونڈی بن سکتی ہے:

۱۔ ایک یہ کہ وہ باقاعدہ جنگ میں حصہ لے رہی ہو اور جنگ کے دوران مسلمانوں کی قیدی بن گئی ہو۔ اور جب وہ جنگ میں حصہ لے رہی تھی تو اسے اس امر کا پتہ تھا کہ اگر وہ قید ہوگی تو لونڈی بنائے جانے کا پورا امکان موجود ہے۔ اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو شکست ہوئی اور مسلمان عورتوں کو قید کیا گیا تو اس بات کی بہت کچھ گنجائش ہے کہ مسلمان عورتوں کو بھی لونڈی بنایا جائے گا۔ وہ جب جنگ میں حصہ لے رہی تھی تو وہ اس پوری انڈرسٹینڈنگ کے ساتھ میں فوج کا

---

[76] **Consent-**

[77] **Consent of couples.**

[78] **معج**

حصہ بنی ہوئی تھی، اگر اس کو پکڑے جانے کی صورت میں لونڈی نہیں بننا تھا تو اس کے پاس پورا آپشن موجود تھا کہ وہ لونڈی نہ بنے یعنی جنگ میں حصہ نہ لے۔ جب لونڈی بننے کے ایک پورے پراسس کا حصہ خود اپنی مرضی سے بن چکی ہے تو پھر یہ کہنا ہے کہ اس کی مرضی نہیں تھی کا کیا مطلب بنتا ہے؟

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ میں پورا قبیلہ ملوث تھا اور جنگ کے نتیجے میں پورا قبیلہ بکھر گیا اور عورتوں اور بچوں کا نگران کوئی باقی نہیں رہا تھا۔اور اُس دور میں ایسی صورت حال میں عورت کا پاس کوئی اور چوائس ہوتی ہی نہیں تھی۔ اگر ان عورتوں کو ایسے ہی رحم دلی سے نظر انداز کر کے چھوڑ دیا جاتا تو اس بات کا امکان بحرحال اس دور کے تناظر میں پر قوی موجود تھا کہ انہں کوئی اور قبیلہ غلام اور لونڈی بنالیگا یا پھر بصورت مجبوری وہ عورتیں خود طوائف بن کر زندگی گزار لینے پر مجبور کی جاتی ہونگیں۔ اور پھر جب وہ خود لونڈی بن گئی اور انہیں پتہ ہے کہ ملکیت میں آنے کے بعد ان کا کوئی اختیار باقی نہیں بچتا ہے تو جس معاشرتی جبر میں وہ رہتی ہے وہاں پر رضامندی یا کونسنٹ خود سے درون خانہ خود میں دبا دبا پیدا ہوجاتا تھا اور اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اب جنسی معاملے میں کونسنٹ کی پوری حقیقت کو سمجھانے کے لئے میں یہاں پر کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں جس سے پتہ چلے گا کہ لونڈی کے معاملے میں کونسنٹ ایک غیر اہم مسئلہ ہے:

۱۔ مغربی یا مشرقی معاشرے میں ایک عورت اپنی معاشی ضرورت پوری کرنے کے لئے طوائف کا پیشہ اختیار کرتی ہے۔ اس نے اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کی وجہ سے طوائف کے پیشے کو اختیار کیا ہوتا ہے۔ وہ ہر روز ایک نئے مرد کے ساتھ سوتی ہے اور اس کا مقصد جنسی لذت حاصل کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ مرد کو خوش کر کے پیسے کمانا ہوتا ہے، کیا یہاں پر کونسنٹ پایا جاتا ہے؟

۲۔ایک جوان عورت زیادہ عمر والے مالدار مرد سے شادی کرتی ہے،جیسا کہ یورپ میں یہ چلن مشرق سے زیادہ عام ہے مقصد اس مرد کے پیسے سے فائدہ اُٹھانا ہوتا ہے،زیادہ تر اس عورت کو اس مرد سے اغلباً جنسی تعلق قائم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اس مرد کی جنسی خواہش پوری نہ کرنے کی صورت میں جو مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے اس کے پیش نظر وہ مجبوری میں اس کے ہر جنسی مطالبہ کو پوری کرتی ہے، کیا یہاں پر کونسنٹ پایا جاتا ہے؟

۳۔مشرقی معاشرے میں کچھ خاص حالات کی وجہ سے ایک لڑکے اور لڑکی کی شادی ہوجاتی ہے لڑکی کو لڑکے سے کوئی خاص لگاؤ بھی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ شادی ہوچکی ہے اور طلاق کی صورت میں کئی قسم کی سماجی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہے اس لئے وہ لڑکی اپنے ناپسندیدہ شوہر کے جنسی مطالبات کو مجبوری میں تسلیم کر لیتی ہے اور اس کے بچوں کی ماں بھی بن جاتی ہے، کیا یہاں پر بھی کونسنٹ پایا جاتا ہے؟

۴۔ایک مغربی معاشرے میں لڑکے لڑکی کی دوستی ہوجاتی ہے جس کو بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کہا جاتا ہے۔ لڑکی صرف دوستی رکھنا چاہتی ہے اور ابھی جنسی تعلق کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہے۔ لیکن لڑکا جنسی تعلق کا مطالبہ کر رہا ہوتاہے، انکار کی صورت میں بریک اپ یعنی دوستی ٹوٹنے کا پورا امکان ہوتا ہے، نتیجتاً لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے مطالبے کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ کیا یہاں پر کونسنٹ پایا جاتا ہے؟

۵۔ایک بیوی ہے جو کہ اپنے شوہر سے محبت بھی کرتی ہے اور اس کی خواہشات کا احترام کرتی ہے اور اس سے جنسی تعلق قائم کرنا پسند بھی کرتی ہے، لیکن مرد کی جنسی طلب عورت سے زیادہ ہے اس لئے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرد جنسی ملاپ کا مطالبہ کرتا ہے لیکن عورت کا "موڈ" نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود عورت صرف اپنے شوہر کی خاطر اس کے مطالبے کو تسلیم کر لیتی ہے کیا یہاں پر کونسنٹ پایا جاتا ہے؟

۶۔ایک مسلمان دین دار عورت اپنے شوہر کے جنسی مطالبے کو صرف اس وجہ سے تسلیم کرتی ہے کیوں کہ بلاوجہ شوہر کو انکار کرنے کی صورت میں فرشتے اس پر لعنت کریں گے۔ کیا یہاں پر کونسٹ پایا جاتا ہے؟

ان تمام مثالوں میں آپ دیکھتے ہیں کہ کونسنٹ کتنی غیر حقیقی اور غیر متعین شئے ہے ، میں نے ہر سوال کے آخر میں ایک سوال پوچھا ہے کہ آیا یہاں پر کوئی کونسٹ یا زبانی کلامی اقرار نامہ پایا جاتا ہے یا نہیں؟۔ میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے، اگر ان مثالوں میں کونسنٹ پایا جاتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ معاشی ضرورت، سماجی مجبوری، نفسیادی دباؤ اور مذہبی اصول ایک عورت کے اندر خود سے خاص کونسنٹ پیدا کرتے ہے۔ کونسنٹ فی نفسہ درون خانہ پیدا ہونا والی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کا بیرون ہے جو کونسنٹ پیدا کرتا ہے، جب ایک عورت لونڈی بنتی ہے اور جب اس کو خود معاشرتی اور سیاسی حالات کا پتہ ہوتا ہے تو اس کے حالات خود اس کے اندر کونسنٹ پیدا کر لیتے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سب غلط ہے اور یہاں پر کوئی کونسنٹ نہیں پایا جاتا ہے تو مغرب کے اصول کے مطابق، پہلی، دوسری اور چوتھی صورت مغرب میں بالکل جائز اور عام ہے۔ تو پھر ماننا پڑے گا کہ مغرب میں بھی کونسنٹ ایک غیر ضروری چیز گردانی جاتی ہے، اب ذرا صورت حال دیکھیں۔ ایک عورت ہے جو کہ کسی صورت حال کی وجہ سے لونڈی بن گئی ہے۔ اسے پتہ ہے کہ وہ آزاد نہیں ہے۔ اسے پتہ ہے کہ جس معاشرے میں وہ رہ رہی ہے وہاں پر آقا کا اپنی لونڈی سے مباشرت کرنا قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے یہ بھی پتہ ہے کہ مزاحمت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اور اسے یہ بھی پتہ ہے کہ(مسلم معاشرے میں) آقا کا اس کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کی صورت میں وہ اپنے آقا کی بیوی کا شیر حاصل کر رہی ہے اور بچہ ہونے کی صورت میں اسے بیچا نہیں جاسکتا ہے[79]۔

اور ذرا سیاسی پس منظر بھی ملاحظہ فرمائیں کہ اس عورت کو یہ بھی پتہ ہے کہ جس ماحول میں وہ رہ رہی ہے وہاں پر جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانا قابل قبول ہے اور اگر اس کے اپنے قبیلہ،والے،خاندان والے زندہ موجود ہوتے تو اس کا اپنا شوہر بھی ایک آدھ لونڈی گھر لے آتا جسے اسے اس دور کی معاشرت و تمدن کے لحاظ سے تسلیم کرنا ہوتا تھا،بلکہ اس دور میں عورت بھی لونڈی و غلام خرید کر مالک بنتی دیکھی گئی ہے اور ،اسے لونڈی و غلام تحفے،اور جہیز مین بھی

---

[79] اولاد پیدا کرنے والی لونڈی ام الولد کہلاتی ہے اور چونکہ اسکی اولاد مالک کی وارث ہوتی ہے جبھی وہ اسکا ترکہ ہوتی ہے،دوسرا اولاد پر والدین کی ذمہ داری نافذ ہوتی ہے،عین جیسے والدین پر اسکی ذمہ داری نافذ ہوتی ہے،لہذا اسے بیچا نہیں جاسکتا ہے۔معج

دئے جاتے تھے،اور وہ خود بھی انھیں خدمت کے لئے خریدا کرتی تھی یا اپنے شوہر کو ہبہ کردیا کرتی تھی۔

اس پورے منظر کو سامنے رکھتے ہوئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر کونسنٹ کا مسئلہ پیدا ہی کہاں ہوتا ہے؟ کیا ایسا ہوتا ہے کہ لونڈی سے جنسی ملاپ کرتے ہوئے مرد اس کا ہاتھ پاؤں باندھتا ہے یا دو چار ہٹے کٹے مردوں کو اندر لے کر جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کو مضبوطی سے پکڑے رکھے؟تاکہ وہ جنسی عمل سر انجام دے سکے ،یقین مانیں ایسا قطعی نہیں ہوتا ہے،حالات اور معاشرہ اس کے اندر خود سے کونسنٹ پیدا کرتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح اوپر کی مثالوں میں یہ کونسنٹ پیدا ہوجاتا ہے۔

۳۔ آج کے دور میں غلامی جواز کیا ہے؟

اصولی طور پر قانون تو ایک ہی ہے چاہے وہ زمانہ قدیم کا ہو یا آج کے دور کا ہو،لیکن علمی صورت حال اس سے کافی مختلف ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات واضح ہو کہ لونڈی یا غلام بنانا دین کا کوئی باقاعدہ حکم نہیں ہے۔(جنگ کے بعد اگر لوگ قید ہوکر آئیں تو) مسلمان حکمرانوں کو باہم مشورے سے اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو اس چیز کو اختیار کریں یا نا کریں اس لیے جب کسی خاص موقعے پر قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانا ضروری ہوجاتا ہے تو پھر یہ کوئی مسئلہ متنازعہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا کہ اس بات کا فیصلہ حکمران قوتیں پہلے بھی مسلمانوں کے مجموعی فائدے اور نقصان کی بنیاد پر کیا کرتی تھیں۔ اگر آج کے دور میں کسی جنگ میں کافر قیدی ہاتھ آئیں تو بھی بہت زیادہ امکان یہی ہے کہ مسلمان حکمران ان کو غلام نہیں بنائیں گے خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ مسلمان قیدیوں کو غلام بنائے جانے کا امکان بھی نہیں ہو[80]۔

اقوام متحدہ کا ایک قانون ہے جسے جنیوا کنونشن کہتے ہیں، یہ فوجی قیدیوں، شہری قیدیوں اور جنگی زخمیوں کے ساتھ سلوک کرنے کے کچھ اصول ہیں جن کا اطلاق سب پر ہوتا ہے، یہ گویا کہ تمام ممبر ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ جب ایک مسلم ملک اس معاہدے پر دستخط کرچکا ہے اور جب اس معاہدے کی بنا پر اس کے قیدیوں کو بھی فائدہ ہورہا ہے تو ایسے میں اس کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ وہ اس معاہدے کی خلاف ورزی کرے، اس لئے اُس ملک کے لئے عملاً یہ ناجائز ہوگا کہ وہ قیدیوں کو غلام بنائے اگرچہ کہ اسلام کا قانون اپنی جگہ پر جوں کا توں رہے گا۔

ایسی جنگ جس میں باقاعدہ کسی ملک کی فوجیں شرکت نہیں کرتی ہیں بلکہ غیر منظم فوجیں ہوں جنہیں آج کل دہشت گرد کہا جاتا ہے تو ان پر جنیو کنونشن لاگو نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ فوجیں جن پر جنیوا کنونشن لاگو نہیں ہوتا ہے اگر وہ کسی دشمن ملک کے جنگی قیدیوں کو غلام بنالیں تو اس میں

---

[80] **لیکین عصر حاضر میں سب سے زیادہ جنگی قیدیوں،یا دہشت گردوں کے روپ میں ہم مسلمانوں کو ہی دیکھتے ہیں بھلے انھیں ہم غلام کے لفظ سے موسوم نا بھی کریں۔معج**

کوئی اخلاقی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔ عملاً تو صورت حال یہ ہے کہ آج کی دنیا کا کوئی مہذب ترین ملک جنہیں دہشت قرار دیتا ہے اس کے لئے وہ کسی بھی قانون و ضابطے کو نہیں مانتا ہے۔

اس بارے میں ایک اور چیز کا خیال رکھنا ضروری ہوگاکہ جب جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنایا جاتا ہے تو مسلم معاشرہ انہیں اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سچ مچ آج کے مسلم معاشرے اس ابلاغی دور میں غلام اور لونڈیوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں اس سے بہت سارے خاندانی مسائل پیدا ہوجائیں؟اگر مسلم حکمران اس قسم کا کوئی خدشہ محسوس کریں تو انہیں غلام بنانے سے احتراز کرنے کا پورا حق ہے۔

ان باتوں سے تو یہ واضح ہوگیا ہے کہ قانونی اجازت ہونے کے باوجود اس پر عمل فی الحال معطل رہے گا اور اس قانون کو معطل رکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں پائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کل کو عالمی حالات ایسے پلٹ جائیں کہ مسلم حکمران محسوس کریں کہ قیدیوں کو غلام بنانا ہی اس وقت مناسب ترین آپشن ہے تو اس پر عمل بھی ہوسکتا ہے، یہیں سے اس سوال کا بھی جواب ملتا ہے کہ آج کے دور میں لونڈی سے مباشرت کی کیا گنجائش ہے۔ میں پھر اس بات کو دہرانا پسند کرونگا کہ کل ہو یا آج غلام اور لونڈی کا رکھنا کوئی دین کا باقاعدہ حکم نہیں ہے، بلکہ ایک اجازت ہے جس پر جبھی عمل ہوسکتا ہے جب اس دور کی سیاست اور معاشرت اس عمل سے مناسبت رکھتی ہو۔ اور اگر کبھی ایسا دور آیا کہ جب غلام رکھنے کا عمل اس دور کی سیاست اور معاشرت سے مناسبت رکھے تو پھر یہ ماحول اس لونڈی کے اندر بھی کونسنٹ پیدا کردیتا ہے۔

۴۔ اسلام نے غلامی کو مکمل طور پر ختم کیوں نہیں کیا جیسا کہ امریکہ و یورپ نے کیا تھا؟:

بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اسلام نے اس غلامی کو ختم کردیا تھا جس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں بچتا تھا اور صرف اس غلامی کے جواز کو باقی رکھا تھا جس کا اخلاقی جواز بنتا تھا جیسا کہ پہلے پؤائنٹ میں لکھا جاچکا ہے۔ امریکہ میں جو غلام تھے ان کی غلامی کا سرے سے کوئی اخلاقی جواز نہیں بنتا تھا اور اس بارے میں امریکہ یا پورا مغرب اپنی بنائی ہوئی غلامی کے جواز دینے کے موڈ میں بالکل نظر نہیں آتے ہیں۔ ماضی قریب میں افریقیوں پر حملہ صرف غلام بنانے کی نیت سے ہی ہوتا تھا اور ان کو جانوروں کی طرح پکڑ کر پنجرے میں ڈال کر جہازوں میں بٹھا کر باقاعدہ غلامی کے لئے ہی لے جایا جاتا تھا۔

اسلام میں غلاموں کو آزاد کرنے کا باقاعدہ نظام صدیوں سے شرعی بنیادوں پر موجود تھا جو کہ علمی طور پر نافذ تھا جس کی وجہ سے غلام جو کہ مسلم معاشرے میں جذب ہوچکے ہوتے تھے بتدریج آزاد ہوتے رہتے تھےجبکہ مغرب میں ایسا کوئی شرعی ،قانونی ،ریاستی نظام موجود نہیں تھا۔

اگر اسلام نے تمام غلاموں کو بیک وقت آزاد کرنے کا حکم دیا ہوتا تو بہت سارے معاشرتی اور معاشی مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔ لہذا امریکہ میں جب یک قلم غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم نافذ ہوا تو آج تک

اس کا جھٹکا امریکہ میں محسوس کیا جارہا ہے،پھر اس کے نتیجے میں لنکن کے دور میں شمال و جنوبی ریاستی اتحادوں میں خانہ جنگی کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا تھا،جس کی بڑی تباہ کاریاں اور خون کاریاں تاریخ امریکہ میں معروف ہیں ۔

اس یکدم فیصلے سے آزاد کرنے کے عمل کی وجہ سے آج بھی امریکہ کی جیلیں کالوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی وجہ صرف یہ ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے کے بعد معاشرے کے لئے آسان نہیں تھا کہ اتنی بڑی آزاد انسانوں کی اخلاقی تربیت کے لئے کوئی انتظام کر سکے، اس کی وجہ سے آج بھی امریکہ میں کالے زیادہ تر غریب اور زیادہ مجرم گروہ کا حصہ تصور کئے جاتے ہیں،انکی برابری کا حق،ملکیت،تعلیم،روزگار اور سیاست میں حصہ لینے کا حق۔ جنگ عظیم اول و دویم کے درمیاں کسی حد تک انکی مطلوبہ سرمایہ دارانہ نظام مین شرکت کی بنیاد پر تسلیم کرنا پڑا تھا جبکہ اس کے برخلاف مسلمانوں میں جو غلاموں کو آزاد کرنے کا نظام بنا اس کی وجہ سے ایک نسل کے بعد غلام اور آزاد کا فرق ہی کافی حد تک مٹ گیا تھا۔

الغرض امریکہ کا غلاموں کو آزاد کرنا مکمل طور پر ایک دوسرا ہی پہلو رکھتا ہے جو کہ ان کے تاریخی مجرمانہ کردار کو چھپانے کی ایک کوشش ہے،اور اسکا جو معاشی پہلو تھا اس پر مارکس و اینجلز سمیت انکی مقلد اشتراکی قیادت اپنی کئی تحریروں میں تنقید پیش کرچکی ہے،صاحب مطالعہ ان امور سے ناواقف نہیں ہیں، المختصر آخری کلمہ یہی پیش ہے کہ اسلام نے غلامی کی جو اجازت باقی رکھی اس کے لئے اسلام کے پاس اخلاقی جواز موجود ہے ،جو مستقبل کی تہذیبی و ثقافتی کشمکش ،جنگ و جدل میں کوئی معقولی کردار ادا کرنے کی رعایت کو پیش کرنے کے قابل ہوسکے گا۔

غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق اعتراضات اور انکا رد

از:-------------------------------

معلوم پڑتا ہے کہ قدیم زمانے میں غلام تین طرح کے ہوا کرتے تھے:

۱۔ ایک جنگی قیدی۔

۲۔ دوسرے آزاد آدمی جن کو پکڑ پکڑ کر غلام بنایا اور بیچ ڈالا جاتا تھا۔

۳۔تیسرے وہ جو انکی نسلوں سے غلام پیدا ہوتے چلے آہے تھے۔

اور عموماً اسکا کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کے آباء و اجداد کب سے غلام بنائے گئے تھے اور دونوں قسموں میں سے کس قسم کے غلام ہوا کرتے تھے۔ اور اسلام جب آیا تو عرب اور بیرون عرب دنیا بھر کا معاشرہ ان تمام اقسام کے غلاموں سے بھرا ہوا تھا اور سارا معاشی و معاشرتی نظام مزدوروں اور نوکروں سے زیادہ ان غلاموں کے سہارے چل رہا تھا،مسلمانوں کے سامنے دینی و اخلاقی طور پر ایک سوال یہ بھی درپیش تھا کہ یہ غلام جو پہلے سے چلے آ رہے ہیں ان کا کیا کیا جائے،اور دوسرا سوال یہ تھا کہ آئندہ کے لیے غلامی کے مسئلے کا حل کیا ممکن ہے؟۔

''پہلے سوال کے جواب کو حل کرنے کے لئے اسلام نے حکمت و تدریج سے کام لیا کیونکہ یہاں معاملہ ملکیت کے ساتھ ساتھ گھریلو نجی حیات سے بھی وابستہ تھا،اور دوسری طرف بیرون خانہ تجارت و بیرونی خدمات بھی اس سے وابستہ تھیں لہٰذا اسے سود و شراب نوشی کے امور کی طرح مختصر تدریج کے ساتھ ختم کرنا بھی ممکن نہیں تھا الٹا اسکا ایک دوسرا جنگی بین الاقوامی پہلو بھی موجود تھا ،جسکے سبب دشمنان اسلام کو تو مسلمانوں کو غلام و کنیز بنا کر بیچنے،انھٰں قید رکھنے اور انکے اوپر جبر کا جواز مل سکتا تھا ،مگر وہ خود اسلام کی رعایت کے سبب کبھی نا غلام بنائے جاسکتے تھے اور الٹا انھیں اسلام کے اخلاقی نظام کے نئے نئے تازہ تازہ ہونے کے سبب مسلمانوں سے اسکے معطل و منسوخ ہونے کی توقع بھی نا تھی ۔

لہٰذا اس میں اسلام اور اسکے پیروکار مسلمانوں کا تو مسلسل نقصان ہوتا مگر اہل فارس،اہل روم کا فایدہ ہی فایدہ رہتا ،مگر درون ریاست ملکی و مقامی قوانین کی رو سے یہ عمل ناٖذ کردیا گیا کہ عرب مسلمانوں کو جو آزاد ہیں انکو نا ہی شرعاً غلام بنانا جایز ہے اور جو مسلمان غلام ہیں اور کسی کی ملکیت میں ہیں کے لئے خاص حقوق مقرر کردی گئے،اور مختلیف شرعی،سزاووں اور کفاروں میں نبی ﷺ نے غلاموں کو آزاد کرنا مقرر کردیا تھا،پھر ساتھ میں نبی اکرمؐ نے اس رواج کو عام کیا کہ غلاموں سے مکاتبت کرنے کا چلن عام کیا جائے تاکہ وہ خود کما کر اپنی معاہدہ شدہ رقم کو ادا کرکے خود غلامی کی قید سے آزاد کرالیں۔

ساتھ ساتھ ولا کا مسلہ طے کردیا کہ ولا اسے ملے گی جو اسے آزاد کریگا اور وہ اسی کے قبیلہ و خاندان سے مستقبل میں کسی نا کسی طرح وابستہ رہے گا،پھر اس لونڈی کو جو مالک کے بچے کی

ماں ہوگی کو مالک کی موت کے بعد آزادی کا پروانہ مل گیا تھا،اس دور کی دنیا قدیم و جدید میں یہ چلن ،آزادی و رعایت اسلام کےسوا کسی نے اس سے قبل و بعد عطا نہیں کی تھی،اسکے سبب ایسے اوقات تاریخ عالم نے اپنے چشم وا سے دیکھے جب انہی غلاموں اور انکی نسلوں سے بڑے بڑے تابعی اور تبع تابعین ،محدثین اور فہقا کرام پیدا ہوئے، جبکہ یہی غلام حکومتوں تک میں شریک و حاکم قرار پانے لگے''[81]۔

اسلام نے یہ نہیں کیا کہ یکلخت قدیم زمانے کے تمام غلاموں پر سے لوگوں کے حقوق ملکیت ساقط کر دیتا، کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ پورا معاشرتی و معاشی نظام مفلوج ہو جاتا بلکہ عرب کو امریکہ کی خانہ جنگی سے بھی بدرجہا زیادہ سخت تباہ کن خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑتا اور پھر بھی اصل مسئلہ حل نہ ہوتا جس طرح امریکہ میں حل نہیں ہوسکا تھا ۔

اس احمقانہ طریقِ اصلاح کو چھوڑ کر اسلام نے فَکّ رَقَبَہ کی ایک زبردست اخلاقی تحریک شروع کی اور تلقین و ترغیب، مذہبی احکام اور ملکی قوانین کے ذریعے سے لوگوں کو اس بات پر ابھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے طوعاً غلاموں کو آزاد کریں، یا اپنے قصوروں کے کفارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انہیں رہا کردیں، یا پھرمالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیں۔ اس تحریک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اندازاً 63 غلام آزاد کیے تھے، آپ کی بیویوں میں سے صرف ایک بیوی حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد 67 تھی۔ حضور کے چچا حضرت عباسؓ نے اپنی زندگی میں 70 غلاموں کو آزاد کیا تھا۔ حکیم بن حزامؓ نے 100، عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار، ذوالکلاع حمیریؓ نے آٹھ ہزار اور عبدالرحمٰن بن عوف نے تیس ہزار کو رہائی بخشی تھی۔ ایسے ہی واقعات دوسرے صحابہ کی زندگی میں بھی ملتے ہیں جن میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے نام بہت ممتاز ہیں جو مسلسل غلام آزاد کرتے رہتے تھے اور انکی آزادی میں انکی امداد کیا کرتے تھے۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ کثرت سے خود اپنے غلام بھی آزاد کردیتے تھے اور دوسروں سے بھی غلام خرید خرید کر آزاد کرتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں تک سابق دور کے غلاموں کا تعلق ہے، وہ خلفائے راشدین کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب کے سب رہا ہو چکے تھے۔

اب رہ گیا آئندہ کا مسئلہ۔ اس کے لیے اسلام نے غلامی کی اس شکل کو تو قطعی حرام اور قانوناً مسدود کر دیا کہ کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنایا اور بیچا اور خریدا جائے اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

''جو شخص کسی آزاد کو پکڑ کر بیچے گا اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی بنوں گا[82]''

البتہ جنگی قیدیوں سے متعلق اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں گے ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے گا یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے گا یا دشمن کے مسلمان قیدیوں سے ان کا مبادلہ کر لیا جائے گا لیکن اگر یونہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ

---

[81] **معج**

[82] **بخاری**

وصول نہ ہوسکے اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی رضا مند نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انہیں غلام بنا کر رکھیں۔

البتہ اس قسم کے غلاموں کے ساتھ انتہائ حسن سلوک اور رحمت و رأفت کے برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے، ان کی تعلیم و تربیت دینے اور انہیں سوسائٹی کے عمدہ افراد بنانے کی ہدایت کی گئ ہے اور مختلف صورتیں ان کی رہائ کے لیے پیدا کی گئ ہیں۔ ان غلاموں کے لیے ایک طرف اس امر کا موقع کھلا رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے مالکوں سے مکاتبت (معاہدہ) کر کے رہائ حاصل کر لیں اور دوسری طرف وہ تمام ہدایات ان کے بارے میں موجود رہیں جو قدیم غلاموں کے بارے میں تھیں کہ نیکی کا کام سمجھ کر رضائے الٰہی کے لیے انہیں آزاد کیا جائے، یا گناہوں کے کفارے میں ان کو آزادی بخش دی جائے۔

یا کوئ شخص اپنی زندگی تک اپنے غلام کو غلام رکھے اور بعد کے لیے وصیت کر دے کہ اس کے مرتے ہی وہ آزاد ہو جائے گا (جسے اسلامی فقہ کی اصطلاح میں تدبیر اور ایسے غلام کو مدبر کہتے ہیں) یا کوئ شخص اپنی لونڈی سے تمتع کرے اور اس کے ہاں اولاد ہو جائے اس صورت میں مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی خواہ مالک نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ یہ حل ہے جو اسلام نے غلامی کے مسئلے کا کیا ہے۔ معترضین اس کو سمجھے بغیر اعتراضات جڑدیتے ہیں اور معذرت پیشہ حضرات اس کی معذرتیں پیش کرتے کرتے آخر اس امر واقع کا ہی انکار کر بیٹھتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھا تھا۔

غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق چند آیات و آثار سے متعلقہ علمی اشکالات اور انکا حل[83]

ابوالاعلیٰ مودودیؒ[84]

اکثر علماء لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع کے جواز میں آیت ذیل پیش کرتے ہیں : اور کئی سوالات پیدا کرتے ہیں آپکا اس بابت کیا موقف ہے؟

إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ[85]

سوائے اپنی بیویوں کے یا ان باندیوں کے جو ان کے ہاتھوں کی مملوک ہیں، بیشک (احکامِ شریعت کے مطابق ان کے پاس جانے سے) ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔

۱۔ لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع محض شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلاَّ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كِتَابَ اللّهِ عَلَيْكُمْ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَلِكُمْ أَن تَبْتَغُواْ بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً وَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا[86]۔

اور شوہر والی عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) سوائے ان (کافروں کی قیدی عورتوں) کے جو تمہاری مِلک میں آ جائیں، (ان احکامِ حرمت کو) اللہ نے تم پر فرض کر دیا ہے، اور ان کے سوا (سب عورتیں) تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں تاکہ تم اپنے اموال کے ذریعے طلبِ نکاح کرو پاک دامن رہتے ہوئے نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے، پھر ان میں سے جن سے تم نے اس (مال) کے عوض فائدہ اٹھایا ہے انہیں ان کا مقرر شدہ مَہر ادا کر دو، اور تم پر اس مال کے بارے میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم مَہر مقرر کرنے کے بعد باہم رضا مند ہو جاؤ، بیشک اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

---

[83] یہ تحریر مولانا کی تنقیحات میں خاکسار کو ڈھونڈھنے سے بھی اس عنوان سے نہیں ملی ہے اور نا اسکا کوئی حصہ دویم خاکسار کے علم کے مطابق موجود ہے،باقی،تفہمات،کے چاروں حصوں،رسایل و مسایل میں بھی اس عنوان سے کوئی تحریر نہیں ملی ہے،شاید درون خانہ کسی اور عنوان میں اسکو شمول کیا گیا ہو، ہاں رسایل و مسایل جلد سویم میں اس آیتِ مذکورہ کے ذیل میں لونڈی کی مختصر بحث ضرور میسر آتی ہے :رسایل و مسایل:حصہ سویم:صہ:۶۲ تا ۶۵۔

[84] مسئلہ غلامی ،تنقیحات حصہ دوم،

[85] المومنون: ۶

[86] النساء: ۲۴

۲۔ اسی طرح اگر ملکیت کی بناء پر مالک کو حقِ وطی حاصل ہو جاتا ہے تو ایک غلام کی مالکہ جو غیر شادی شدہ ہو اس کو بھی اپنے غلام سے استفادہ کا موقع حاصل ہونا چاہیے[87]، مخلوط نسل کی پیدائش کو روکنے کے لیے وہ مانعات حمل استعمال کرسکتی ہے۔

غیر مسلم محارب قومیں اگر گرفتار شدہ مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں تو عقلاً اس کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کا کیا حق ہے؟
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور بے لوث زندگی بالخصوص عالمِ شباب میں خانگی زندگی بہترین مثال ہے، یہ کہاں تک صحیح ہے کہ آخری عمر میں جب کہ متعدد ازواج مطہرات موجود تھیں آپ نے بھی لونڈیوں سے تمتع کیا تھا[88]؟

۳۔ اگر ملکیت سے حق وطی حاصل ہوتا ہے تو آیت ذیل:

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلاً أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مِّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلاَ مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَأَن تَصْبِرُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ[89]

اور تم میں سے جو کوئی (اتنی) استطاعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو ان مسلمان کنیزوں سے نکاح کر لے جو (شرعاً) تمہاری ملکیت میں ہیں، اور اللہ تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو خوب جانتا ہے، تم (سب) ایک دوسرے کی جنس میں سے ہی ہو، پس ان (کنیزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور انہیں ان کے مَہر حسبِ دستور ادا کرو درآنحالیکہ وہ (عفت قائم رکھتے ہوئے) قیدِ نکاح میں آنے والی ہوں نہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ درپردہ آشنائی کرنے والی ہوں، پس جب وہ نکاح کے حصار میں آ جائیں پھر اگر بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی آدھی سزا لازم ہے جو آزاد (کنواری) عورتوں کے لئے (مقرر) ہے، یہ اجازت اس شخص کے

---

87 استفسار کرنے والا خالی لبرل ہی نہیں ہے بلکہ نسائیت سے بھی متاثر نظر آتا ہے،اور عورت مارچ والیوں کی طرح پدر سری نظام کے خلاف بھی ہے اور اس ساتھ کی مبادیات سے بھی ناواقف نظر آتا ہے۔معج

88 صاحب استفسار کی مضطرب الدماغی اور ذہنی کم فہمی کا ثبوت انکے سوالت بہ حیثیت المجموع ہیں ہی مگر ساتھ میں وہ ایک طرف نبی ؐ کی ذات و حیات کو مشعل ہدایت مانتا ہے، پھر اسی پر بعد میں اعتراض جھڑ دیتا ہے ،پھر تیسری طرف اس مقدمہ کی صداقت کو مشکوک بنا دیتا ہے کہ ازواج کی موجودگی میں بھی آپ نے نے کنیز سے کیسے تمتع کرلیا تھ؟ا،حلانکہ وہ یہ بھول گیا ہے کہ اسلام کی بنیاد وحی اور شارع علیہ السلام کی سیرت،سنت و احادیث مبارکہ پر ہے،آپ احکام الہی کے ماسوا کسی کے حکم کی پیروی کے پابند نا تھے،بلکہ اللہ نے آپکو حکمت و تفقہ دیکر خود دنیا میں اپنا ایسا خلیفہ مقرر کردیا تھا چناچہ منجانب الہی آپ خود قانون اسلام کا ایک باقاعدہ بنیادی ماخذ بن چکے تھے ،مذید یہ کہ یہ موضوع بحث اس دور کی علامی تجارت اور اس دور میں رایج تصوراتِ حریت و غلامی کے عین مطابق بھی جایز تھا ،جبھی اس دور کے یہود و نصاری سے کفار تک کسی نے یہ اعتراض سرے سے کیا ہی نہیں تھا، کیونکہ سب زمانہ قدیم سے زمانہ دور رسالت تک اسے سے زیادہ بیویوں اور کنیزوں سے لطف ادوز ہوت چلے آئے تھے یہ سوال اور یہ بحث بہت حد تک جدید یورپی نشاۃ ثانیہ، اور مغربی استشراقیت کے سبب نمودار ہوئی جسے جدید انسانی حقوق کی عصری بحث و سیاست نے مذید مضبوط کردیا ہے۔معج

89 النساء: ۲۵

لئے ہے جسے تم میں سے گناہ (کے ارتکاب) کا اندیشہ ہو، اور اگر تم صبر کرو تو (یہ) تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا مہر بان ہے۔

کی صورت میں جب لونڈی کا نکاح کسی شخص سے کر دیا جائے تو کیا اس لونڈی پر دو اشخاص کو مباشرت کا حق ہو گا؟ ایک خاوند کو بلحاظ نکاح اور دوسرے مالک کو بلحاظ ملکیت، اگر نہیں تو کیوں؟''

الجواب صحیح :

کنیزوں اور لونڈیوں سے تمتع کا مسلہ مولوی کا گھڑا قصہ نہیں بلکہ قران سے ثابت شدہ منقولی حقیقت ہے:

ان سوالات کے جوابات میں پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ حق ملکیت کی بنا پر تمتع کی اجازت قرآن مجید کی متعدد آیات میں صریح طور پر وارد ہوئ ہے۔ بہت سے لوگ اس معاملہ میں بڑی بے باکی کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے اعتراضات کر ڈالتے ہیں کہ یہ شاید محض ''مولویوں'' کا گھڑا ہوا مسئلہ ہو گا،اور بعض منکرین حدیث اس کو اپنے نزدیک ''حدیث کے خرافات'' میں سے سمجھ کر زبان درازی کرنے لگتے ہیں، لہٰذا ایسے سب لوگوں کو آگاہ رہنا چاہیے کہ ان کا معاملہ ''مولویوں'' کی فقہ اور محدثین کی روایات سے نہیں بلکہ خود خدا کی کتاب سے[90] ہے، اس کے لیے حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلاَّ تُقْسِطُواْ فِي الْيَتَامَى فَانكِحُواْ مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلاَثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلاَّ تَعْدِلُواْ (فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ أَدْنَى أَلاَّ تَعُولُواْ[91]۔

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پسندیدہ اور حلال ہوں، دو دو اور تین تین اور چار چار (مگر یہ اجازت بشرطِ عدل ہے)، پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (زائد بیویوں میں) عدل نہیں کر سکو گے تو صرف ایک ہی عورت سے (نکاح کرو) یا وہ کنیزیں جو (شرعاً) تمہاری ملکیت میں آئی ہوں، یہ بات اس سے قریب تر ہے کہ تم سے ظلم نہ ہو۔

---

[90] **جیسا کہ یہ امر جدید الخیال مسلم افراد میں عام ہے کہ وہ بھی قران سے راست بلا مدد حدیث اخذ مسایل کی اہلیت قایم کرسکتے ہیں،ایک ٹھیٹ پرویزی اور غامدی حدیث کی شرعی حیثیت و افادیت کا منکر ہوسکتا ہے مگر قران کو وہ بھی اپنا ماخذ مانتے ہیں یہاں جبھی مولانا قران کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں،کہ جس قران کے ماخذ دین ہونے کے تم بھی مدعی ہو اسی قران میں اسکا جواب موجود ہے۔معج**

[91] **النساء: ۳**

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلاَّ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كِتَابَ اللّهِ عَلَيْكُمْ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَلِكُمْ أَن تَبْتَغُواْ بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً وَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ (مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا۔ (النساء ۲۴

اور شوہر والی عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) سوائے ان (کافروں کی قیدی عورتوں[92]) کے جو تمہاری مِلک میں آ جائیں، (ان احکامِ حرمت کو) اللہ نے تم پر فرض کر دیا ہے، اور ان کے سوا (سب عورتیں) تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں تاکہ تم اپنے اموال کے ذریعے طلبِ نکاح کرو پاک دامن رہتے ہوئے نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے، پھر ان میں سے جن سے تم نے اس (مال) کے عوض فائدہ اٹھایا ہے انہیں ان کا مقرر شدہ مَہر ادا کر دو، اور تم پر اس مال کے بارے میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم مَہر مقرر کرنے کے بعد باہم رضا مند ہو جاؤ، بیشک اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

(وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ۔ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ[93]:

اور جو (دائماً) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں کے یا ان باندیوں کے جو ان کے ہاتھوں کی مملوک ہیں، بیشک (احکامِ شریعت کے مطابق ان کے پاس جانے سے) ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا[94]۔

اے نبی! بیشک ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ بیویاں حلال فرما دی ہیں جن کا مہَر آپ نے ادا فرما دیا ہے اور ان عورتوں کو جو (احکامِ الٰہی کے مطابق) آپ کی مملوک ہیں، جو اللہ نے آپ کو مالِ غنیمت میں عطا فرمائی ہیں، اور آپ کے چچا کی بیٹیاں، اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں، اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں، اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی بھی مؤمنہ عورت بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو نبی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نکاح) کے لئے دے دے اور نبی

---

[92] **کافروں کی عورتیں جو دوران جنگ مسلمانوں کی قید میں آئیں اور انکو کفار فدیہ یا سفارت سے چھڑا نا سکیں اور نا ہی اس پر زیادہ توجہ دیں پھر امام یا ریاست انھیں مسلمانوں میں تقسیم بھی کرسکتا ہے،بیچ بھی سکتا ہے اور چاہے تو انصاف کرتے ہوئے خود کی ملیکت میں بھی لے سکتا ہے اور اگر چاہے تو انھیں آزاد بھی کرسکتا ہے۔اسی طرح مسلمانوں پر فرض ہے کہ مسلم قیدی عورتوں کی آزادی کے لئے فدیہ،سفارت جنگ سے جتنا ممکن ہو انکی آزادی کے لئے کوشش کرے ،اگر انکی خبر نا ہو،اور دشمن سے جنگ کرکے لینا ممکن نا ہو تو یہ امر مجبوری تصور کیا جایگا،جیسے پاکستان ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو پاکستان لانے سے قاصر ہے اور نا پاکستان اور عالم اسلام میں فی الحال اتنا مادی و روحانی دم و خم ہے کہ انھیں وہاں سے آزاد کرواسکے ،تو امید ہے کہ اللہ اس خطا کو معاف مرمائے گا،مگر سفارت سے جتنا ممکن ہو انکی آزادی کے لئے آخر دم تک کوشش کرنا مسلم امہ پر فرض ہےمعج۔**

[93] **المومنون:۶**

[94] **الاحزاب: ۵۰**

(صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی) اسے اپنے نکاح میں لینے کا ارادہ فرمائیں (تو یہ سب آپ کے لئے حلال ہیں)، (یہ حکم) صرف آپ کے لئے خاص ہے (امّت کے) مومنوں کے لئے نہیں، واقعی ہمیں معلوم ہے جو کچھ ہم نے اُن (مسلمانوں) پر اُن کی بیویوں اور ان کی مملوکہ باندیوں کے بارے میں فرض کیا ہے، (مگر آپ کے حق میں تعدّدِ ازواج کی حِلّت کا خصوصی حکم اِس لئے ہے) تاکہ آپ پر (امتّ میں تعلیم و تربیتِ نسواں کے وسیع انتظام میں) کوئی تنگی نہ رہے، اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا رحم فرمانے والا ہے۔

:آگے چل کر پھر فرمایا گیا ہے کہ:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِن بَعْدُ وَلَا أَن تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيباً۔[95] (الاحزاب ۵۲)

اس کے بعد (کہ انہوں نے دنیوی منفعتوں پر آپ کی رضا و خدمت کو ترجیح دے دی ہے) آپ کے لئے بھی اور عورتیں (نکاح میں لینا) حلال نہیں (تاکہ یہی اَزواج اپنے شرف میں ممتاز رہیں) اور یہ بھی جائز نہیں کہ (بعض کی طلاق کی صورت میں اس عدد کو ہمارا حکم سمجھ کر برقرار رکھنے کے لئے) آپ ان کے بدلے دیگر اَزواج (عقد میں) لے لیں اگرچہ آپ کو ان کا حُسنِ (سیرت و اخلاق اور اشاعتِ دین کا سلیقہ) کتنا ہی عمدہ لگے مگر جو کنیز (ہمارے حکم سے) آپ کی مِلک میں ہو (جائز ہے)، اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

ان آیات سے یہ بات صریح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی رو سے ملک یمین کی بنا پر تمتع جائز ہے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ یہ اجازت کن حالات میں دی گئی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس سے استفادہ کی کیا کیا صورتیں شارع نے تجویز کی ہیں؟۔

<u>جنگ میں گرفتار ہونے والے سبایا (لونڈی غلاموں) کی بابت بحث:</u>

جنگ میں گرفتار ہونے والے سبایا (لونڈی غلاموں) کے حق میں اسلام نے جو قوانین وضع کیے تھے ان کو سمجھنے میں آج لوگوں کو اس لیے دقتیں پیش آ رہی ہیں کہ اس زمانے میں وہ حالات باقی نہیں رہے ہیں جن کے لیے یہ قوانین وضع کیے گئے ہیں مگر قدیم ترین زمانے سے اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیا میں اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھنے اور انہیں خرید و فروخت کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ اس زمانہ میں بہت ہی کم ایسا ہوتا تھا کہ دو محارب سلطنتیں صلح کے بعد اسیران جنگ کا مبادلہ کرتیں یا ان کو فدیہ دے کر چھڑاتی تھیں۔ زیادہ تر قاعدہ یہی تھا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوتے وہ اسی سلطنت کے قبضہ میں رہتے جس کی فوج ان کو گرفتار کر کے لے جاتی تھیں۔ اس طرح آبادیوں کی آبادیاں قید ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلی جاتی تھیں اور کسی سلطنت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ان کثیر التعداد قیدیوں کو مقید رکھ کر ان کے کھانے کپڑے کا بار اٹھاتی۔ اس لیے سلطنتیں اپنی ضرورت کے مطابق قیدیوں کو اپنے قبضے میں رکھتی تھیں اور باقیوں کو فوج کے افراد میں تقسیم کر دیتی تھیں، جن کے پاس وہ لونڈی غلام بن کر رہتے تھے۔

---

[95] **الاحزاب: ۵۲**

یہ حالات تھے جن سے اسلام کو سابقہ درپیش تھا۔ اس نے ان حالات میں دنیا کے سامنے یہ اصول پیش کیا کہ جو لوگ جنگ میں قید ہوں ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو یا اسیران جنگ سے مبادلہ کر لو یا بطریق احسن رہا کر دو۔ لیکن اس اصلاحی تعلیم کا نفاذ تنہا مسلمانوں کے عمل سے نہ ہوسکتا تھا بلکہ اس کے لیے ان غیر مسلم قوموں کا راضی ہونا بھی ضروری تھا جن سے مسلمانوں کو جنگ پیش آتی تھی اور وہ اس وقت اس اصلاح کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھیں نہ اس کے بعد بارہ صدیوں تک آمادہ ہوئیں۔ اس لیے اسلام نے بدرجۂ آخر اس کی اجازت دی کہ دشمن کے اسیرانِ جنگ کو اسی طرح غلام بنا کر رکھا جائے جس طرح دوسری قومیں مسلمانوں کے اسیران جنگ کو رکھتی ہیں۔

مگر اس اجازت سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں بھی ایک پست طبقہ[96] پیدا نہ ہو جائے۔ جیسا کہ ہر اس قوم کے اجتماعی نظام میں ہوا ہے جس نے دوسری قوموں کو مغلوب کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اسیران جنگ کے ساتھ یہ معاملہ خلاف انسانیت تھا اس سے ان بہت سے اخلاقی و تمدنی مفاسد کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ تھا جو کسی نظامِ اجتماعی میں ایک ایسے طبقہ کی پیدائش کا لازمی نتیجہ ہوتےہیں۔ لہٰذا اسلام نے اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھنے کی اجازت تو ضرورت کی بنا پر دی مگر اس کے ساتھ ایسے قوانین بھی مقرر کیے جن کا منشاء یہ تھا کہ غلامی کی حالت میں بہتر سے بہتر سلوک جو ان کے ساتھ ممکن ہو وہ کیا جائے اور ایسے اسباب مہیا کیے جائیں جن سے وہ رفتہ رفتہ اسلامی سوسائٹی میں جذب ہو جائیں۔

یہی مقصد ہے جس کے لیے لونڈیوں سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے، تھوڑی دیر کے لیے اپنے تصور کو اب سے چند سو برس پیچھے لیے جائیے، فرض کیجئے کہ ایک غیر قوم سے مسلمانوں کی جنگ ہوتی ہے، اس میں ہزاروں عورتیں ان کے ہاتھ آتی ہیں، ان میں بہت سی جوان اور خوبصورت عورتیں بھی ہیں۔فریق مخالف نہ ان کو فدیہ دے کر چھڑا تا ہے نہ ان مسلمان عورتوں سے ان کا تبادلہ کرتا ہے جو اس کے قبضہ میں چلی گئی ہیں۔ مسلمان ان عورتوں کو بطریق احسان بھی نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ اس طرح تو ان کی اپنی عورتوں کے چھوٹنے کی کوئ امید کی ہی نہیں جاسکتی ہے۔

ناچار وہ ان کو اپنے قبضے میں رکھتے ہیں، اب فرمائیے کہ اتنی کثیر تعداد میں جو عورتیں دار الاسلام میں آ گئی ہیں ان کو کیا کیا جائے۔ ان کو دائم الحبس کر دینا بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ ان کو ملک میں آزاد چھوڑ دینا گویا فسق و فجور کے جراثیم پھیلا دینا ہے۔ ان کو جہاں جہاں بھی رکھا جائے گا، ان سے اخلاقی مفاسد پھیلیں گے، ایک طرف سوسائٹی خراب ہو گی اور دوسری طرف خود ان کی پیشانیوں پر ہمیشہ کے لیے ذلت کے داغ لگ جائیں گے۔

اسلام اس مسئلہ کو یوں حل کرتا ہے کہ انہیں افرادِ قوم میں تقسیم کر دیتا ہے اور ان افراد کو ہدایت کرتا ہے کہ خبردار ان کو رنڈیاں نہ بنا دینا کہ ان سے حرام کراؤ اور ان کو اپنی آمدنی کا ذریعہ بناؤ، بلکہ یا تو خود ان کو اپنے تصرف میں لاؤ نہیں تو ان کے نکاح کر دو تاکہ یہ بد کاریاں اور آشنائیاں نہ کرتی پھریں۔

[96] **Depressed Class۔**

سورۂ نور کے اس قانون کی مختلف دفعات قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کی گئی ہیں:

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَن يُكْرِههُّنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِن بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔[97]

اور ایسے لوگوں کو پاک دامنی اختیار کرنا چاہئے جو نکاح (کی استطاعت) نہیں پاتے ہیں ، یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے انھیں غنی فرما دے، اور تمہارے زیردست (غلاموں اور باندیوں) میں سے جو مکاتب (کچھ مال کما کر دینے کی شرط پر آزاد) ہونا چاہیں تو انہیں مکاتب (مذکورہ شرط پر آزاد) کر دو اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو، اور تم (خود بھی) انہیں اللہ کے مال میں سے (آزاد ہونے کے لئے) دے دو جو اس نے تمہیں عطا فرمایا ہے، اور تم اپنی باندیوں کو دنیوی زندگی کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے بدکاری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ پاک دامن (یا حفاظتِ نکاح میں) رہنا چاہتی اور جو شخص انہیں مجبور کرے گا تو اللہ ان کے مجبور ہو جانے کے بعد (بھی) بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس مقام پر یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اسیران جنگ میں سے کوئ عورت کسی شخص کی ملکیت میں صرف اسی وقت آتی ہے جبکہ وہ حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کے حوالے کی جائے اور اس کے بعد اس عورت کے ساتھ مباشرت کا حق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر تقسیم ہونے سے پہلے کسی عورت سے مباشرت کرنا زنا ہے۔ اور اس طرح تقسیم کے بعد ایک مالک کے سوا کسی اور آدمی کا اس کے ساتھ ایسا فعل کرنا زنا ہے۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں زنا ایک قانونی جرم ہے۔

عرب جاہلیت میں بہ کثرت لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی لونڈیوں کے ذریعہ سے باقاعدہ قحبہ خانے کھول رکھے تھے۔ وہ ان کی کمائی کھاتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد کو پال کر اپنے خدم و حشم میں اضافہ کرتے تھے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے ہیں تو وہاں عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کا ایک قحبہ خانہ موجود تھا جس میں اس نے چھ لونڈیاں اسی غرض سے رکھ چھوڑی تھیں، اسی چیز کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے۔

یہ اس قانون کی پہلی دفعہ ہے جس نے لونڈیوں کے ایک برے مصرف کا دروازہ قطعی بند کر دیا۔

مگر یہ ان کے لیے ہے جو اپنی عصمت کی حفاظت کرنا چاہتی ہوں، رہیں وہ لونڈیاں جو آپ ہی بدکاری کی طرف مائل ہوں تو ان کے بارے میں یہ حکم دیا گیا:

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلاً أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مِّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ

[97] النور: ٣٣

مُسَافِحَاتٍ وَلاَ مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَأَن تَصْبِرُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ[98]۔ (النساء ۲۵)

اور تم میں سے جو کوئی (اتنی) استطاعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو ان مسلمان کنیزوں سے نکاح کر لے جو (شرعاً) تمہاری ملکیت میں ہیں، اور اللہ تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو خوب جانتا ہے، تم (سب) ایک دوسرے کی جنس میں سے ہی ہو، پس ان (کنیزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور انہیں ان کے مَہر حسبِ دستور ادا کرو درآنحالیکہ وہ (عفت قائم رکھتے ہوئے) قیدِ نکاح میں آنے والی ہوں نہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ درپردہ آشنائی کرنے والی ہوں، پس جب وہ نکاح کے حصار میں آ جائیں پھر اگر بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی آدھی سزا لازم ہے جو آزاد (کنواری) عورتوں کے لئے (مقرر) ہے، یہ اجازت اس شخص کے لئے ہے جسے تم میں سے گناہ (کے ارتکاب) کا اندیشہ ہو، اور اگر تم صبر کرو تو (یہ) تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا مہر بان ہے۔

<u>لونڈیوں سے تعلق کی کچھ قسمیں :</u>

اس طرح ان لونڈیوں کے لیے بدکاری کا راستہ تو بالکل بند کر دیا گیا، خواہ مجبورانہ ہو یا رضاکارانہ۔ مگر نفس تو وہ بھی رکھتی ہیں اور ان کے داعیاتِ فطرت کی تکمیل بھی ضروری ہے ورنہ ظلم بھی ہو گا اور اخلاقی مفاسد کے چور دروازے بھی کھلیں گے، اس لیے ان کی نفسیاتی ضرورتوں کو با عزت طریقہ سے پورا کرنے کی دو صورتیں تجویز کی گئی ہیں۔:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ ان کے آقا ان کے نکاح کر دیں ۔

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَى مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ [99]

اور تم اپنے مردوں اور عورتوں میں سے ان کا نکاح کر دیا کرو جو (عمرِ نکاح کے باوجود) بغیر ازدواجی زندگی کے (رہ رہے) ہوں اور اپنے با صلاحیت غلاموں اور باندیوں کا بھی (نکاح کر دیا کرو)، اگر وہ محتاج ہوں گے (تو) اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا، اور اللہ بڑی وسعت والا بڑے علم والا ہے۔

اسی طرح جو نادار لوگ زیادہ مہر دے کر معزز خاندانوں میں شادیاں کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں ان کو بھی ترغیب دی گئی کہ تھوڑے مہر پر لونڈیوں سے نکاح کر لیں جیسا کہ ٓیت ذیل میں حکم دیا گیا ہے۔

اور جو شخص تم میں اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ شریف خاندانوں کی مومن عورتوں سے نکاح کرسکے تو وہ تمہاری مومن لونڈیوں سے نکاح کرے[100]

[98] النساء: ۲۵

[99] النور: ۳۲

لونڈی کو جب اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے دے تو پھر اس مالک کو اس لونڈی کے ساتھ مباشرت کرنے کا حق باقی نہیں رہتا ہے، کیونکہ کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا یہ حق مہر کے عوض دوسرے شخص کی طرف منتقل کر چکا ہوتا ہے۔ اس بنا پر ایسی لونڈیاں بھی محصنات میں داخل ہو جاتی ہیں جن کو نصِ قرآنی نے شوہر کے سوا سب کے لیے حرام کر دیا ہے، چنانچہ آیت مذکورہ کے بعد اس کی تصریح کر دی گئی ہے:

پس ان کے مالکوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کر دو۔ وہ قید نکاح میں لائ جائیں نہ کہ کھلی اور چھپی بد کاریاں کریں۔ پھر جب وہ نکاح سے پابند ہو جائیں اور اس کے بعد بدکاری کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو شریف خاندانی عورتوں کے لیے ہے۔[101]

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خود مالک ان سے تمتع کرے، اس کی تین شکلیں ہیں:

۱) ایک یہ کہ محض ملک یمین ہی کو قید نکاح سمجھ کر تمتع کیا جائے۔

۲) دوسری یہ کہ لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا جائے اور اس آزادی ہی کو اس کا مہر قرار دیا جائے۔

۳) تیسرے یہ کہ اس کو آزاد کر کے جدید مہر کے ساتھ نکاح ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اور تیسری شکل کو ترجیح دی ہے اور اس کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں:

ایک یہ کہ آپؐ بے فرمایا ہے کہ :جس شخص کے پاس لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب اچھی تعلیم دے اور اس کو اچھا ادب سکھائے پھر اس کو آزاد کر دے اور اس کے بعد خود اس سے نکاح کر لے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔[102]

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ "اس کو آزاد کر کے مہر دے کر اس کے ساتھ نکاح کرے"[103]

ایک اور حدیث نقل کی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

جب کسی شخص نے اپنی لونڈی کو آزاد کیا پھر اس کو جدید مہر دے کر اس سے نکاح کیا تو اس کے لیے دو اجر ہوں گے[104]۔

---

[100] **النسا:۲۵**

[101] **ایضاً**

[102] **بخاری: کتاب النکاح**

[103] **ابوداؤد**

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ کے ساتھ اسی طرح نکاح کیا تھا کہ پہلے ان کو آزاد کیا پھر قیدِ نکاح میں لائے۔ اس باب میں روایات مختلف ہیں کہ آپ نے جدید مہر ادا کیا تھا یا آزادی ہی کو مہر قرار دیا، لیکن اغلب یہ ہے کہ آپ نے جواز کی دونوں صورتیں ظاہر کرنے کے لیے دونوں طریقوں پر عمل فرمایا ہے، کسی کو جدید مہر دیا ہے اور کسی کی آزادی ہی کو مہر قرار دیا ہے۔

اس اجازت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بنی قریظہ کے سبایا میں سے حضرت رَیحانہؓ [105]، غزوۂ بنی المصطلق کے سبایا میں سے حضرت جویریہؓ ، غزوۂ خیبر کے سبایا میں سے حضرت صفیہؓ اور مقوقس مصر کی بھیجی ہوئ حضرت ماریہ قبطیہؓ کو اپنے لیے مخصوص فرمایا تھا۔ ان میں سے مقدم الذکر تین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا لیکن حضرت ماریہ قبطیہؓ سے بربنائے ملک یمین تمتع فرمایا، ان کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہےکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات طیبہ کے اخیر زمانے میں تین لونڈیوں[106] کے ساتھ نکاح کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا اصل مقصد اسلامی سوسائٹی میں لونڈیوں کے لیے عزت کی جگہ پیدا کرنا تھا۔ اور آپ خود اپنے عمل سے مسلمانوں کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ انسانی برادری کے اس بدقسمت گروہ کے ساتھ ان کو ایسا سلوک کرنا چاہیے، مگر دشمنان اسلام کی بدطینتی نے آپ کے اس انتہائ شریفانہ فعل کو بھی نفسانیت پر محمول کر کے چھوڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان عیب چینی پر اتر آئے تو دنیا کا کوئ نیک سے نیک فعل بھی ایسا نہیں جس میں وہ بدی کا پہلو نہ نکال سکتا ہو۔

رہی پہلی شکل، یعنی حقِ ملکیت کی بنا پر تمتع کرنا، تو وہ بھی جائز ہے اس لیے کہ قرآن مجید میں ملک یمین کی بنا پر تمتع کی صریح اجازت دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئ شرط یا قید نہیں لگائ گئی ہے، اس میں بظاہر جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے، چونکہ طبیعتیں نکاح کے عام اور معروف طریقے کی خوگر ہو چکی ہیں اس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت اور مرد کا صرف وہی تعلق جائز ہے جس میں قاضی صاحب آئیں، دو گواہ ہوں، ایجاب و قبول ہو اور خطبہ نکاح پڑھایا جائے، اس کے سوا جو صورت ہے وہ محض شہوت رانی ہے، لیکن اسلام کوئی رسمی مذہب نہیں بلکہ ایک (شرعی)عقلی مذہب ہے، وہ رسم کو نہیں حقیقت کو دیکھتا ہے۔

---

104 **ابوداؤد الطیالسی**

105 **ریحانہؓ کی بابت اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ یا آپکے نکاح میں رہی تھیں یا رخصت کردی گئی تھیں،بلاشبہ اس باب میں سب سے عمدہ جویریہؓ اور صفیہؓ کی روایت ہیں جنھیں ام المومنین میں شمار کیا گیا ہے۔باقی ماریہؓ ایک مقوقس کا نبی اکرمؐ کو تضفہ تھیں وہ آپکی ملکیت میں ہی رہی تھیں۔معج**

106 **امہات المومنین صفیہؓ اور جویریہؓ کی بابت کنیز یا لونڈی کے الفاظات کا استعمال نامناسب ہے کیونکہ دونوں ہی اعلیٰ خاندانوں کی جنگی قیدی تھیں اور جو غزوہ کے فورہ بعد نبی اکرمؐ کے عقد میں آگئیں تھیں،اور انھیں کسی کنیز بننے یا لونڈی بننے کا کرب اللہ نے دکھانا منظور نہیں فرمایا تھا ۔باقی ماریہ قبطیہؓ ہی آپکو ہبہ کردہ کنیز تھیں،مگر انکا بھی بار بار ایسا ذکر نا ہی کرنا عمدہ ہوگا۔معج**

نکاح سے ایک عورت جو ایک مرد کے لیے حلال ہوتی ہے تو آخر اسی بناء پر تو حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اس کو حلال کیا ہے، اسی طرح اگر ملکِ یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اس کو حلال کرے تو اس میں کراہت کی کون سی بات ہے؟ نکاح کا مقصد انسان کے جذبۂ شہوت رانی کو ایک حد کے اندر محدود کرنا اور ایک ضابطہ سے منضبط کرنا اور مرد و زن کے تعلق کو ایک باقاعدہ تمدنی تعلق کی صورت میں قائم کرنا ہے، اسی لیے اعلان کی شرط لگائی گئی ہے کہ سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشتہر ہو جائے کی فلاں عورت فلاں مرد کے لیے مختص ہو چکی ہے، اس کے بطن سے جو اولاد ہو گی وہ فلاں شخص کی ہو گی۔ اور اس عورت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا زوجی تعلق نہ ہو گا۔

اُم الولد کی بحث:

یہ سب اغراض ملکِ یمین سے بھی پوری ہوسکتی ہیں، سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشتہر ہوتا ہے کہ فلاں لونڈی فلاں شخص کی مملوکہ ہے، کسی دوسرے شخص کے لیے اس لونڈی سے زوجی تعلق پیدا کرنا جائز نہیں ہوتا جب تک کہ مالک اپنی رضا مندی سے اس کو نکاح میں نہ دے دے، لہٰذا ایک عورت کا مرد کے لیے مخصوص ہونا اس صورت میں بھی ویسا ہی قطعیت اور شہرت کے ساتھ واقع ہوتا ہے جس طرح کہ نکاح کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ مالک کے تصرف میں آ جانے کے بعد ایک عورت اگر صاحبِ اولاد ہو جائے تو وہ اس خاندان کی ایک فرد بن جاتی ہے، اس کو ام ولد کہا جاتا ہے۔ مالک کی وفات کے بعد وہ آپ سے آپ آزاد ہو جاتی ہے۔ اس کی اولاد جائز سمجھی جاتی ہے اور اپنے باپ سے شرعی ورثہ پاتی ہے۔ اس اولاد کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صُلبی اولاد کے لیے مقرر ہیں۔ پھر کیا یہ نکاح کی طرح باقاعدہ زوجی تعلق نہیں ہے؟۔

ہاں اس طریقہ میں ایک کراہت ضرور ہے،مگر وہ ایک دوسرے پہلو سے ہے، ملک یمین کی بنا پر جس لونڈی سے نکاح کیے بغیر تمتع کیا جاتا ہے وہ اصلاً لونڈی ہی رہتی ہے۔ اس کو محصنات کے برابر مرتبہ حاصل نہیں ہوتا اور اس کی اولاد پر بھی پرستار زادگی کا داغ رہتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فضیلت اس طریقے کو دی ہے کہ پہلے اس کو آزاد کر کے شریف عورتوں کے مرتبہ میں لے آؤ، پھر اس سے بطریق احسن معروف نکاح کرو تاکہ اس میں عزتِ نفس کا وہ احساس پیدا ہو جائے جو شریف عورتوں میں ہوتا ہے، اور وہ مساویانہ حیثیت سے تمہاری سوسائٹی میں داخل ہو جائے اور اس پر لونڈی پن کا اور اس کی اولاد پر پرستار زادگی کا داغ نہ رہے۔

اب آپ کے صرف دو سوالوں کے جواب باقی ہیں،ایک یہ کہ اگر مرد کو ملک یمین کی بناء پر تمتع کا حق حاصل ہے تو عورت کو یہ حق حاصل کیوں نہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر غیر مسلم محاربین مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں تو ہم کو اس پر احتجاج کا کیا حق ہے؟

ذیل میں ان دونوں کا جواب علی الترتیب دیا جاتا ہے:

ملک یمین کی بنا پر مرد کے مقابل عورت کو کیوں یہ حق اپنے غلام پر حاصل نہیں ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں ملک یمین کی بنا پر تمتع کا حق صرف مردوں ہی کو دیا گیا ہے، عورتوں کو نہیں دیا گیا۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ. إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ.[107]

اور جو (دائماً) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں کے یا ان باندیوں کے جو ان کے ہاتھوں کی مملوک ہیں، بیشک (احکامِ شریعت کے مطابق ان کے پاس جانے سے) ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔

اسی طرح دوسری تمام آیات میں بھی خطاب صرف مردوں سے ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زوجی تعلق کے معاملہ میں عورت اور مرد کے درمیان ہمیشہ سے انسان نے امتیاز کیا ہے، اور یہ امتیاز خود اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے (جو لوگ اس کو سمجھنا چاہتے ہوں وہ ہماری کتاب "پردہ" میں "قوانین فطرت" کا باب بغور مطالعہ فرمائیں)، عورت میں عصمت کا احساس مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ عورت سے با عصمت رہنے کی توقع بھی مرد کی بہ نسبت زیادہ کی جاتی ہے، اگر مرد فحش کاری کا مرتکب ہو تو اس کو اتنی بری نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جیسے عورت کی فاحشہ گری کو دیکھا جاتا ہے۔ عورت کی قد و قیمت ازالۂ بکارت کے بعد آدھی رہ جاتی ہے، مگر مرد دس بیویاں بھی کر چکا ہو تو اس کی قدر و قیمت میں کوئ فرق نہیں آتا۔ عورت اگر کسی غیر قوم کے مرد کے پاس چلی جاتی ہے تو اس کی ساری قوم اس کو اپنے لیے بے عزتی سمجھتی ہے۔

لیکن مرد کا غیر قوم کی عورت سے تعلق پیدا کرنا کچھ زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا، یہ انسانی فطرت ہے اور اس کو اسلام نے ایک حد خاص تک ملحوظ رکھا ہے، مگر جب یہ چیز جہالت کی حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ اس کو پامال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا، مثلاً اسلام مردوں کو کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے، مگر عورتوں کو اہل کتاب سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں تک اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کیا ہے۔ لیکن اگر یہودی یا نصرانی مسلمان ہو جائے تو اسلام بلا تامل اس کے ساتھ نکاح کرنے کی ہر مسلمان عورت کو اجازت دیتا ہے خواہ وہ کتنے ہی شریف گھرانے کی ہو۔ محض نومسلم ہونے کی بنا پر اس سے نکاح کو مکروہ سمجھنا اسلام کی نگاہ میں خود مکروہ ہے۔

---

[107] **المومنون: ۵،۶**

اس قاعدے کو اگر آپ سمجھ لیں تو یہ بات آپ کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے کہ اسلام عورت کو اپنے غلام سے تمتع کی اجازت کیوں نہیں دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جائے تو معاشرے میں ایسی عورت کی قدرو قیمت گھٹ جائے اور اس کے بعد اگر وہ اس غلام سے قطع تعلق کر کے کسی شخص سے نکاح کرنا چاہے تو امید نہیں کی جاسکتی کہ اس کے کفو میں کوئ مرد اس کو قبول کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ اگر عورت اپنے غلام سے تمتع کرے تو خود اپنے خاندان میں اس کا مرتبہ گھٹ جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے کہ عورت کو عائلی زندگی میں جو وزن حاصل ہوتا ہے وہ اس کے شوہر کی بدولت ہوا کرتا ہے اور یہاں شوہر خود غلام ہے جس کو آزاد مرد کا سا مرتبہ حاصل نہیں۔ اس حد تک اسلام نے فطرت انسانی کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ لیکن اگر کوئ غلام آزاد کر دیا گیا ہو تو شریف سے شریف خاندان کی عورت کا بھی اس سے نکاح ہوسکتا ہے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام سے کیا تھا۔

عورت کو غلام سے تمتع کی اجازت نہ دینے کی دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ ملک یمین مرد کے لیے تو منزلۂ نکاح ہوسکتا ہے مگر عورت کے لیے نہیں ہوسکتا، اسلام نے خانگی زندگی کے لیے جو قانون مقرر کیا ہے اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ مرد کو عورت پر قوام ہونا چاہیے، اسی لیے عورت کا مہر مرد پر واجب کیا گیا ہے، اور عورت پر مرد کو اقتدار کا ایک درجہ دیا گیا ہے تاکہ وہ عورت کی خبر گیری اور حفاظت کرے اور اپنے گھر میں وہ حاکمانہ قوت استعمال کرسکے جو خانگی زندگی کے نظام کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے، یہ مصلحتِ عظمیٰ غلام سے تمتع کرنے کی صورت میں فوت ہو جاتی ہے۔ اپنے غلام سے کسی عورت کا تعلق شہوت رانی کی غرض تو پوری کرسکتا ہے مگر اسلامی نظام تمدن کے اندر ان دوسری اغراض کو پورا نہیں کرسکتا جن کو شریعت نے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں ملحوظ رکھنا ضروری سمجھا ہے، کیونکہ اس صورت میں مرد غلام ہونے کی حیثیت سے عورت کا تابع فرمان ہو گا اور اسے گھر میں وہ اقتدار حاصل نہ ہوسکے گا جو اخلاق و معاشیات کی نگرانی کے لیے اور خاندانی نظام کو درست رکھنے کے لیے مرد ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونا چاہیے۔

رہا آپ کا آخری سوال تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال کرتے وقت آپ نے یہ فرض کر لیا تھا کہ دشمن کے قبضے میں جو مسلمان عورتیں جاتی ہوں گی ان کو تو وہ بالکل گھر کی بیٹیاں بنا کر رکھتے ہوں گے۔ کیا واقعی آپ کا مفروضہ صحیح ہے؟ اور آپ کا یہ کہنا کہ اس پر ہمیں احتجاج کا کیا حق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم عورتوں ہی کو نہیں مردوں کو بھی غلام بنا کر رکھنا نہ چاہتے تھے اگر دشمن اسیرانِ جنگ کے تبادلے پر راضی ہوتے تو ہم ان کے ایک مرد یا عورت کو بھی اپنے پاس غلام بنا کر رکھنے پر اصرار نہ کرتے لہٰذا اگر صدیوں تک دنیا میں غلامی کا رواج رہا اور ایک قوم کی شریف عورتیں لونڈیاں بن بن کر دوسری قوموں کے تصرف میں آتی رہیں تو یہ ہمارے کسی قصور کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کے ذمے دار وہ لوگ تھے جو صدیوں تک اسیرانِ جنگ کے بارے میں کسی مہذب اور معقول رویے کو اختیار کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

<u>لونڈیوں سے تمتع اور انکی ملکیت کی عدم تحدید کا مسلہ:</u>

س)اسلامی شریعت میں نکاح کے لیے تو چار کی حد مقرر ہے کہ ایک وقت میں آدمی چار بیویوں ‘‘ سے زیادہ نہیں رکھ سکتا لیکن لونڈیوں کے لیے کوئ حد سرے سے رکھی ہی نہیں گئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت نے چار کی حد مقرر کرنے کے سارے فوائد کو باطل کر دیا۔ اس نے خوش حال لوگوں کے لیے بے تحاشہ عیاشی کا دروازہ کھول دیا۔ امراء و رؤسا کے لیے یہ گنجائش نکال دی کہ بے شمار عورتوں کو خرید خرید کر گھروں میں ڈال لیں اور خوب دادِ عیش دیں۔ یہ محض مفروضہ ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں عملاً یہی کچھ ہوتا رہا ہے، کیا آپ ‘‘اس کی کوئ معقول توجیہ کرسکتے ہیں؟

ج) آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ لونڈیوں سے تمتع کی اجازت جن اہم تمدنی مصالح کی بنا پر دی گئی ہے وہ تعداد کے تعین سے فوت ہو جاتے ہیں، اس امر کا تعین نہیں کیا جاسکتا کہ کس زمانے اور کس لڑائی میں کتنی عورتیں سبایا کی حیثیت سے دارالاسلام میں آئیں گی اور ایک خاص وقت میں مسلمان آبادی کے اندر سبایا کا تناسب کس قدر ہو گا، اب اگر تمتع کی اجازت دینے کا مقصد ہی عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافے کی تمدنی خطرات کا سب باب تھا تو آپ خود غور کیجیے کہ اضافہ کی مقدار متعین نہ ہونے کی صورت میں تمتع کی حد کا تعین آخر کس طرح کیا جاسکتا تھا۔ جس حکیم نے یہ قانون بنایا ہے وہ یک چشم نہیں ہے کہ ایک وقت میں معاملہ کے ایک ہی رخ کو دیکھ سکتا ہو، اس کی حاوی نگاہ بیک وقت تمام پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اسی لیے اس سے وضع قانون میں وہ بے اعتدالی صادر نہیں ہوئ جس کے صادر نہ ہونے کی شکایت انسان نے اکثر اس سے کی ہے۔

رہا آپ کا یہ شبہ کہ لونڈیوں کی ان گنت تعداد سے تمتع کرنے کی اجازت جنسی آوارگی کا دروازہ کھولتی ہے۔ اور یہ کہ لونڈیوں کے قابل بیع و شراء ہونے کی وجہ سے اس کا امکان ہے کہ مال دار لوگ لونڈیاں خرید خرید کر عورتوں کا ایک پورا بیڑہ فراہم کر لیں اور اپنے گھروں کو عیاشی کا اڈا بنا کر رکھ دیں تو یہ اور اس نوعیت کے اکثر شبہات عموماً اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ معاملہ کا ایک ہی پہلو نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرے پہلو چھپے رہتے ہیں، یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ شارع نے اپنا قانون انسانی کی بھلائ کے لیے بنایا ہے اور اس قانون میں جو سہولتیں اور گنجائش رکھی ہیں وہ ان حقیقی ضرورتوں کے لیے رکھی ہیں جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں یا پیش آسکتی ہیں۔ اگر بعض لوگ ان گنجائشوں سے اس قسم کے غلط فائدے اٹھاتے ہیں جن کے لیے دراصل شارع نے یہ گنجائش نہیں رکھی تھی تو یہ ان کی اپنی نا فہمی ہے یا شرارت نفس۔ لیکن اس قسم کی انفرادی غلطیوں کے امکان یا وقوع سے ڈر کر قانون میں ایسی تنگی پیدا کرنا جس سے عام لوگوں کی حقیقی ضرورتیں پوری ہونے میں مشکلات واقع ہوں، کسی حکیم کا کام نہیں ہوسکتا۔

خدا کی شریعت مالدار لوگوں کو بے حساب لونڈیاں خرید خرید کر عیاشی کرنے کی اجازت نہیں دیتی،دراصل یہ تو ایک بے جا فائدہ ہے جو نفس پرست لوگوں نے قانون سے اٹھایا ہے، قانون بجائے خود انسانوں کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ لوگ اس سے یہ فائدہ اٹھائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے شریعت ایک مرد کو چار تک بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہے اور اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ اپنی منکوحہ بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لے آئے، یہ قانون انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اب گر کوئ شخص محض عیاشی کی خاطر یہ طریقہ اختیار کرے کہ چار بیویوں کو کچھ مدت رکھ کر طلاق دیتا اور پھر ان کی جگہ بیویوں کی دوسری

کھیپ لاتا چلا جائے تو یہ قانون کی گنجائشوں سے ناروا فائدہ اٹھانا ہے جس کی ذمہ داری خود اسی شخص پر عائد ہو گی نہ کہ خدا کی شریعت پر۔

اسی طرح شریعت نے جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو جبکہ ان کی قوم مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرنے یا فدیہ دے کر ان کو چھڑا کے لیے تیار نہ ہو، لونڈی بنانے کی اجازت دی اور جن اشخاص کی ملکیت میں وہ حکومت کی طرف سے دے دی جائیں ان کو یہ حق دیا کہ ان عورتوں سے تمتع کرسکیں تاکہ ان کا وجود معاشرے کے لیے اخلاقی فساد کا سبب نہ بن جائے، پھر چونکہ لڑائیوں میں گرفتار ہونے والے لوگوں کی کوئ تعداد معین نہیں ہوسکتی تھی اس لیے قانوناً اس امر کی بھی کوئ حد معین نہیں کی جاسکتی تھی کہ ایک شخص بیک وقت کتنے غلام اور کتنی لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ لونڈیوں اور غلاموں کی خرید و فروخت کو بھی اس بنا پر جائز رکھا گیا کہ اگر کسی لونڈی یا غلام کا نباہ ایک مالک سے نہ ہوسکے تو وہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہوسکے اور ایک ہی شخص کی دائمی ملکیت مالک و مملوک دونوں کے لیے عذاب نہ بن جائے شریعت نے یہ سارے قواعد انسانی حالات و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر سہولت کی خاطر بنائے تھے۔ اگر ان کو مالدار لوگوں نے عیاشی کا ذریعہ بنا لیا تو اس کا الزام انہی پر ہے نہ کہ شریعت پر۔

شارع نے لونڈیوں کی غیر محدود تعداد سے تمتع کی اجازت اس لیے نہیں دی تھی کہ ایک ایک مسلمان اپنے گھر میں راجہ اندر بن جائے اور بے شمار عورتوں کے جھرمٹ میں بس رات دن دادِ عیش ہی دیتا رہے۔ بلکہ دراصل مقصد یہ تھا کہ اگر کبھی غیر معمولی حالات پیش آ جانے کی وجہ سے سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد یکا یک بہت بڑھ جائے تو اس کو آسانی کے ساتھ جذب کیا جاسکے اور اس کی بدولت اخلاقی مفاسد نہ پھیلنے پائیں، اس غرض کے لیے کئی صورتیں رکھی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ لونڈیوں کے نکاح غلاموں سے کر دیے جائیں ، لونڈیوں کے نکاح کم استطاعت مردوں سے کر دیے جائیں، لونڈیوں کو آزاد کر کے خود مالک ان سے نکاح کر لیں۔ جن لوگوں کے پاس لونڈیاں ہوں وہ خود آزاد کیے بغیر ہی ان سے تمتع کریں۔

اسی طرح لونڈیوں کی بیع و شراء کو جائز کرنے کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ آوارہ مزاج لوگ محض عیاشی کی خاطر بہت سی لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیا کریں اور جب دل بھر جائے تو انہیں بیچ کر دوسرا بیڑا بھرتی کر لیں، بلکہ دراصل یہ سہولت ان ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر دی گئی تھی جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں مثلاً ایک شخص مفلس ہو گیا ہے اور لونڈی غلام رکھنے کی استطاعت اس میں نہیں رہی ہے یا اس کے پاس ضرورت سے زائد لونڈی غلام جمع ہو گئے ہیں یا ان میں سے کسی کو وہ پسند نہیں کرتا۔ کیا ان حقیقی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے محض اس خوف سے لونڈیوں اور غلاموں کی خرید و فروخت ممنوع کر دی جاتی کہ بعض لوگ اس قانون حق سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے؟ ایسی برائیوں کے امکانات تو خود نکاح و طلاق کے قانون میں بھی ہیں۔ اگر کوئ شریر آدمی "جائز زناکاری" پر اتر آئے تو وہ روز ایک عورت سے چند روپوں پر نکاح کرسکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے کر کسی دوسری عورت کو تلاش کرسکتا ہے، پھر کیا ایسی انفرادی شرارتوں کے خوف سے یہ صحیح ہو گا کہ طلاق اور نکاح کے قانون میں ایسی بندشیں بڑھا دی جائیں جن سے عام لوگوں کی زندگی تنگ ہو جائے۔

جنگی قیدیوں اور لونڈیوں کی مابعد غلامی سے متعلقہ ایک اور سوال کا جواب:

کیا نظام شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہو گی؟ کیا ان غلاموں " اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہو گا؟ کیا ان غلاموں اور لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہو گا اور اس پر تعداد کی کوئ قید نہ ہو گی؟"

الجواب الصحیح:

نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ایسی حالت میں دی گئی ہے جب کہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہو ، وہ نہ قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہو، نہ فدیہ لیکر ہمارے قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔ آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں وہ یا تو انہیں قتل کرے گی یا انہیں عمر بھر اس قسم کے انسانی باڑوں میں رکھے گی جنہیں آج کل (Concentration Camp) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے انسانی حقوق دیے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کے لیے کچھ بہت مفید نہیں ہے جس میں اس طرح کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ کے لیے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے موجود رہے،اسلام نے ایسے حالات کے لیے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے، اس طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک قیدی کو ایک ایک مسلم خاندان سے پیدا ہو گا اس میں اس امر کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہو اور ان کا ایک اچھا خاصا حصہ بتدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیران جنگ پر حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں ان کے لیے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر کوئ لونڈی یا غلام اپنے مالک سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کر کے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں تو مالک اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اسے ازروئے قانون ایک خاص مدت تک کے لیے اس کو مہلت دینی ہو گی اور اس مدت میں اگر وہ فدیہ کی رقم ادا کرے تو اسے آزاد کر دینا پڑے گا۔ کوئ غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے اور جب آقا اسے قبول کر لے تو دونوں کے درمیان ایک طرح سے معاہدہ طے پا گیا۔ اسلام میں غلاموں کی آزادی کے لیے جو صورتیں رکھی گئی ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ معاوضہ مال ہی کی شکل میں ہو۔

آقا کے لیے کوئ خاص خدمت انجام دینا بھی معاوضہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ فریقین اس پر راضی ہو جائیں۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد آقا کو یہ حق نہیں رہتا کہ غلام کی آزادی میں بیجا رکاوٹیں ڈالے وہ اس کو معاہدے کی رو سے معاوضہ ادا کرنے کے لیے کام کرنے کا موقع دے گا اور مدت مقررہ کے اندر جب بھی غلام اپنے ذمے کی رقم یا خدمت انجام دے دے وہ اس کو آزاد کر دے گا۔ حضرت عمر کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے معاہدہ کیا اور مدتِ مقررہ سے پہلے ہی طے کی گئی رقم فراہم کر کے اس کے پاس لے گیا۔ مالکہ نہ کہا کہ میں تو یک مشت نہ لوں گی بلکہ سال بسال اور ماہ بماہ قسطوں کی صورت میں لوں گی۔ غلام نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا یہ رقم بیت المال میں داخل کر دے اور جا تو آزاد ہے، پھر مالکہ کو کہلا بھیجا کہ

تیری رقم یہاں جمع ہو چکی ہے اب تو چاہے یک مشت لے لے ورنہ ہم تجھے سال بسال اور ماہ بماہ دیتے رہیں گے۔[108]

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے، قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ دشمن فوج کے کسی سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا آپ کو اتفاق ہوا ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئ آسان کام نہیں ہے اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا بھی کوئ کھیل نہیں ہے، اگر کسی شخص کے لیے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برا نہ ہوسکے اس کے حقوق ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ جس کے بھی حوالے کیے جاتے اس کے حق میں بلائے جان بن جاتے۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لیے (جبکہ نہ ان کا تبادلہ ہو اور نہ فدیہ کا معاملہ ہی طے ہوسکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے، اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بد اخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں، قانونی حیثیت سے ملکِ یمین اور عقدِ نکاح میں کوئ خاص فرق نہیں ہے بلکہ اس صورت میں تو خود حکومت باقاعدہ طریقہ سے ایک عورت کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے۔ پھر جو معاشرتی حیثیت ان عورتوں کو شریعت میں دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص کی ملکِ یمین میں جانے کے بعد اس عورت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو جنسی تعلق رکھنے کا حق نہیں ہوتا، جو اولاد اس سے ہو اس کا نسب اسی شخص سے ثابت ہوتا ہے اور وہ اپنے باپ کی اسی طرح جائز وارث ہوتی ہے جس طرح کسی آزاد بیوی کی اولاد۔ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو حق نہیں رہتا اور مالک کے مرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے لیے تعداد کی قید اس لیے نہیں لگائ گئی کہ ان عورتوں کو تعداد کا کوئ تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں، بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہرسکتی ہے جب کہ لونڈیوں سے تمتع کے لیے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو؟

بعد کے زمانوں میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا لیا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف تھا۔ کوئ رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشاء کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لیے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کرسکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے۔

---

[108] **سنن دار قُطنی بروایت ابو سعید مقبری**

جنسی تعلیم کےدوتناظراوربہتی دانشوری

از: عزیز ابن الحسن[109]

ہمارے سوشلستان میں دانشوری چھاجوں کے حساب سے برستی ہے بس ذرا موقع آنے کی دیر ہوتی ہے اور پھر دانشور حضرات بہہ نکلتے ہیں،اور تھوک کے حساب سے ہر طرح سے بہتے ہیں بلکہ ہر طرف سے بہتے چلے آتے ہیں۔ جب سے ننھی زینب پر قیامت ٹوٹی ہے دانشورانہ تنقید، تنقیص، نکتہ چینیوں، تبصروں اور مفت مشوروں کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ حکومتی نااہلی پولیس کرپشن اور نفاذِ قانون کی خرابیوں سے لیکر روایتی فقہ تک کے نقائص بیان کرنے کے موقعے نکل آئے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ اب سیکس ایجوکیشن کے متوالے ماہرین بھی اپنے اپنے سینٹر چوراہے کے بیچ کھول کے بیٹھ گئے ہیں۔

اس کائیں کائیں سے تو یوں لگتا ہے کہ ننھی زینب اور اس جیسے دیگر معصوموں کے ساتھ جو گھناؤنا سلوک ہوتا ہے وہ صرف اس سبب سے ہوتا ہے کہ ان کے پاس سیکس ایجوکیشن نہیں ہوتی ہے۔کوئی ان سے پوچھے کہ خدا کے بندو! سات سالہ زینب اگر سیکس ایجوکیشن میں سند یافتہ ہوتی تو کیا وہ اس درد ناک انجام سے بچ جاتی؟ حقیقت یہ ہے کہ اسطرح کے واقعات کا سبب صرف سیکس ایجوکیشن کا فقدان نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔

جہاں تک جنسی تعلیم کا تعلق ہے ہمارے روایتی نظام تعلیم و تربیت میں یہ ہمیشہ سے نصاب کا حصہ رہی ہے، سیدھا سا اصول یہ ہے کہ جو شے زندگی میں جس حد تک ضروری ہے دین میں اس کی تعلیم کا بندوبست بھی اسی حد تک لازمی مانا جاتا ہے، جنس چونکہ کل انسانیت کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے بلکہ زندگی قائم ہی اسی کے وسیلے سے ہے لہٰذا اسکی تعلیم سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہاں سمجھنے کی بات صرف یہ ہے کہ ہمارے روایتی معاشروں میں شروع سے بطور نصاب و مضمون سیکس ایجوکیشن کا الگ سے کوئ شعبہ یا اس کا کوئ رنگ رنگیلا عنوان نہیں ہواکرتا تھا بلکہ عام دنیاوی و اخلاقی تعلیم (جس کے مجموعے کا نام دینی تعلیم ہے) ہی کا ایک لازمی جز جنسی تعلیم بھی ہوا کرتی تھی۔

جیسے بچے بچیاں بلوغت کی عمر کو پہنچتے تو وہ اپنے گھر میں ہی عام گھریلو تربیت کے دوران یا کسی باعتبار استاد/استانی سے سیکھتے تھے،ہمارے ہاں اس موضوع کی موقع برمحل تربیت کا فریضہ والدین یا گھر ،خاندان کے بڑے سرانجام دے دیا کرتے تھے۔ ہمارے اسی روایتی نصاب کا ایک نمونہ ''بہشتی زیور'' نامی کتاب بھی ہے جس پر، اسی ایک پہلو کے سبب، اور تو

---

[109] دانش ڈاٹ پی کے

اور آج کے جدید تعلیم کے متاثر مولویوں کو بھی ناک بھوں چڑھاتے دیکھا سکتا ہے۔ باقی جہاں تک جدیدیت زدگان کی بات ہے تو ہمارے ممدوح حسن عسکری صاحب (جو بعد میں تو مولانا اشرف علی تھانوی کے بہت قائل ہوئے) نے بھی ایک زمانے میں بہشتی زیور کو اسلیے اٹھاکر گھر سے باہر پھنکوا دیا تھا کہ لڑکیاں اس سے جنسی لذت سیکھتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے پرانے نظامِ تربیت میں جنسی تعلیم کا پورا پورا اہتمام موجود رہا ہے۔

ہمارے یہاں جو سیکس ایجوکیشن والے آج کل پھر سے موقع پاکر بہت متحرک ہوگئے ہیں ان کی سیکس ایجوکیشن کا شعور لامطلوب حمل یا زیادہ سے زیادہ جنسی بیماریوں سے بچنے کیلیے غلاف کے استعمال کے طریقے سکھانے تک محدود پایا جاتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے آزادانہ ماحول میں جہاں دافع مرض و مانع حمل امور میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اسے آزمانے کے مواقع بھی وافر طور پہ دستیاب موجود ہوں۔ جبکہ ہمارے روایتی نصابِ تعلیم میں جنس کو ہمیشہ اخلاقی حدود کا پابند مانا گیا ہے اور اسی لیے ماحول اور استاد کی اہلیت کو بھی سختی سے مدنظر رکھا گیا ہے۔ اُس مذہبی شعور کے نزدیک جنس ایک "مقدش شے" ہے، چونکہ ہر مقدس شے تقدیس کے پردے میں رکھی جاتی ہے اسلیے جنس کی تعلیم بھی مقدس ماحول چاہتی ہے۔

اس کے برعکس جدید ماہرینِ تعلیم و جنسیات کے نزدیک جنس کا تقدس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ اسمیں ہر طرح کی آزادی کو روا سمجھتے ہیں، وہ اسکی تعلیم کے لیے بھی کسی خاص اخلاقی ماحول و مخصوص مدرس کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک اصل خرابی میں نہیں بلکہ اسکے عواقب میں ہے۔ سیکس ایجوکیشن کے جدید شعور ماورائے مناکحت تعلق[110] کا اصل ہدف گناہ سے بچنا نہیں ہے بلکہ گناہ کے نتائج اور نشانات کو منظرعام پر آنے سے روکنا ہے۔

کیونکہ جدید شعور میں گناہ تو کوئی شے ہوتا ہی نہیں ہے، بلکہ احساسِ گناہ ہی انکے نزدیک اصل خرابی مانی جاتی ہے، ان کے نزدیک باہمی رضامندی سے ازادانہ جنسی تعلق قائم کرنا ایک صحتمند تفریح سے زاید کچھ نہیں ہے، اور اس آزادانہ تعلق کو موجب گناہ سمجھنا بذاتِ خود ذہنی امراض پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، لہٰذا اب گناہ کو ختم کرنے کے بجائے احساسِ گناہ سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

کبھی آپ غور فرمائیے تو پتا چلے گا کہ مانع حمل اور دافع امراض کی جدید تحلیل نفسی[111] پر مشتمل کاوشوں سے پیدا ہونے والے جدید شعور کا ایک بہت بڑا حصہ احساسِ گناہ کو جنم دینے والے اسباب کو ختم کرنا ہی ہوتا ہے، آج ہمیں جو گڈ ٹچ[112] اور بیڈ ٹچ[113] کی جو اصطلاحات بتائی جارہی ہیں اس کا مقصد شاید بچوں

[110] **Extra marital relations-**

[111] **Psycho analysis-**

[112] **Good Touch.**

[113] **Bad Touch.**

کو غلط ہاتھوں سے محفوظ بنانا یقیناً ہوگا مگرہمیں اپنے موجودہ معاشرے میں سیکس ایجوکیشن عام کرنے کی اصل غایت جو سمجھ آتی ہے وہ جنس کے بارے میں کسی اخلاقی معنویت کو فروغ دینے کے بجائے ایک خاص من چاہی محفوظ جنسی لذت کے حصول کو عامتہ الناس و خاص سب کے لئے انھیں آسان ،قابل رسائی بنانا ہے اور ساتھ ساتھ بالجبر زنا کو زنا بالرضا کردینے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔
یاد رہے کہ جدید شعورِ کے لئے جنس کا مسئلہ یک زوجیت اور تقدیسِ جنسی نہ کبھی تھا نہ اور نا کبھی ہوگا۔ اسے کثیر زوجیت سے بھی کوئی پرخاش نہیں اسے اصل اختلاف جنس کو تقدیسی حدود (پردہ و نکاح) کا پابند بنانے اور اسکے بے محابا تمتع پر پابندی سے ہے۔

اِس ذہن کے نزدیک تو جنس اب موبائل فون جتنی نجی شے بھی نہیں رہی ہے، رابرٹ موگابے کا مشہور جملہ ہے کہ:

"ہم ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس میں عاشق و محبوب ایک دوسرے کے پرائیویٹ پارٹس تو چھو سکتے ہیں مگر موبائل فون نہیں چھو سکتے ہیں کیونکہ وہ ایک پرائیویٹ شے ہے"
یہ نسل جدید سیکس ایجوکیشن ہی کی تیار کردہ ہے روایتی مذہبی نظام تعلیم کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی ہے لہذا جنسی بے راہ روی،اسکے افسانے ،اسکے نتایج و شاخسانے،جنسے حمکے،زنا بلجبر سب اسی موجودہ جدید مغربی تہزیب و تمدن کے ہی مسلمہ نتایج و عواقب ہیں۔

یہی وہ زاویۂ نظر و دائرہ عمل ہے جہاں روایتی جنسی تعلیم اور جدید سیکس ایجوکیشن کے تصورات کا بنیادی تعارض واقع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی جائز مسئلے کو بھی بنیاد بناکر سیکس ایجوکیشن عام کرنے کی باتیں ہوتی ہیں تو روایتی مذہبی ذہن کو اس مطالبے میں بوئے فساد پھیلتی نظر آتی ہے۔

.

جنسی تعلیم کی بحث: مقلدینِ جدیدیت اوراہل مذہب

از:خالد ولی اللہ لغاری[114]

قصور کے حالیہ اندوہناک سانحے کے پس منظر میں، مذہبی اور روایتی فکر کو جدید مغربی فکر کے حامیوں کی طرف سے کئے جانے والے جنسی تعلیم/ سیکس ایجوکیشن کے پرزور تقاضوں کے بارے میں جو تحفظات درپیش ہیں انکو قبلہ عزیز ابن الحسن صاحب[115] نے اپنے ایک مضمون میں بیان فرمادیا ہے۔

مصنف کے مطابق ہماری روایتی مذہبی اخلاقی تعلیم کے اندر سیکس ایجوکیشن کا جزو ہمیشہ سے شامل رہا ہے اور اس اہم جزو کیلئے ہمیں جدید دنیا سے مواد مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے، جدید مغربی فکر جو خدا بیزاری کے محور پر گھومتی نظر آتی ہے، اپنے حامیوں کے بل پر سیکس ایجوکیشن کے نام پر ہمارے ہاں ایک ایسے بے مہار سماج کی تشکیل کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں جو ایسا سماج ہونا چاہئے جو عملی و نظری طور پر بیزاریِ خدا کی فکر کا ایک عملی مظہر ہو، اور جہاں گناہ اور ثواب کا تصور سرے سے ہی ہی مٹ کر رہ جائے۔

جہاں احساس گناہ کو بیماری سمجھا جائے،اور جہاں افراد ہر قسم کی جنسی اخلاقی پابندیوں سے مکمل آزاد ہو کر نیم حیوانی زندگی بسر کرسکیں، سیکس ایجوکیشن کے پرزور حامی دوستوں نے اس مضمون پر کافی تنقیدی تبصرے فرمائے ہیں [116]۔ اور جن میں اصل موضوع بحث کو تو کم ہی چھیڑا گیا ہے اور ادھر ادھر کی شاعرانہ باتوں پر زور رکھا گیا ہے، جبکہ ان حضرات نے اپنی پوزیشن بھی واضح نہیں کی ہے کہ وہ بلآخر کس درجے کی آزاد جنسی تعلیم کو درست سمجھتے ہیں، اس درست سمجھنے کے پیچھے کونسے معیارات برسر عمل ہیں؟ اور ان معیارات کا ماخذ کیا ہے؟اسی دوران ایک دوست نے سیکس ایجوکیشن کی ایک نصابی کتاب سے، جو بعد میں پتہ چلا کہ مصر کے کسی انٹرنیشنل سکول میں پڑھائی جاتی ہے اور اس پر وہاں اعتراض بھی کیا گیا تھا، ایک صفحے کی تصویر تبصرے کے طور پر لگا دی جس میں خاندان کی مختلف قسموں کے متعلق بچوں کو تصاویر کی مدد سے سمجھایا جاتا ہے۔

یوں تو کسی نصاب کے سامنے آجانے پر ہی کوئی موثر تنقید ممکن ہے تاہم اسی تصویر کو نمونہ کے طور پر اگر فرض کرلیا جائے تو کچھ ضروری نکات دونوں طرف کے بیان ہوسکتے ہیں،

---

114 دانش۔ڈاٹ۔پی۔کے

115 مضمونِ اشارہ کردہ اس مضمون سے قبل اسی مجموعے میں موجود ہے۔معج

116 سیکس ایجوکیشن کیا ہے اس پر کئی ایک ڈرامہ سیریلز مغرب میں بن چکی ہیں کہ اس مضمون کی وہاں کے اسکولوں میں تعلیم و تحصیل کے ضمن میں کیا مسایل درپیش ہوتے ہیں اور اسکے نتایج بلآخر کیا پیدا ہوتے ہیں۔

جدید فکر اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے سماج کے انتہائی مظاہر میں یہ بات سبھی کے مشاہدہ میں ہے کہ گناہ کو گناہ سمجھا نہیں جاتا ہے،جیسا کہ قبلہ عزیز صاحب نے بھی اس بابت اشارہ فرمایا تھا کہ اصل مسئلہ یہ درپیش ہے کہ اس فکر کے حامل افراد کے نزدیک یہ یا ان سے مشابہ امور سرے سے گناہ ہی نہیں ہیں، بلکہ یہ کسی کا سماج سے منتقل درون خانہ انفرادی احساس گناہ ہے۔

اس مضمون کے ضمن میں کی جانے والی بحث، اپنی اصل میں، احساس گناہ کو بیماری سمجھنے والی "جدید" فکر اور احساس گناہ کو توبہ کی لازمی شرط سمجھنے والی مذہبی فکر کے مابین ہے،اس تصویر میں بچوں کی تربیت کی غرض سے "خاندان" کا تصور بیان ہوا ہے، یہ ایک نمونہ ہے،اس ایک نمونے کے حوالے سے ہی اگر بات کی جائے، تو مذہبی ذہن کو بوجوہ ان میں سے چند تصورات قابل قبول نہیں ہیں۔مذہبی ذہن واضح الہامی ہدایات کی بنیاد پر ان اقسام کی چھانٹی کرتا ہے اور ایک قسم کو درست جبکہ دوسری مقابل قسم کو واضح طور پر غلط کہتا ہے، مقلدینِ جدیدیت کا البتہ معاملہ اس امر و بحث میں کافی گنجلک و پیچیدہ ہے۔

ہمارے جدید لوگوں میں سراسر یا سرتاپا جدید تو اس حوالے سے شاید کوئی بھی نہیں ہے کہ فیملی کے اس تصور کو من و عن درست جانیں یا "ماورائے مناکحت" جنسی تعلقات کو اپنی اولاد کےلئے بھی روا رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں یا اس رویے کا کھلا ڈھلا پرچارکرتے ہوں،اگر چہ وہ نیم جدید ہی کیوں نہ دکھیں ہمیں اکثر و بیشتر، ان نیم جدیدیوں کی نفسیات پر غور کریں تو واضح ہوجاتا ہے کہ یہ لوگ ایک ٹرانزیشن یو ذہنی تبدیلی کے فیز سے مسلسل گذرتے رہتے ہیں۔ کوئی اس ٹرانزیشن کی سیڑھی کے نچلے زینوں پر براجمان ہوتا ہے تو کوئی اوپر والے درجے پر فایض ہوتا ہے۔

نیچے والے اوپر والوں کو حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور اوپر والے نیچے والوں پر غراتے رہتے ہیں، اس طرح کے مدارجی فرق کے باوجود بہرحال اتنی تبدیلی سبھی نیم جدیدیوں کے اندر آچکی ہوتی ہے کہ دین، اور اسلام، اور روایت کے عنوان سے جو بات بھی ہو، یہ ان سب سے شدید بیزار نظر آتے ہیں اور جدیدیت کے عنوان سے جو کچھ بھی سامنے آجائے اسکے آگے بِچھے چلے جاتے ہیں، آج کل تو دیکھا جاتا ہے کہ اس بیزاری کا اظہار بھی اب ایک آرٹ کا درجہ اختیار کرچکا ہے، کیونکہ جولوگ نیم جدید ہوتے ہیں اانکی نیم جدیدیت کی کمیت و کفیت اور انکی شدت بھی حسب ضرورت و ذائقہ تبدیل ہوتی رہتی ہے،یہ حضرات برملا دین و روایت کے خلاف لکھنے کا نا تو اپنے اندر وہ مطلوب شرح صدر پاتے ہیں نہ اپنے سے باہر وہ سازگار ماحول، چنانچہ زیادہ تر اشاروں اور کنایوں سے اور ادھر ادھر کی مثالوں سے نیم جدیدیت کی مذبذب مذہب بیزاری کا اظہار ان سب میں درون خانہ جاری و ساری رہتا ہے۔

اس طبقے کے ساتھ پڑھنے دیکھنے والے ان سے نیم متاثر حضرات ان بیانیوں میں سے مذہب بیزاری کی من پسند مہک کو فوراً سونگھ لیتے ہیں اور صورت حال کے مطابق مصرع اٹھاتے یا تالیاں پیٹتے جاتے ہیں اور یہ کافی دلچسپ تماشا ہوتا ہے،

سنجیدہ جدیدیوں کو چاہئے کہ ایک تو جدیدیت کی سیڑھی کے اس زینے کا تعین فرمادیا کریں کہ جس پر وہ قدم رنجہ افروز فرمائے ہوئے ہوتے ہیں، کہ وہ آج کس اونچائی پر واقع ہیں اور آئیندہ انکے ارادے تنزل کے ہیں یا صعود کے ہیں؟۔

یہ گروہ دو باپ اور ایک لے پالک بچہ" والی جدیدیت کو آیا درست مانتے ہیں، یا اس کو ٹو مَچ قرار دیتے ہیں، ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ آخر کار اس سے کم کون سے درجے کو حق پر سمجھتے ہیں اور کیوں سمجھتے ہیں اور یہاں تک اترنے کی اور پھر ادھر رک جانے کی یعنی مزید نیچے نہ اترنے کی کیا وجہ بنی ہے، کس معیار کے تحت ادھر توقف فرما رہے ہوتے ہیں؟ ا نھی میں انکے کچھ ایسے دوست بھی ملتے ہیں جنکی ایک ٹانگ یہاں ہماری زینب کے دیس میں ہوتی ہے اور دوسری ناروے میں لٹکی ہوتی ہے ۔

مثلاً یہ کمال سادگی سے یہ بات سامنے رکھتے ہیں کہ دیکھو جی یورپ میں بھی ایسی ہی جنسی تعلیم دی جاتی ہے اور ہمیں تو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، وہاں سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے، بال کی کھال چھیلنے کا شوق رکھنے والے یہ سادہ دل لوگ یہاں پر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ نصاب تو فزکس اور کیمسٹری کے بھی ہمارے اور انکے ایک جیسے رہے ہیں، تو کیا تعلیم کا معیار بھی دونوں جگہوں پر ایک جیسا ہی پایا جاتا ہے؟اساتذہ ایک جیسے ،ایک ہی معیار و نیت کے ملتے ہیں؟اور کیا ان اساتذہ کی تربیت بھی ایک جیسی ہوتی ہے؟ نصاب میں مستعار جنسی تعلیم کا مضمون گھسیڑ دینے سے کیا راوی تا ابد چین ہی چین لکھے گا؟۔

مجھے یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ ہمارے کچھ اپنے ذاتی و مقامی معروضی حالات موجود ہیں، اپنا ایک خاص پس منظر اور اپنی ملکی و ثقافتی لیمیٹیشنز[117] ہیں، بحرحال ہر صورت میں ہمیں اپنا فیصلہ اپنے ملکی و مذہبی اصولوں کی بنیاد پر کرنا چاہئے، آپ کو بھلے پسندآئے یا نہ آئے اور ان اصولوں کو ہم دلیل کیساتھ اپنا دین سمجھتے ہیں، اور ہم انہی پر چلنے کی کوشش کرینگے ،اسی کو بولیں گے اور اسی کو لکھیں گے،اگر آپکو یورپ زیادہ پسند آتا ہے تو اپنی دوسری ٹانگ بھی وہیں کھینچ لیں اور وہیں جاکر رہایش پذیر ہوجائیں ۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ مذہبی حلقوں میں کم از کم اس معاملے میں یہ اصولی اتفاق پایا جاتا ہے کہ "دو باپ اور ایک لے پالک بچے" والی جدیدیت غلط قسم کی ناقابل قبول جدیدیت ہے، اور ایک ٹھوس توجیہہ کیساتھ غلط ہے، اس کے پاس اصول کی سطح پر کم ازکم تقریباً وہ سبھی نکات موجود ہیں جو اخلاقی تعلیم، بشمول جنسی تعلیم کےلئے ضروری ہوں، اسکی پوزیشن بھی اس بحث میں بلکل واضح و متعین ہے، اس ذہن کے سرکردہ لوگ مگر، عدم دلچسپی کے سبب اور کاموں میں پڑ گئے ہیں اور اخلاقی تربیت کے ایک بڑے ستون کے کمزور ہونے کی وجہ سے جو انہی کی مسلسل غفلت کا نتیجہ ہے، سماج میں اُن کی اخلاقیات کے کوئی عملی مظاہر لوگوں کو کافی حد تک مطمین کرنے کی حد تک نہیں نظر آتے، جن کو عین اسلامی کہا جاسکتا ہے۔

---

[117] **Limitation.**

الا ماشاءاللہ، مدارس کے ماحول اور مدرس کے اخلاق میں کوئی زندگی نہیں بچی ہے اور جدید دور کے تقاضوں اور بدلتی ہوئی دنیا کو سامنا کرسکنے کی اہلیت ان میں مفقود ہوگئی ہے، اور وہاں ایک ہمہ جہتی انحطاط چھایا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں بھی جدید تعلیمی تقاضوں کیساتھ کوئی ہم آہنگی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔
اب جا کے کچھ ہلچل نظر آنے لگی ہے جسکے عملی اثرات پتہ نہیں کب سامنے آئیں گے، ورنہ مدارس میں چھ چھ سال قال اللہ اور قال رسول پڑھنے والا باہر آکر روٹی کمانے کے قابل بھی نہیں ہوتا ہے، اور اکثر کمزور اخلاقیات کا حامل بھی نظر آتا ہے اور آج بھی یہی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔

مجھ جیسے عام لوگوں کا یہ حال ہے کہ یہاں وہاں فیس بک پر نعرے تو مارلیتے ہیں مگر اپنے گھر میں اسلامی تربیت کا کوئی بندوبست نہیں کرتے ہیں ، خود اپنا حال بھی یاروں کافی بے حال ہے، جھوٹ بولنا ذہانت کا معیار سمجھا جاتا ہے، چوری کرنا سمجھداری جانی جاتی ہے، رستہ روک لینا بہادری تصور ہوتی ہے اور دھوکے باز جینئیس گردانے جاتے ہیں۔
سچی بات یہ ہے کہ اخلاقیات کو کتابوں کے اندر مرصع الفاظ میں سجانے سے بات نہیں بنے گی، بلکہ انکو وہان سے باہر نکال کر اپنے اوپر لاگو کرنا پڑے گا، اپنے گھر پر نافذ کرنا پڑے گا، مذہبی ذہن کو ایک تصور نہیں ایک مثالی فرد بننا پڑے گا جو اردگرد لوگوں کیلئے آسانیوں اور خیر کا باعث بنتا ہو،شر کا سبب نہیں بنتا ہو ، جس پر زندگی کے ہر موڑ پر اعتبار کیا جاسکتا ہو، جس سے لوگ اپنے آپکو محفوظ سمجھ سکیں۔

جدید دنیا کی اصولی لامذہبیت کے مضبوط مظاہر کو، جن میں سے ایک بے مہار سیکس ایجوکیشن ہے،صرف خالی پیلی نعروں سے کب تک روکا جاسکے گا، اگر آپ اپنی اخلاقیات کو درست مانتے ہیں تو جدید دنیا کے ماحول میں اس پر عمل کرکے بھی دکھانا پڑے گا، صرف نعرے نہیں بلکہ عملی مثالیں بھی،ان حضرات سے مطلوب ہیں جب تک جدید لامذہبی مظاہر کے سامنے مثالی مذہبی شخصیات موجود نہ ہوں ، اس سیلاب کو روکنا اور اپنی درست شناخت کو قائم رکھنا ممکن نہیں ہوسکے گا۔

قندیل بلوچ کا قتل اور سیکولر نسائیت کے شور شرابے

از:عایشہ غازی

قندیل کو قندیل کس نے بنایا ؟
اس کی بے حرمت، بے قیمت زندگی اور اندوہناک موت کا ذمے دار کون ہے؟
اس بارے میں گزشتہ چند دن میں جو آرا نظر سے گزریں ہیں، ان میں اکثریت ان کی ہے جنھوں نے یہ عادت بنا لی ہے کہ کوئی موضوع ملے اور لٹھ اٹھا کر "معاشرے" پر برس پڑیں، "تنگ نظری" اور "عدم برداشت" ، دو ایسی اصطلاحات مل گئی ہیں جنھیں استعمال کرنے کے لیے کسی غور و فکر ، معاشرے کے رجحان، اکثریت کا اخلاقی معیار ، اس معیار کا ماخذ ۔کسی پہلو پر غور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، بس کچھ بھی ہو جائے ، لٹھ اٹھاؤ اور معاشرے پر برس پڑو۔

کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ قندیل کی اس مظلوم زندگی اور مظلوم تر موت میں قندیل کے اپنے لیے چنے گئے راستے کا کتنا ہاتھ تھا.؟ کسی نے معاشرے کی بچیوں کو یہ نہیں بتایا کہ برائی کے دو !منطقی انجام ہوتے ہیں ، توبہ یا عبرت آمیز ہلاکت؟
کسی بھی رائے کو عادت بنا لینے میں سوچنا سمجھنا نہیں پڑتا ہے، بلکہ بہت حد تک حالات کو اپنے اوپر لاگو کر کے نہیں دیکھنا پڑتا ہے، اپنے اوپر کوئی عقل کا معیار مقرر کرتے ہوئے اپنی عقل کا مواخذہ نہیں کرنا پڑتا ہے، رائے جب عادت بنا لی جائے تو فہم بے کار ہو جاتا ہے، لیکن یہ بھی تب ہی .سمجھ آتا ہے جب فہم کہیں مستعمل ہو،
عمومی آرا تو یہ ہیں کہ قندیل کو معاشرے نے قندیل بنایا ہےمگر کیسے ؟ ہمیں عموماً اس کا جواب نہیں ملپاتا ہے
کیا یہ معاشرہ اتنا غلیظ ہے کہ اس معاشرے میں رہنے والی عورت جب تک سر بازار جسم کی نمائش نہ کرے، وہ عزت سے زندگی نہیں گزار سکتی ہے؟

کیا یہ وہی معاشرہ نہیں جس میں باپ بھائی شوہر عورت کو ضروریات زندگی اور حفاظت مہیا کرنے کی غیر مشروط اور غیر معینہ ذمے داری اٹھاتا ہے؟
کیا قندیل کے پاس باعزت زندگی گزارنے کا کیا کوئی اور آپشن نہیں تھا؟
اور جو راستہ اس نے چنا تھا، اس راستے پر اس کو لانے والے کون لوگ رہے ہیں؟
کیا یہ وہی لوگ نہیں ہیں جو بدلتی ہوئی اقدار کے باوجود معاشرے میں مطعون سمجھے جاتے ہیں؟
جو لوگ قندیل جیسی اونچے خواب دیکھنے والی عام لڑکی کو اس کے خوابوں کے پیچھے بھگاتے ہوئے تاریک راستوں تک لے جاتے جا بجا جدید پاکستانی و بھارتی چکا چوند میڈیا کی صنعت میں دیکھے جاسکتے ہیں،اور جو ان شہرت کی ماری لڑکیوں کو بازار میں رکھی انٹرٹینمنٹ کا آیٹم نمبر بنا کر رکھ دیتے ہیں،۔

کیا یہ معاشرہ انھیں ان حرکات و سکنات پر شاباشی دیتا ہے؟اگر ایسا ہی ہے تو تو پھر ہر معاملے میں معاشرہ ملعون کیوں سمجھا جائے ؟
کیا یہ ہر لمحہ خود کو لعن طعن کرتا ہوا رویہ ایک نفسیاتی بیماری نہیں ہے جسے لوگ اب رائے کی عادت کے طور پر اپناتے جا رہے ہیں؟
قندیل کے معاملے میں انٹرنیشنل میڈیا نے جس طرح پاکستانی معاشرے کو رسوا کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی ہے. اسے عورتوں کے حقوق کی مدعی بتاتے ہوئے نا میڈیا یہ سوچتا ہے اور نہ ہی ہمارے معاشرے میں موجود مغربی میڈیا کے اندھے پیروکار یہ سوچتے ہیں کہ قندیل عورتوں کے کون سے حقوق کی جنگ لڑ رہی تھی؟ اور کون سے حقوق اس نے مانگ تانگ کر انکے لئے حاصل کئے تھے؟
اور اس سارے قصے میں مولوی کیسے دشنام کی زد میں آ گئے حلانکہ قندیل کو جدید معاشرت،خواہش کی جدید صنعت گیری نے ہی سب کچھ کیا اور اسی کے گھر کا فرد اسکے قتل کا سبب بنا؟

نہ تو قندیل کو قندیل بنا کر زندہ کھانے والے مولوی تھے اور نہ اسے بہیمانہ طریقے سے قتل کرنے والا کوئی مولوی تھا، بلکہ اس کا باپ تک کوئی مولوی نہیں تھا بلکہ غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگ کہ یہ ایسا باپ تھا جو بیٹی کو بیٹا کہہ کر اس کی کمائی کھاتے ہوئے آنکھیں موندے چارپائی پر موندھا پڑا رہا تھا کہ چونکہ اسکا بیٹا معاشرے میں ان ذرائع سے پیسہ نہیں کما سکتا ہے جن تاریک راستوں سے اس کی بیٹی گزر رہی ہے. ہاں اگر کسی مولوی[118] نے قندیل کو متبادل راستہ دکھانے کے بجائے اس کے ساتھ سیلفی لینے کو ترجیح دی تو اس مولوی کو مولویوں سے لے کر غیر مولوی طبقے تک، سب نے لعن طعن کیا اور اس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے،اور ویسے بھی کیا اس مجرم مولوی کا یا اسکی مولویانہ معاشرت،طرز زندگی، اور فکری زاوئے سے کہیں سے بھی اسکا کسی مروج و نارمل مزاج مولوی سے کوئی تعلق و معاشرت بنتا نظر آتا ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک فرد کی پیدا کرہ برائی کو معاشرے کا مجموعی چہرہ بنا کر پیش کرنا، اگر سوچی سمجھی سازش نہیں ہے تو کم سے کم ایک بد ترین ناانصافی ضرور ہے.
اچھا، برا یا بہت برا، پاکستان بہرحال اکثریتی آبادی میں مسلمان ملک ہے اور اس معاشرے میں معیار ، حقوق اور فرائض بہرحال وہی تسلیم ہونے چاہییں جو اللہ و رسولؐ نے ہمارے درمیان مقرر کر دیے ہیں۔اور بہ حیثیت مجموعی یہاں وہ بڑا طبقہ جو خود کو اور اپنے اعمال کی برائی ،بدصورتی اور مکروہیت کے باوجود اسلامی معاشرت و اقدار کا دلی و جسمانی منکر نہیں ہے کی موجودگی میں بیرونی معاشرت و ثقافت کی پیوندکاری کرنے کی کوشش کوئی احسن عمل نہیں ہے[119]اور شہر ہو یا دیہات انھی اقدار پر ہی کسی نا کسی شکل میں معاشرے کی عظیم اکثریت چلتی نظر آتی ہے، اگر اللہ کے معیار ہی حرف آخر ہیں تو عقل کا جھگڑا کیوں کیا وہ اسی خدا کی تخلیق نہیں ہے؟ بہرحال کسی اور انسان کی عقل میرے لیے معیار مقرر کرنے کے قابل نہیں ہے، ویسے ہی جیسے میری عقل کسی اور انسان کے لیے معیار مقرر نہیں کر سکتی ہے،ایسے میں فلاح صرف اللہ کے مقرر کردہ معیار ہی کو مان لینے میں ہی پنہاں ہے۔

[118] مفتی عبدلقوی جیسے رنگین مزاج صاحب الفت و دل پھینک کی طرف اشارہ ہے ۔معج

[119] معج

ویلنٹائن ڈےاور مردار تہذیب کی دستک[120]

از:-----------------------------

وہ دن لد گئے جب ہم مغرب سے کہا کرتے تھے کہ تمہاری تہذیب آپ اپنے خنجر سے خودکشی کرے گی، اور وہ ہمیں ساتھ لیے بغیر مرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے ہیں، اورہم ان کے بغیر جینے کے روادار بھی نہیں ہیں اور ناجانے یہ موت کب سے ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے۔

کلچرل گلوبلائزیشن' کی حالیہ رفتار سے اگر آپ واقف ہیں، تو ہرگز بعید مت جانئے کہ ہم جنس 'پرست بن مانس اور بچھو کل قریب آپ کی اِنہیں گلیوں محلوں میں پھٹی ہوئی جینزوں کے ساتھ جلوس نکالتے پھرینگے اور چڑانے پر آپ کو اور آپ کے آباؤ اجداد کو بدتہذیبی اور بدفعلی پر آپکو خالی بس ناک چڑانے تک محدود کرنے لگیں گے ،بلکہ تہذیب کا یہ آخری گھونٹ بھی زبردستی آپ کے حلق سے اتاروانے کی کوشش کریں گے۔

ایسی ہی نظریاتی پستی کی تنگ و تاریک نہایت کالی، باؤلی آندھی اب ہر ملک کے دروازے بلا جھجھک کھٹکھٹا رہی ہے ،ہم فیکھتے ہیں کہ یہ لبرلسٹ، سیکولر، جدت پسند سب اپنا اپنا کام کریں گے اور تاریخ کے اِس فسادِ عظیم کے لئے راستہ صاف کرکے رخصت ہوجاینگے، ان کے پاس سب لوگوں کے لئے اخلاقی پستی کا ایک ہی جنسی آزادی کا آل ان ون پیکیج موجود ہے ،جسکی اصل رضامندی پر استوار جنسی تعلقات ہیں ،جسمیں ہر قسم کی سماجی و قانونی قدغن اس تہذیب میں غیر معقولی جانی جاتی ہے ،لہٰذا اس پیکیج کو لازما انکی رو سے ہر ایک کو اپنانا ہو گا جیسا کہ اس کی صارفانہ اقدار پر سوز اصرار کرتی ہیں کہ ہر کسی کو یہ پیکیج پورے کا پورا لینا ہو گا،نا ہی یہ لوگ اپنی ایمانیات کی رو سے کسی کے لئے اسے مسترد کرنے کی گنجایش مستقبل میں چھوڑیں گے ورنا آپ اس تہذیب میں بد تہذیب سمجھے جاینگے اِس پیکیج کے حصے کرنا ممکن نہیں ہے،[121]
اگر چہ سرخ سویرا' بیت چکا، اب وہ سب بھاڑے کے لکھاری، ادیب، دانشور، اینکر، گویے، ' بھانڈ، ڈھولچی اب اِس 'کالے سویرے' کے بگل بردار نظر آتے ہیں۔

حضرات! اگر آپ اِس کالی آندھی کے مقابلے پر نہیں اٹھیں گے، تو بِجو اور سور آپ کے مال روڈ، لبرٹی اور آپ کے سوک سینٹرز کے آس پاس نکلنا ہی چاہتے ہیں۔ اِس جدید بدبودار مخلوق کی 'ذات' کیا ہے؟

---

[120] **بشکریہ: ایقاظ**

[121] **معج**

سید قطب کے الفاظ میں:

''دن کے وقت مشین، رات کے وقت حیوان، اور حیوان بھی ایسا ویسا نہیں '' این جی اوز نے حرام کے بچوں کےلیے پہلے ہی 'کریڈل' نصب کر لیے ہیں ایک سماجی جنگ کا گھمسان پڑا ہے جبکہ ہمارے 'صالحین' اپنی نیکی کے نشے میں بد مست ہیں،
آپکی شریف زادیوں کے سر کی چادر تو کب کی فسانہ ہوگئی، اور خدابخشے وہ اپنے ساتھ نہ جانے اور کیا کچھ لےگئی ہے ، بس یہ دیکھئے اتنا سا لباس بھی آپکی اِس آبرو کے تن پر کب تک سلامت رہتا ہے۔

تعلیم' کا عفریت اور 'ابلاغ' کا بھیڑیا کس فنکاری اور مشاقی کے ساتھ ہم نمازیوں، روزہ داروں، ' حاجیوں، عبادت گزاروں اور علماء وفضلاء ومبلغین کے زیرِتماشا ہماری بچی کا لبادہ نوچتا چلا جارہا ہے۔، کیا ہوا، ہماری بیٹی سربازار ''لباس'' اور ''روایات'' کے بوجھ سے ہلکی ہی تو کی جارہی ہے؟ کیوں کہ غیرت تو اب قصہ پارینہ بن چکی ہے، ہرسال اس فیبرک کے کچھ ہی تَند نکالے جاتے ہیں! ہوتے ہوتے بہت اترا پھربھی 'مغرب جتنا' نہیں ہوا آپ خوامخواہ پریشان ہوتے ہیں، وہاں تو آپ کو پتہ ہے
خاطر جمع رکھئے، سب اُدھر ہی کو جارہے ہیں، ایک دم برہنہ تو نہیں ہوئی ہماری لختِ جگر۔؟

پورا سو سال لگا 'اتنی سی برہنگی اختیار کرنے میں ہماری تہذیب کو ،مغربی کلچر کہتا ہے دیکھو دیکھو کوئی زبردستی تو نہیں ہوئی ہماری جانب سے جو کچھ ہوا ارتقاءتعلیم و تربیت سے ہوا ہے، جتنا ہمیں ہضم ہوا اتنا ہی برہنا ہی ہوئی، ہاں اب ہمارا 'ہاضمہ' تیز کرنے کی وہ زوداثر خوراکیں جو 'انفرمیشن ریوولیوشن' کی پڑیوں میں ڈال کر ہمیں بیچی جارہی ہیں اپنا جادو دکھانے لگیں ہیں۔

نہ جانے فری میسن اِس بار اتنی مطمئن کیوں ہے اپنی شریف زادیوں کی ایک برہنگی ہی کیا، اب تو ویلنٹائن، کنڈوم کلچر، شوقیہ قحبہ گری، 'سیکس ایجوکیشن'، لِزبینز اینڈ گیز، کنواری ماؤں کو 'قبول' کروانے کی انسانی ہمدردی کی تحریکیں اور نہ جانے کیا کیا ہمیں ''ہضم'' ہوجانے والا ہے، فکر مت کیجئے! پیکیج سبکا ایک ہی ہے۔ بس یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے صاحب! یہ سب متلی جو 'کنواری ماؤں' کا لفظ سن کر فوراً آپ کے حلق کو آپہنچتی ہے، اس پیکیجی پُڑی' کے اثر سے زائل ہوجانے والی ہے۔

بھلا آپ کوئی پہلے 'مریض' تھوڑی ہیں، اس سے پہلے بھی اس ضمن میں بڑی بڑی ذاتی تہذیب کی دعوے دار قوموں کا کامیاب علاج کیا جاچکا ہے، انکی رو سے معالج کی مہارت پر شک کرنے والا کوئی احمق جاہل ہی ہوسکتا ہے اور اس پر پردہ ڈالنے والا زندیق منافق ہی تصور ہوگا ، بلکہ ابلیس نے درست ہی سوچا ہے۔

حضرات یہ خاموشی آخر کب تک؟
اٹھیے۔ بولیے۔چیخیے... چودہ فروری آپکی تہذیب کا لٹمس ٹیسٹ ہے۔
رونا اس بدکار میڈیا پر نہیںہے بلکہ رونا اس بات کا ہے کہ آج ہماری مسجدوں، منبروں اور محرابوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

روشن خیالی کے لبادے میں فرقہ پرست

از: عمران شاہد بھنڈر[122]

پاکستان ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں روشن خیالی اور فرقہ پرستی کے مابین تفریق محض ان دو الفاظ کی تفریق کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھنے کو ملتی ہے، روشن خیال طالبان پر تنقید کرتے ہیں، جبکہ حقیقت میں ان کی تنقید کا اصل محرک ان کی روشن خیالی نہیں بلکہ ان کی فرقہ پرستی ہے،

انکا گہرا تضاد یہ ہے کہ یہی روشن خیال فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کی دہشت گردی، لوٹ مار، بد عنوانی اور غنڈہ گردی پر یکسر خاموشی اختیار کرلیتے ہیں، وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ طالبان پر تنقید کے دوران ان کے اندر کا فرقہ پرست جاگ پڑتا ہے اور وہ روشن خیالی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے، لیکن سیاسی جماعتوں کی دہشت گردی پر ان کے اندر کا فرقہ پرست مکمل طور پر مطئمن رہتا نظر آتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ تو نو : گیارہ کے بعد کی طالبانی[123] دہشت گردی کا طالبان کے پاس یہ جواز موجود تھا کہ پاکستان کے حکمرانوں نے یوٹرن لے لیا ہےاور طالبان کے قتال کے لیے امریکی اور اتحادی سامراجیوں کی مدد بھی کی تھی ، یہ بات دو برس کا بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ جواب میں طالبان نے پاکستانیوں کو پھولوں کے ہار تو پیش نہیں کرنے تھے، اس تناظر میں طالبانی دہشت گردی کی سمجھ تو بہرحال آتی ہے۔

کراچی میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو کیم کی دہشت گردی کے حوالے سے یہ روشن خیالی کا لبادہ اوڑھے ہوئے فرقہ پرست ہمیشہ خاموش رہتے دکھتے ہیں اور الٹا فوج پر تنقید کرکے ان سیاسی جماعتوں کی دہشت گردی کی پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم نے سندھ (کراچی) میں بارہ سے پندرہ ہزار لوگوں کا قتال کرکے بدترین دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے؟

---

[122] صاحب تحریر ماضی میں روزنامہ ایکسپریس کے کالم نگار رہ چکے ہیں،جہاں یہ مغربیت و جدیدیت پر فلسفیانہ محاکمہ فرمایا کرتے تھے،انکا جھکاو کافی حد تک مارکسی فکر کی طرف نظر آتاہے،اور ادبی تنقید انکا خاص میدان ہے۔معج

[123] صاحب تحریر نے یہاں کئی امور کو اپنی جذباتیت میں فراموش کردیا ہے،جس میں تحریک پاکستان اور تحریک طالبان افغانستان کی نظریاتی تفریق، کو مد نظر نہیں رکھا گیا ہے جبکہ ساتھ میں ان دونوں میں مقصد حیات کی تفریق کرنا بھی اہم ہے باقی ان دونوں گروہوں میں صرف اصطلاح طالبان کی شرکت نے معاملہ انکی نگاہ میں خلط مبحث کردیا ہے،تحریک طالبان افغانستان ایک مادر وطن کی آزادی کے لئے لڑتا مرتا جھاد کرتا گروہ ہے جبکہ تحریک طالبان پاکستان،ایک دہشت گرد،خونخوار،باغی گروہ ہے۔یہ الگ بات ہے کہ فروع و مسلکانہ روش میں دونوں احناف کے مسلک دیوبند سے فقہی وابستگی رکھتے پائے جاتے ہیں۔معج

کیا ان جماعتوں نے کراچی شہر کو خوف و ہراس کا گہوارہ نہیں بنا رکھا تھا؟
کیا ان جماعتوں نے دہشت گردی کے علاوہ بھتہ خوری، منی لانڈرنگ، ٹارگٹ کلنگ اور زمینوں پر قبضے نہیں کیے ہیں؟

کیا ان سیاسی جماعتوں نے اسلحے کے ذخائر جمع نہیں کررکھے ہیں اور دہشت گردوں کو فنڈنگ کا باقاعدہ انتظام نہیں کررکھا ہے؟
اگر ان سب سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو یہ روشن خیالی کا لبادہ اوڑھے ہوئے دہشت پسند فرقہ پرست ان سیاسی جماعتوں کو ان کے قبیح افعال کا جواز کیوں فراہم کرنے میں مگن ہیں؟ صرف اس وجہ سے کہ کراچی کی ان دہشت گرد جماعتوں سے ان کی فرقہ ورانہ ہم آہنگی ہے؟ یا پھر وہ سمجھتے ہیں کہ اگر پیپلز پارٹی دہشت گردی، منی لانڈرنگ، بھتہ خوری، زمینوں پر قبضے میں ملوث ہے تو کیا ہوا، فوج بھی یہی کام کرتی رہی ہے، تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ صورتحال ہمیشہ کے لیے جوں کی توں رہے؟ سب خاموشی سے اور مکمل مفاہمت کے ذریعے عوام کا قتال کرتے رہیں، لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رہے اور غیر ملکی بنکوں کو یہ سیاسی دہشت گرد بھرتے رہیں؟

یوون رڈلے(مریم) :کی مصر میں کی گئی ایک تقریر سے اقتباس

از: یوون رڈلے(مریم)

نائن الیون کے بعد مغرب چاہتا ہے کہ اسلام کی ایسی صورت گری کرکےپیش کی جائے جو مغربی ممالک کیلئے قابل قبول ہو، بلکہ مسلم اقوام کی یہ پہچان بنا دی جائے کہ وہ دشمن کے سامنے سرنڈر ہو کر اُس پر فخر کریں اور وہ اتنے حد درجے پرامن واقع ہوں کہ دُنیا کے امن وسکون میں ذرا بھی رخنہ نا ڈال سکیں، یعنی انکا مطمع نظر ہے کہ ایک ایسا بے روح اسلام سب کے سامنے آئے جو نفاذ شریعت، خلافت اور جہاد سے آزاد ہو کر لادین بزدلانہ معاشرے کو فروغ دینے والا ہو۔

ترکی، فرانس اور الجزائر میں میری بہنوں کے سروں سے چادریں اتاری جا رہی ہیں، دوسرے مغربی ممالک میں بھی مستقبل میں مسلم خواتین کو برہنہ سر کرنے پر تلے بیٹھے ہیں، میں پوچھتی ہوں کہ صاحب! اس موئے **جیک سٹرا** کو حجاب پر تبصرے کرنے کا بھلا حق کس نے دیا ہے، وہ کون ہوتا ہے جو مسلم خواتین کیلئے لباس کی تراش خراش کے احکامات جاری کرے، ہم مسلم خواتین کسی مرد کو یہ اجازت نہیں دی سکتی ہیں کہ وہ ہمارے کپڑوں کی الماری میں جھانک کر ہمارے لئے لباس منتخب کرتاپھرے۔

آج صبح قاہرہ کی اخبارات میں آپ کے وزیر ثقافت **فاروق حسنی** کا بیان شائع ہوا ہے جس میں اُس نے حجاب کو پسماندگی کی علامت قرار دیا ہے، میں حیران ہوں کہ اِن نوجوانوں کی موجودگی میں اُسے یہ جراءت کیسے حاصل ہوئی،آخر کوئی تو ہوتا جو اُس کی زبان کو لگام دیتا؟ جناب اعلیٰ اُس نے دنیا کی ہر برقعہ پوش خاتون کا مذاق اڑایا ہے، فاروق حسنی خود اسلام پر ایک بذاتِ خود کلنک کا ٹیکہ ہے، یہ ہمارے نوجوانوں کو اپنی دو رخی سے بھلا کیا پیغام دے سکتا ہے، مغربی معاشرہ جسے جنس پرستی اور نشے بازی گھن کی طرح کھا رہی ہے، اب کیا ہم عزت کے راستے کو چھوڑ کر اس کمینگی کے راستے پر چلیں؟۔

مجھے اُن نوجوانوں پر ترس آتا ہے جو مغرب سے زیادہ مغرب پرست بنتے ہیں، کیا آپ کو میں بتا نہ دوں کہ مغرب میں ایسے لوگوں کو کیا کہا جاتا ہے، کھسرے تمہارا وزیر ثقافت اعتدال پسندی کے نام پر بے غیرتی کو نہیں پھیلا سکتا ہے، اُسے فوراً مستعفی ہو جانا چاہیے، کیا اعتدال پسندی کا یہ مطلب ہے کہ ہم اسلام میں بے شرمی اور بے حیائی کے کاموں کی پیوند کاری کریں،
پچھلی مرتبہ جب میں قاہرہ آئی تھی تو شیخ ازہر علامہ طنطاوی نے مجھے محض اس لئے انتہا پسند کہا تھا کہ میں نے اُس سے مصافحہ نہیں کیا تھا۔

میں ایسے کسی فقیہ اور علامہ کی بجائے سیدھے طریقے سے اس شخصیت کی پیروی میں فخر سمجھتی ہوں جس کے نام کا میں نے کلمہ پڑھا ہے، کیا حجاب پہن کر عورت انتہا پسند ہو جاتی ہے، حیــــــرت ہــــــــے آپ کــــــــی اعتــــــــدال پســــــــندی پــــــــر نوجوانان اسلام! اس سے پہلے کہ اسلام کا یہ مسخ شدہ تصور پوری اُمت میں سرایت کر جائے ہمیں اس کـــا تـــدارک کرنـــا ہوگـــا، ملاوٹـــی اســـلام کـــی آپ کـــو قلعـــی کھـــولنی ہـــوگی، رات بھر موسیقی کے سنگ گانوں پر جھومنے اور دن کو ظلم وجبر کے خلاف مزاحمت کرنے والے مجاہـــدوں کـــا مـــذاق اڑانـــے والـــوں کـــو ہـــوش کـــے نـــاخن دلانـــے ہـــوں گـــے، سلطان صلاح الدین فاتح القدس سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھے گئے ہیں، دیکھو لوگوں ہمارے اس قابل تعظیم جری سلطان نے کیا کہا؟ انھوں نے فرمایا کہ : میرے چہرے پر مسکراہٹ کیسے آئے جبکہ بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ ہے، سوچیں آج اگر وہ ہمارے درمیان ہوتے اور ہمارے پیارے سلطان صلاح الدین اگر ہمارے نوجوانوں کی حالت دیکھتے تو وہ انہیں کیا مشورہ دیتے ہیں؟۔

مذہب اوربچوں کے قتل کا الزام

از:--------------------------------

ایک طرف سانحہ قصور کی آڑ میں جہاں باقی لوگوں کو اہل مذہب سے' پرانے بدلے' چکانے کا موقع ملا گیا ہے ، لگے ہاتھوں اسی بہانے اپنے درینہ مقاصد کو پورا کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں'اب بھلا ملحدین حضرات کیسے چپ رہ سکتے تھے؟ ، چنانچہ انکے ایک امام جو اپنے پیدا کردہ و تربیت کردہ ملحد انڈوں اور ان سے نکلے بچوں کے لیے تاریخی کہانیاں لکھنے کے حوالے سے مشہور ہیں' نے بھی چند روایات کی بنیاد پر 'ہائے یہ بچوں کے قاتل' کے نام سے ایک کہانی ترتیب دی اور نتیجے یوں بیان کیا ۔

''پیارے بچوں'' جو مذہب والدین کے گناہوں کی سزا ان کے بچوں کو دے اور انہیں جہنم برد کر کے سخت ترین عذاب کی نوید سنائے اور انبیا کو بچوں کو مستقبل کے خطرات کے پیش نظر قتل کرنے کی اجازت دے، ایسا مذہب نہ تو بچوں کی معصومیت کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی اسے کوئی اہمیت دیتا ہے، کتنا گھٹیا ہے وہ مذہب اور کتنا سنگ دل ہے وہ خدا جو بچوں کی گردن پر چھری پھیر کر اپنی ظالمانہ خواہشات کی تسکین کرتا ہے''۔

ہم گزشتہ تحاریر میں موضوع متعلقہ تقریبا ہر اعتراض کو زیربحث لاچکے ہیں ' اختتام اپنے ان اصل حریف ملحدین کے اعتراض کے جواب پر کررہے ہیں[124]۔

درخت جنگل میں بھی اگتے ہیں اورباغ میں بھی اگتے رہتے ہیں،لیکن جنگل میں جانے سے انسان ڈرتا ہے اورباغ میں جانے کو جی للچاتا ہے، جنگل میں کوئی درختوں کی دیکھ بھال نہیں کرتا لیکن باغ میں درختوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے چنانچہ جنگل میں درخت بغیر کسی ترتیب، قاعدے اورقانون کے اگ جاتے ہیں جب کہ باغ میں درخت ترتیب ، قاعدے اورقانون سے لگائے جاتے ہیں ، بس یہی مثال انسان کی ہے اگراسے دنیا میں بغیر کسی قاعدے اورقانون کے رہنے دیا جائے تو یہ دنیا کی زندگی ایک جنگلی زندگی میں بدل جائے گی اوراگر اسے کسی قاعدے اورقانون کا پابند بنایا جائے تو دنیا کی یہی زندگی امن وامان کا گہوارا بن جائے گی۔

انسانی زندگی میں انہی قواعد اورقوانین کو مذہب کہا جاتاہے، جو انسانی زندگی کی رہنمائی کر تے ہیں ،اورانہی کی پابندی انسانی نجات کا باعث ہوتی ہے ، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہماری اس انسانی زندگی کے امن وامان کو تباہ کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ انکی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ایسے تمام قواعد وقوانین ختم ہونے چاہیں جو انکے نفس کو گراں گزرتے ہیں ۔ یہ لوگ مذہب کا

---

[124] ایڈمن:الحاد۔ڈاٹ کام (مولوی ابراہیم؟)

انکار کرتے ہیں پھر اپنے انکار کو عقلمندی ودانشمندی کی چادر اوڑھانے کے لئے مختلف حیلے بہانے ڈھونڈے میں لگے رہتےہیں ، جہاں اعتراض کی گنجائش نہیں بنتی تو دور کی کوڑیاں لاتے ہیں ، ایسے ہی ایک صاحب نے بچوں کے قاتل کے عنوان سے اپنی بے بسی اور بے علمی کا اظہار کیا ہے، موصوف نے اپنی اس تحریر میں بہت کوشش کی کہ کسی مذہبی کتاب سے کوئی ایسی بات مل جائے ، جس سے بچوں پر ظلم ثابت کر کے اپنے اعتراض کے شوق کو پورا کیا جا سکے، لیکن افسوس جب کچھ نہ بن پڑا تو پھر اپنی طرف سے مقدمات قائم کئے ، ان سے نتائج اخذ کئے، اور پھرانہیں مذہب کے سرڈال دیا۔

موصوف نے اپنی تحریر میں جو بنیادی اعتراضات کئے اوران میں جو غلطیاں کیں ان کی نشاندہی سے قبل ہم آنحضرتﷺ نے بچوں کے ساتھ جو معاملات کئے اور ان کو جو حقوق دیے' چند اشاروں میں انکو ریفریش[125] کردیتے ہیں
:

آنحضرتﷺ سے پہلے زمانہ میں بچیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتاتھا، اس سفاکیت کا خاتمہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا، اسلام قبول کرنے آنے والی عورتوں سے اس کا وعدہ لیا جات تھا کہ وہ بچوں کو قتل نہیں کریں گی، بچوں کو مارنے سے منع کیا گیا تھا، عرب جو بچوں کو پیار کرنا عیب سمجھتے تھے، آنحضرت ﷺ نے انہیں پیار کرنا سکھایا ، اوراولاد کو ایک بوسہ دینے پر جنت میں ایک درجہ بڑھنے کا ثواب ، بچیوں کی اچھی تربیت پر اجر وثواب کی خوشخبریاں سنائیں ،جنگ میں عورتوں ، بوڑھوں اوربچوں کوجو جنگ کا حصہ نہیں بنتے تھے، قتل کرنے، ایذاء پہچانے پر پابندی لگائی گئی، بچوں کو نماز کا حکم دینے کے لئے بھی سات سال کی عمر کی قید لگائی،بلوغت سے پہلے بچوں کو احکام شریعت میں سزا جزا سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

خود آنحضرتﷺ کی بچوں کیساتھ شفقت کا حال یہ تھا کہ بچوں کی وجہ سے نماز کو مختصر کر لیتے تھے، آپﷺ سجدہ میں ہوتے تو پیٹھ پر بچوں کی موجودگی کے باعث سجدہ لمبا کر لیا کرتے تھے ، راستہ میں اگر بچے مل جاتے تو انہیں پیار کرتے تھے، بچپن میں جو بچہ فوت ہوجائے اس کے والدین کو صبر پر جنت کی بشارت سناتے ، اور تو اور یہود کے بچوں کی عیادت کے لیے بھی پہنچ جاتے تھے ، آپ نے یتیم بچوں کے ساتھ شفقت ونرمی کے برتاؤ کے ساتھ سر پر ہاتھ پھیرنے سے ہر بال کے بدلے گناہ معاف ہونے کی خوشخبری دے کر امت کو بچوں سے محبت کی طرف مائل کیا اور واضح اعلان فرمایا کہ جو ہمارے بچوں پر شفقت نہیں کرتا اورہمارے بڑوں کا احترام نہیں کرتا ، وہ مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔

اب ان احکامات کو دیکھ کر کوئی عقل مندانسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدائی احکام بچوں کے ساتھ ظلم پر مبنی ہیں، بلکہ کوئی ایک حکمِ الٰہی بھی ایسا نہیں جو بچوں سے ظلم کا شائبہ بھی دیتا ہو۔ اب ہم معترض کے صغریٰ کبریٰ کی طرف آتے ہیں جو اس نے آسمانی ہدایات کو بچوں پر ظلم قرار دینے کے لئے ملائے ہیں۔

---

[125] **Refresh.**

۱ : ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے پر ظلم وجبر کرنا اور انھیں قتل کرنے کی کوشش کرنا:

لکھتے ہیں کہ
آسمانی مذاہب کی آمد کے ساتھ، جس کا آغاز ابراہیمؑ نامی نبی سے ہوتا ہے، بچوں کے ساتھ شروع ہوا پھر لکھ کہ '' یقیناً بچہ دہشت زدہ ہوگیا ہوگا جب اسے پتہ چلا ہوگا کہ اس کا باپ اسے ذبح کرنے ظلم والا ہے'' بچوں کو ذبح کرنے کا یہ پہلا تاریخی ریکارڈ ہے جو مذاہب کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا۔

حضرت ابراہیم ؑ کے واقعہ میں موصوف نے جن اوہام کی بنیاد پر اپنی آرگومینٹ[126] کو مکمل کیا اس سے قبل ایک جملہ: ''**آسمانی مذاہب کی آمد کے ساتھ ، جس کا آغاز ابراہیم نامی نبی سے ہوتا ہے** '' موصوف کی علمی حیثیت کا پردہ چاک کرتاہے، اسےاتنا علم بھی نہیں کہ آسمانی مذاہب کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے؟
حضرت ابراہیم ؑ کی واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک امتحان میں ڈالا اور انہیں ایک خواب دکھایا گیا ، انہوں نے اس خواب کاتذکرہ اپنے بیٹے سے کیا،موصوف کو چونکہ عربی سے زیادہ شغف نہیں ورنہ حضرت ابراہیم ؑ کے الفاظ ''فانظر ماذا تریٰ'' ہی موصوف کے اعتراض کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں، حضرت ابراہیم ؑ اپنے بیٹے سے پوچھ رہے ہیں: ***تمہاری کیا رائے ہے؟*** نہ کوئی زور نہ زبردستی، بیٹے کے الفاظ بھی چونکہ عربی میں ہیں،اس لئے موصوف شاید سمجھے نہیں اورفرضیہ قائم کردیا کہ***'' یقیناً بچہ دہشت زدہ ہوگیا ہوگا جب اسے پتہ چلا ہوگا کہ اس کا باپ اسے ذبح کرنے والا ہے۔''***

بیٹے کے جوابی الفاظ ہیں ''***قال یآبت افعل ما تؤمر ، ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین***'' کہ ابا جان آپ کو جو حکم دیا گیا ہے وہ کر گزرئیے ، آپ اللہ کے حکم سے مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ جو بیٹا باپ کو حوصلہ دے رہا ہو ، موصوف اس کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ وہ دہشت زدہ ہوا ہوگا، یہ بھی ہوائی بات ہے، جس کی کوئی دلیل حضرت موصوف کے پاس نہیں ہے، بہرحال یہ صرف امتحان تھا، جس میں باپ بھی راضی، بیٹا بھی راضی اورامتحان لینے والا رب بھی راضی۔اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی جگہ دنبہ ذبح کروا کے بیٹے کو بچا لیا، لیکن موصوف کو یہ بچوں کے خلاف پہلا ظلم مل گیا؟

۲ : حضرت خضر ؑاوربچے کا قتل:

موصوف بچوں پر ظلم کے ثبوت کے لیے ایک دوسرا واقعہ پیش کرتے ہیں.
اور اسکے لیے تفسیر قرطبی کے ایک ضعیف قول کا سہار ا لینے کی کوشش کی گئی ہے،موصوف کوشاید تفسیر قرطبی کا یہ جملہ سمجھ ہی نہیں آیا کہ :

[126] **Argument.**

''قال أبو العالية: لم يره إلا موسى، ولو رأوه لحالوا بينه وبين الغلام[127].

اول بات یہ ہے کہ اس واقعہ کو صرف موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا[128] تھا اورکسی کو بھی یہ واقعہ نظر نہیں آیا تھا اوروجہ اس کی یہ تھی کہ یہ معاملہ عالمِ دنیا کا تھا ہی نہیں ، عالمِ غیب کا تھا، جس سے اس وقت صرف موسیٰ علیہ السلام کے لئے پردہ اٹھایاگیا تھا، یہ بھی صرف تعلیم موسیٰؑ کے لئے تھا ، اس کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت عزرائیل ؑ اگر کسی کی روح نکالتے ہوئے دکھائی دیئے جائیں تو کہنے والا اعتراض کرنے لگے کہ عزرائیل نے فلاں کا قتل کیا ہے۔

یہ سب خضرؑ نے اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا جیسا کہ خود قرآن میں انکا یہ قول موجود ہے :

''وما فعلتہ عن امری ''

انہیں جیسا باری تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا ، ویسے ہی انھونے کیا، باری تعالیٰ کا کسی کو موت دینا، چاہے وہ کسی حادثے سے ہی کیوں نہ ہو، قتل نہیں کہلایاجاسکتا ہے، اسی طرح موصوف نے **''فخشینا''** سے جو شبہ کا معنی اخذ کر کے اعتراض کیا ہے، کہ '' ایک منصف مزاج عادل و خبیر خدا کسی نبی کو ایک معصوم بچے کو مستقبل کے شبہ پر قتل کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ دراصل ایسے تاثرات و عوامل موصوف کے قلتِ مطالعہ یا مذہبی علوم و مباحث سے متعلقہ علوم کے عدم مطالعہ اور ان سے متعلقہ علوم کو حاصل کرنے پر دال ہے، ورنہ اسی تفسیر قرطبی میں **''فخشینا ''** کا معنی **''علمنا ''** یعنی ہم جانتے کے ہیں ، بھی مذکور ہے، لیکن چونکہ اس معنی سے موصوف کے لئے اعتراض کی گنجائش نہیں بنتی تھی ،اس لئے اس سے انھونے جان بوجھ کر صرفِ نظر کردیا یا پھر اتنا انکو معلوم ہی نہیں تھا۔

---

[127] **تفسير القرطبي: 11/ 20**

[128] **اغلب خیال یہ ہی کہ یہ تمام معاملات انبیا کرام کی تعلیم و تربیت کے ضمن میں عالم مثالی میں پیش آئے تھے جو موسیٰؑ کو حقیقی معلوم ہورہے تھے مگر درحقیقت وہ وجود اور حقایق مثالی تھے،باقی اگر یہ حقیقی بھی تھے تو ان میں کوئی شہ بھی انسانیت و حقایق کی تربیت کے منافی نہیں ہیں ادب،فلم اور اس نوع کے لاتعداد فن پاروں میں ایسی اشارے ملتے ہیں،جیسے دانتے کی ڈیواین کامیڈی میں کس کس کو اس نے دوزخ کا ایندھن بنتا نہیں دکھایا ہے اور کس کس جرم میں ماخوذ نہیں کیا ہے۔اور اگر یہ امثال اصلی بھی تھے تو چونکہ زندگی اور مخلوقات کے خالق و مالک کی طرف سے اسکا حکم ہوا تھا یا ان وقوعات کا صدور بذریعہ خضر ممکن الامر ہوئے تھے،جبھی بطور خالق و مالک اسکو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کچھ مخلوقات کو انتہائی مختصر مدت کے لئے حیات دے تاکہ وہ مطلوبہ مقصد کو پورا کرکے ہلاک ہوجائیں جیسے وہ بچہ صرف اس مثال کے سبب زندہ تھا،جیسے ہی اس مثال کا وقوع ہوا ہوا اسکی حیات کا چراغ گل ہوگیا،چونکہ مالک و خالق کو اپنی مخلوقات پر کامل اختیارات حاصل ہوتے ہیں جبھی انسان اور انسانیت کے مالک نے جب وہ فعل سرانجام دلوایا تو وہ عین راستگی پر استوار فعل مانا جائیگا ، یا جیسے ہمارے سائینسدان ادویات کو انسانوں و جانواروں پر آزماتے ہیں باوجود یہ کہ انکی حیات اس کوشش و تجربہ میں نقصان بھی اٹھا سکتی ہے اور ختم بھی ہوسکتی ہے چونکہ کل انسانیت کا وجود و بقا اور اسکا تحفظ انکے پیش نظر ہوتا ہے جبھی عموما ملحدین بھی ان پر آوازیں کسنے سے باز رہتے ہیں، یا اس دیوار کی تنصیب کا ہونا باوجود اسکے اہل قریہ نے مہمان نوازی نہیں کی تھی پوری کردی گئی کیونکہ اس حکایت اور مثال کا یہی تقاضہ تھا کہ خضر اسےاللہ کی مشیت سے اسکے اذلی علم کے مطابق سرانجام دیں۔معج**

۳۔اولاد کو فتنہ سمجھنے کی بابت ایک لغوی غلطی سے تباہی پھیلانے کی کوشش:

یہ موصوف کا کافی شافی پُرابہام علم ہے کہ جو ان جیسا کمالِ علم کا حامل فرد ہی ایسی فاش پرٌ اغلاط جرأت کر سکتا ہے،کہ اولاد کو صرف نابالغ بچوں کے ساتھ مخصوص کرتا پھرے ، لیکن بہرحال چونکہ صاحب متعلقہ اکثر و بیشتر مباحثِ عربیہ سمجھنے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں، اس لئے اردو کے لفظ
‘‘**فتنہ**’’ کو عربی کے لفظ ‘‘**فتنہ**’’ پر قیاس کر بیٹھے ہیں، موصوف اگر یہ ناقصِ قیاس نہیں کرتے اور براہ راست عربی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تو جان جاتے کہ ‘‘**فتنہ**’’ عربی میں ‘‘ **آزمائش**’’ **یا** ‘‘**امتحان** ’’ کو بھی کہتے ہیں اوریہاں اصلی مراد یہی ہے۔ اگر موصوف یہ بیان کردیتے تو اعتراض کا عقدہ کھل جاتا، کیونکہ اہل علم یا فہیم و عقل مفکرین کے نزدیک اولا دکے امتحان ہونے میں شاید کسی کو کوئی اشکال نا ہو اور اگر ہو تو وہ لغوی اعتراض سے زاید کچھ نا ہوگا۔

۴۔ کفار کی نومولود فوت شدہ اولاد کے مسلم ہونے کا مسلہ:

موصوف نے کفار ومشرکین کے بچوں کے بارے میں ایک روایت کے الفاظ سے بچوں کے اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بارے میں دونوں طرح کی روایات کع موجود ہیں کہ کفارومشرکین کے بچے آخرت میں جنت میں ہونگے یا جہنم میں ہونگے**؟**[129] لیکن موصوف نے راجح بات چھپا کر اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے ۔ امام نووی رحمہ اللہ اور دیگرمحققین نے اسی کوراجح قراردیاہے کہ اولادکفارجوبلوغت سے پہلے دنیاسے چل بسے وہ اہل جنت میں سے ہیں۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

:
‘‘

آیت ‘‘ **ولاتزر وازرۃ وّزرَ اخریٰ** ’’ کے تحت تفسیرمظہری میں لکھاہے کہ :

‘‘ اس آیت سے ثابت ہوتاہے کہ مشرکین وکفارکی اولاد جوبالغ ہونے سے پہلے مرجائے ان کو عذاب نہیں ہوگا، کیوں کہ ماں باپ کے کفرسے وہ سزاکے مستحق نہیں ہوں گے ’’[130]۔

موصوف نے باقی بھی جو اعتراضات کئے ہیں ان کا حال بھی یہی ہے کہ کسی ایک سے بھی موصوف کا مدعا ثابت نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس سے الٹ خدائی احکامات جو بچوں سے متعلق آنحضرت ﷺ نے اس امت تک پہنچائے ہیں اوران کی ایک جھلک ابتداء مضمون میں بھی دکھلائی گئی ہے ‘کے بعد

---

[129] **صحیح بلسند آثار سے یہ ہی ثابت ہے کہ کفار کے نومولود فوت شدہ بچے مسلم ہی ہوتے ہیں یہی کل بنی نوع انسان کی فطرت ہے اور یہ اسکے ماں باپ ہوتے ہیں جو اسے غیر مسلم بنا دیتے ہیں۔معج**

[130] **مفتی شفیع عثمانی :معارف القران**

کسی عقل مندآدمی کے لئے کم از کم یہ اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں رہتی ہےکہ ہمارے خدائی احکامات کسی بھی طرح سے بچوں کے خلاف ہیں،ملحدین کی مذہب کے خلاف ہر تحریر ایسے ہی علمی مکروفریب پر مشتمل ہوتی ہے، انکے فتنے سے بچنے کا ایک ہی حل ہے کہ عوام علماء سے مضبوط رابطہ رکھیں اورایسے موقعوں پر علماء سے رہنمائی لیں[131]۔

---

(۲)

فلسفہ و حکمت آیت خضرؑ و موسیٰؑ

حضور سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت موسی و خضر علیہ السلام کے واقعے کی تفصیل ایک طویل حدیث میں بیان فرمائی ہے۔ جو صحیح بخاری[132] میں کئی سندوں سے منقول ملتی ہے، اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ایک مرتبہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کسی نے یہ سوال کیا کہ اس وقت روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے ؟ چونکہ ہر پیغمبر اپنے وقت میں دین کا سب سے بڑا عالم ہوتا ہے،اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب میں یہی فرما دیا ہے کہ میں ہی سب سے بڑا عالم ہوں، اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ ہدایت دی گئی کہ اس سوال کا صحیح جواب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے بڑا عالم کون ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے چاہا[133] کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو علم کے کچھ ایسے گوشوں سے روشناس کرائیں جو ان کی واقفیت کے دائرے سے باہر تھے، چنانچہ انہیں حکم دیا کہ وہ حضرت خضر (علیہ السلام) کے پاس جائیں، اور پھر ان کو خضرؑ کا جو پتہ بتایا گیا وہ ایک ایسی جگہ کا تھا جہاں دو دریا باہم ملتے تھے،انھہیں ہدایت دی گئی کہ وہاں تک کا سفر فوری شروع کریں، اور اپنے ساتھ ایک عدد مچھلی لیتے جائیں۔

دوران یاد رکھا جائے کہ ایک موقع ایسا بھی آئے گا کہ وہ مچھلی گم ہوجائے گی، بس یہی وہ مقام ہوگا کہ جہاں انہیں حضرت خضر (علیہ السلام) مل جائیں گے جنھیں اللہ نے انکی رشد و ہدایت کے ضمن میں کچھ اسرار و رموز سکھانے کےلئے القا کئے ہونگے ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام)

---

[131] مولانا محمد ابراھیم ؟

[132] بخاری:۴۷۲۵:کتاب التفسیر:باب قولہ و اذ قال موسیٰ لفتاہ:عن سعید بن جبیرؓ از قال:ابن عباسؓ

[133] الکہف:۶۲ تا ۸۰۔

اپنے نوجوان شاگرد حضرت یوشع (علیہ السلام) کو ساتھ لے کر اس سفر پر روانہ ہوئے، جو بعد میں خود پیغمبر بننے والے تھے۔

آگے کا واقعہ خود قرآن کریم میں آرہا ہے، البتہ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو جو یہ سفر کرایا گیا، اس کا ایک بنیادہ مقصد تو یہ ادب سکھانا تھا کہ اپنے آپ کو سب سے بڑا عالم کہنا کسی کو بھی زیب نہیں دیتا ہے ،اب جہاں تک علم کا تعلق ہے تو سمجھو یہ ایک ناپید کنارا، اور ایک بحرِ بے کنارہ ہے اور اس بابت قطعیت کے سوائے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کونسا علم کس کے پاس کتنا زیادہ ہے؟ کیونکہ یہ سب اللہ کے اذلی و ابدی علم میں ہی پنہاں ہے کہ کون کس پر کس امر میں فوقیت رکھتا ہے۔

اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) خود آنکھوں سے اس بات کی ایک جھلک دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور علم سے اس کائنات کا نظام کس طرح چلا رہا ہے،اور جو کچھ انبیا کرام کو بذریعہ وحی بیاں کیا جائے وہ غیب من جانب الہی ہے ناکہ کسی نبی کا کوئی ذاتی حاصل کردہ وصف و کمال ہے،لہذا اس کائنات میں بہت سے ایسے واقعات روز مرہ انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں جن کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا ہے، چناچہ کوئی بھی واقعہ یا حادثہ جو وقوع پذیر ہو وہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی حکمت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا ہے ۔

انسان کی نظر چونکہ محدودو مقید ہے، اس لیے کوئی انسان و جن اس حکمت کو بسا اوقات نہیں سمجھ سکتا ہے ، لیکن جس قادر مطلق کے ہاتھ میں پوری کائنات کی باگ ڈور ہے، وہی جانتا ہے کہ کس وقت کیا واقعہ پیش آنا چاہیے اور کیونکر کس طرح حقیقت بن کر نمودار ہونا باقی ہے۔ ان کو جس خصوصی علم کے سکھانے کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس سے مراد تکوینیات کا علم ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں بھی ہے کہ حضرت خضر (علیہ السلام) نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسا علم دیا ہے جو آپ کے پاس نہیں (یعنی تکوینیات کا علم) اور آپ کو ایسا علم دیا ہے جو میرے پاس نہیں (یعنی شریعت کا علم)۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو حضرت خضر (علیہ السلام) سے ملوانے اور یہ واقعات دکھانے کا اصل مقصد ایک اہم حقیقت کا مشاہدہ کرانا تھا اور اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآن کریم نے یہ واقعہ ہمارے لئے بیان فرمایا ہے، اسلامی شریعت کی رو سے کسی کے لئے یہ بالکل جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کی ملکیت میں اسکی اجازت کے بغیر کوئی تصرف کرے، خاص طور پر اس کی تو ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی کے اس کی ملکیت کو کوئی نقصان پہنچادے، چاہے وہ نقصان خود مالک کے فائدے کی نیت ہی سے پہنچایا گیا ہو۔

لیکن یہاں قدم قدم پر حکمت و اسرار کا نا سمجھ میں آنے والا سمندر منہ کھولے سامنے والے کو پریشان کرنے سامنے بچھا نظر آتا ہے ،حضرت خضر (علیہ السلام) نے کشتی والوں کی اجازت کے بغیرنا صرف اس کشتی کا تختہ نکال دیا، بلکہ اس سے فارغ ہوکر ایک اور نیا ظاہراً گناہ سر انجام دے دیا ،اور جب تک خضرؑ اسکا اسرار نہیں کھولتے موسیٰؑ دل ہی دل میں اس پر حیران و پریشان ،فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں۔

اسی طرح کسی بےگناہ کو قتل کرنا شریعت میں انتہائی سنگین جرم ہے خاص طور پر کسی نابالغ لڑکے کو قتل کرنا تو حالت جنگ میں بھی جائز نہیں ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر یہ معلوم ہو کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر کوئی فساد مچائے گا، تب بھی اس وقت اسے قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا نظر آتا ہے، اس لئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ان پر خاموش نہیں رہ سکے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت خضر (علیہ السلام) نے شریعت کے بالکل خلاف یہ کام کیسے اور کیونکر سر انجام دے دئے ؟، اس سوال کا جواب جاننے کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس کائنات میں جتنے واقعات ہوتے ہیں چاہے وہ ہماری نظر میں اچھے معلوم ہوتے ہوں یا برے ان کا تعلق ایک ایسے جہاں سے وابستہ ہے جو ہماری آنکھوں سے ظاہراً پوشیدہ نظرآتا ہے، اور جسے اصطلاح میں عالمِ تکوین کہا جاتا ہے جو براہ راست اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے تکوینی احکام کے ذریعے کنٹرول ہورہا ہے، کس شخص کو کتنے عرصے زندہ رہنا ہے ؟ اور کب اس کی موت واقع ہوگی، وہ کتنے عرصے صحت مند رہے گا اور کب بیمار ہوجائے گا، اسے کب کونسا روز گار نصیب ہوگا ؟ اور اس کے ذریعے وہ کتنی روزی کماسکے گا ؟ اس قسم کے سارے معاملات اللہ تعالیٰ براہ راست طے فرماتے ہیں اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ کارندے مقرر فرما رکھے ہیں جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر اللہ تعالیٰ کے ان تکوینی احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔

مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرمالیا کہ فلاں شخص کی موت کا وقت آگیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موت کا فرشتہ اس شخص کی روح قبض کرنے کے لئے پہنچ جاتا ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی حکم کی تعمیل میں کسی کی موت واقع کررہا ہوتا ہے تو وہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کررہا ہوتا ہے، اور اس ضمن کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی جان لے، لیکن جس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے اسی کام پر مقرر فرمایا ہے اس کے لئے یہ کوئی جرم نہیں ہوتا ہے کیونکہ اسے مستقبل میں قتل ہونے والے وجود کے مالک نے ہدایتِ قتل دی ہوتی ہے،لہٰذا وہ عمل انسانیت اور اسکے اصول پر فایق و حاوی ہوکر عین حق و منطق امر بن جاتا ہے[134]۔

اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کو نافذ کرنے کے لئے عام طور سے فرشتے مقرر ہوتے ہیں ، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں یہ فریضہ سونپ سکتے ہیں، حضرت خضر (علیہ السلام) اگرچہ انسان تھے ، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو فرشتوں کی طرح عالم تکوین کا پیغمبر بنادیا تھا، انہوں نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ کے تکوینی حکم کے ذریعے کیا تھا، لہذا جس طرح موت کے فرشتے پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے ایک بےگناہ کی جان لے کر گناہ کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی بات کے لئے مامور تھا، اسی طرح حضرت خضر (علیہ السلام) بھی اس کشتی کو عیب لگانے اور اس لڑکے کو قتل کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی طور پر مامور تھے، اس لئے ان کا یہ عمل کوئی جرم نہیں تھا۔

البتہ ہم لوگ دنیا میں رہتے ہوئے شریعت کے احکام کے پابند ہیں اور ہمیں عالم تکوین کا نہ علم عطا کیا گیا ہے اور نہ اس عالم سے متعلق ہمیں کوئی ذمہ داری سونپی گئی ہوتی ہے، اس لئے ہم انہی احکام کے مکلف ہیں جو اس جیتی جاگتی زندگی میں ہمیں آنکھوں سے نظر آتے ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جو اسی جیتی جاگتی دنیا کے پیغمبر تھے، اور جو شریعت ان کو دی گئی تھی، اسی کے

---

[134] **معج**

پابند تھے، اس لئے وہ نہ حضرت خضر (علیہ السلام) کی ان باتوں پر خاموش رہ سکے اور نہ آئندہ ان کے ساتھ چل سکے، ان تین واقعات کے بعد وہ سمجھ گئے کہ ان صاحب کا دائرے کار میرے دائرہ کار سے بالکل الگ ہے اور میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتا ہوں ، البتہ اس طرح انہیں یہ حقیقت کھلی آنکھوں دکھادی گئی کہ اس کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی لا محدود حکمت کار فرما ہے، اگر ہمیں کسی واقعہ کی وجہ سمجھ میں نہ آئے تو اسکی بنا پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں بنتی ہے۔

کیونکہ جس عالم تکوین میں اس کی حکمت واضح ہوسکتی ہے وہ ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے، روز مرہ کی زندگی میں ہمیں بہت سے منظر ایسے نظر آتے ہیں جن پر ہمارا دل دکھتا ہے بہت سے انسانوں کی مظلومیت کو دیکھ کر بعض اوقات دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں، حضرت خضر (علیہ السلام) کے ذریعے عالم تکوین کی ایک جھلک دکھا کر ایک مومن کے لئے ایسے شکوک و شبہات کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔

البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ عالم تکوین اور اس کے کارندے ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں، حضرت خضر (علیہ السلام) بھی اس طرح پوشیدہ تھے، لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو عالم تکوین کی ایک جھلک دکھانے کے لئے وحی کے ذریعے ان کا پتہ بتادیا گیا، اب جبکہ وحی کا دروازہ بند ہوچکا ہے کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ یقینی طور پر تکوین کے کسی کارندے تک رسائی حاصل کرسکے، اور نہ نظر آنے والی دنیا میں کوئی شخص یہ دعوی کرسکتا ہے کہ وہ تکوین کا کارندہ ہے، اور اسے تکوینی اختیارات حاصل ہیں، لہذا جن لوگوں نے حضرت خضر (علیہ السلام) کے واقعے کی بنیاد پر شریعت کے ظاہری احکام کی خلاف ورزی کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے انہوں نے سراسر گمراہی پھیلائی ہے، مثلاً بعض نام نہاد درویشوں کا تصوف وغیرہ کے نام لے کر یہ کہنا کہ شریعت کے احکام ظاہر بیں لوگوں کے لئے ہیں، اور ہم ان سے مستثنی ہیں، پر لے درجے کی گمراہی ہے، آج کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ شریعت کے احکام سے مستثنی ہوسکتے[135]۔

---

[135] **مفتی تقی عثمانی: تفسیر سورت الکہف: آیت 33-82: آسان ترجمہ قرآن:**

ڈی این اے، سائنس،قانون اورشریعت

از:علی احمد[136]

یہ واقعہ پاکستان کا نہیں بلکہ امریکا سے تعلق رکھتا ہے، جہاں ایک خاتون کے ساتھ دو لوگوں نے زیادتی کی تھی۔ انکوائری کے دوران پولیس نے بہت سے مشتبہ لوگوں کے ڈی این اے سیمپل حاصل کئے اور پھر بلآخر لیب رپورٹ کے مطابق ایک انیس سالہ نوجوان کا ڈی این اے میچ کر گیا۔ اسے پچیس سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ تقریبا پانچ سال کی قید کے بعد پتا چلا کہ ڈی این اے میچنگ کے طریقہ کار میں غلطی واقع ہوئی تھی تو اسے آزاد کر دیا گیا۔

یہ پہلا یا آخری کیس نہیں تھا جس میں غلط شخص کو سزا سنا دی گئی تھی بلکہ امریکا جیسے ملک میں بھی ایسے کیسز خاصی تعداد میں ہوتے رہتے ہیں،جہاں سائینسی شہادتوں اور طریقہ کار کو واضح،حقیقی و یقینی طریقہ کار کے طور پر بروئے کار لاکر بھی ان میں اکثر وبیشتر خطا،خامی اور پر غلاط نتایج ملتے ہیں جنھیں پاکر ہم سائینس کی یقینیت کے فلسفے پر صدا بلند کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، اس کی وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈی این اے ٹیسٹ کے ضمن میں یہ مسئلہ بھی اکثر و بیشتر درپیش آتا ہے کہ ٹیسٹ آپریٹرز عام طور پر رزلٹس بناتے ہوئے غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔

اب آپ کو ڈی این اے ٹیسٹ کے بارے میں بتاتے ہیں، فنگر پرنٹس کی طرح سوائے ‘‘یکساں جڑواں[137] کے ہر شخص کا ڈی این اے بھی ایک دوسرے بلکل اور کافی حد تک مختلف ہوتا ہے،جسے آپ کے بالوں، ناخن، سکن، کسی بھی جسمانی مواد وغیرہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اور یہ آپ سے زبردستی، دھوکہ دہی یا انجانے میں بھی لیا جا سکتا ہے، اسی طرح پاکستان جیسے ملک جہاں جھوٹی گواہی،جھوٹی ایف آئی آر، تفتیشی اداروں کی رشوت ستانی، ذاتی و سیاسی استعمال اور جعلی میڈیکل رپورٹس، میڈیکل بورڈز جیسی دونمبریاں معمول کی بات ہیں، وہاں ڈی این اے کے ساتھ بھی کیا ایسا کچھ ممکن نہیں ہو سکتا ہے؟ جبکہ یہ بھی بلآخر صرف ایک ایک ٹیسٹ ہی ہے؟ امریکا جیسے ملک میں کم از کم یہ یقینی ہونا اصول و انصاف کے ہم سے بہتر معیارات کے سبب ممکن تو ہے مگر دیگر سوچے سمجھے مفاداتی عوامل کے سبب ناممکن نہیں ہے جیسا کہ مذکورہ بالا ڈی۔این۔اے جانچ کے واقعے سے خطا کے سرے سے نا ہونے کا تاثر کافی حد تک مسترد ہوجاتا ہے۔

شواہد کی حفاظت اور اس میں کوئی دو نمبری نا ہونا کم از کم وہاں یقینی ہوتا ہے،جہاں خوف خدا انفرادی و اجتماع سطع پر جاگزیں ہو،یا احتساب و جانچ پڑتال کا صد فیصد کڑا نظام موجود ہو،ساتھ اس پس منظر کو بھی ذہن میں رکھیں اور فرض کرلیں کہ کسی کیس میں بہت زیادہ عوامی دباؤ آ جاتا

---

136 دانش ڈاٹ ۔پی کے

137 **Identical twins**

ہے،جذبات و احساسات منطق و عقل پر حاوی ہوجاتے ہوں حکومت پولیس، وزرا،نوکر شاہی،متعلقہ شعبہ یا اہل علم علم خوف و دباو کا شکار ہوں ۔

وہ کسی بھی شخص کو پکڑتے ہیں، اس کا ڈی این اے سیمپل لیتے ہیں اور تمام کیسز میں تبدیل کر دیتے ہیں،اور کہتے ہیں کہ لیں جی جرم ثابت ہو گیا ہے ، بلے بلے ہو گئی ہے،نتیجتاً کیس ختم اور اصل مجرم دندناتے پھرنے لگتے ہیں حسب معمول ، جس غریب کی گردن میں پھندہ فٹ ہو نا مقرر کیا جاتا ہے، اسے پھانسی دے دی جاتی ہے، نتیجہ کیا نکلتا ہے وہی پرانا ،سوچا سمجھا ،لکھا گیا، ہوں پھر دوبارہ بدانصاف کہانی ختم ہوجاتی ہے اور پیسہ وصول کرکے ہضم کرلیا جاتا ہے۔

اسی طرح کا ایک اگلا کیس فرض کرل یں کہ ایک مرد اور ایک عورت نے باہمی رضامندی سے بدکاری کی اور بعد ازاں خاتون نے اس پر زیادتی کا الزام لگا دیا،یہاں چناچہ محض ڈی این اے پر انحصار کی صورت میں تو وہ شخص فوراً مجرم ثابت ہوجائے گا ، اب آپکی آسانی کے لیے مزید اگلا کیس فرض کرلیتے ہیں۔

کسی خاتون کے ساتھ کسی نے زیادتی کی تھی ، خاتون اثر و رسوخ رکھتی تھیں، انہوں نے جو حلیہ بتایا تھا وہ آپ سے تھوڑا بہت میچ کرجاتا ہے،جبکہ آپ وہاں سے اپنے کسی کام کے سلسلے میں محض گزر رہے تھے تو پولیس نے آپ کو پکڑ لیتی ہے جبکہ جو ڈی این اے سیمپل پہلے لیا گیا تھا، اس کی جگہ آپ کا سیمپل ڈال کر یہ کہہ دیا جاتا ہے جیساکہ ہمارے ہاں معمول ہے کہ جی پولیس نے "مجرم" پکڑ لیا ہے۔ صاحب بہادر کی ترقی ہو جاتی ہے اور آپ کو پھانسی مل جاتی ہت۔ خاتون بھی مطمئن ہو گئیں اور کیس بھی بند ہوگیا ۔

اس لئے بحث سرے سے ڈی این اے ٹیسٹ کے قابل قبول ہونے یا نا ہونے کی نہیں ہے، دراصل ڈیبیٹ ان حقائق کی ہے جو ہمارے معاشرے میں آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں، جہاں ایک غیر ملکی کو پاکستان کا قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ محض پیسے خرچ کر کے مل سکتا ہو، وہاں کیا نہیں ہو سکتا ہے؟

یہ بنیادی وجہ اور پس منظر ہے ہماری کورٹس میں ڈی این اے کو پرائمری شواہد میں شمار نا کرنے کی ہے اور سیکنڈری شواہد میں قابل قبول سمجھنے کی ہے۔ واضح رہے کہ انصاف محض مظلوم کے ساتھ نہیں بلکہ ملزم کے ساتھ بھی ہونا ضروری ہے، ورنہ ملزم بھی مظلوم ہی بن جاتا ہے، جبکہ زیر بحث مجرم ایک ایسا مظلوم ہو جس کے ساتھ کوئی ہمدردی بھی نہیں کرتا ہو بلکہ ہر کوئی اس سے نفرت ہی کرتا ہے، اسے وکیل تک نہیں مل پاتا ہے۔

وہاں ملزم اور مجرم میں فرق رکھنا بہت ضروری ہے تا کہ ہم ہمیشہ اصل مجرم تک پہنچ سکیں نا کہ قربانی کے بکرے کی بلی چڑھا کر مطمئن ہو جائیں۔
اس لئے ڈی این اے ٹیسٹ کے سلسلے میں سیمپلنگ، ٹیسٹنگ، کلیکشن، تفتیش اور استغاثہ کا الگ الگ اور آزاد ہونا، غیر سیاسی ہونا، پروفیشنل ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے، اگر ہم یہ چیزیں یقینی بنا لیں تو ہماری کورٹس موجودہ قوانین کے تحت ہی ڈی این اے کو زیادہ وزن دینے لگ جائیں گی۔

اس بیان کئے گئے طریقہ کار کے سوا آپ چاہے کوئی اسلامی نظریاتی کونسل کو موردالزام ٹھہرا کے ''فیشن'' پورا کرتے رہے یا اسلام کو یا قانون کو، کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔

سانحہ قصوراورغامدی مکتبہ فکرکی پوائنٹ سکورنگ

از: :ڈاکٹر محمد مشتاق احمد[138]

ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جونہی کوئی بڑا سانحہ رونما ہوتا ہے غامدی صاحب کے صف اول کے نمائندے اور فالوورز اپنے فرقے کے لئے گنجائش پیدا کرنے اور اپنی اسلامی فکر کو بہتر ثابت کرنے کے لیے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روایتی علماء و اسلام، اسلامی فقہ، علم حدیث اور قوانین اسلامی کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کردیتے ہیں ۔

ابھی سانحہ قصور کے موقع پر بھی جب ساری عوام غمزدہ تھی انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عام عوام کے سامنےزنا اور اسکی شرائط کے حوالے سے بحثیں شروع کردی ہیں اور فقہ کے دقیق نکات زیربحث لا کر عوام کو فقہ اسلامی سے بدظن کرنے اور انھیں کنفیوز کرنے کی کوشش بھی کیں ہیں تاکہ وہ اسلامی فقہ کے گراں قدر علمی ذخیرہ سے متنفر ہو کر ان کی جدید فقہ کو اپنا لیں ۔ کوئی بھی قومی حادثہ ہو بجائے قومی سوچ پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کے یہ نابغے ہر دفعہ ایک ہیجانی قسم کی کیفیت پیدا کردیتے ہیں، کیا قوم کو اس بلاوجہ کے انتشار میں مبتلا کرنا اور بحثوں میں الجھانا کوئی قومی خدمت مانی جاسکتی ہے؟ کیا ان سانحات کی آڑ میں اپنے پرانے ایجنڈوں کو آگے بڑھانے، دشمنیاں چلانے اور لوگوں میں نفرتیں پیدا کرنے والے لوگ دینی ا سکالر کہلانے کے لائق محسوس ہوتے ہیں ؟اللہ ڈاکٹر محمد مشتاق احمد چیئرمین شعبۂ قانون ، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کو اجر دے، انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ناصرف انکی تشکیک کا جواب دیا بلکہ زنا، زنا بالجبر، جنسی تشد د اور سزا کے لیے چار گواہوں کی شرط کے حوالے سے اٹھائے جانے والے اشکالات کو بھی بھرپور طریقے سے زیربحث لایے اور اسلامی قانون کی اصل پوزیشن واضح کی ہے[139]

-

فقہ اور اصولِ فقہ کے متعلق جہلِ مرکب کا شاہ کار:

غامدی صاحب کا حلقہ اپنے متعلق ہمارے حسنِ ظن کو مسلسل ختم کرنے کے درپے نظر آتا ہے اور اسی ضمن میں تازہ ترین کوشش ان کی ترجمانی پر فائز ایک صاحب نے کی ہے جنھوں نے نہ صرف اظہار یہ کہ فقہ اور اصولِ فقہ کے متعلق اپنے جہلِ مرکب کا ، بلکہ فقہائے کرام کے متعلق اپنے شدید کا جابجا مظاہرہ بھی کیا ہے، اور وہ بھی اس سانحے کے سیاق میں جس پر پوری قوم رنج اور الم میں مبتلا ہے۔ ماضیِ قریب میں اس حلقے ، اور بالخصوص ان ترجمان صاحب، کے ساتھ بحث کے تجربے کی روشنی میں میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ جامد اور اندھی تقلید میں مبتلا اس متعصب گروہ

---

[138] چیئرمین شعبۂ قانون ، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

[139] منتظم :الحاد ڈاٹ کام

کے ساتھ بحث کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ان کی اس یاوہ گوئی کو نظرانداز کردیا تھا لیکن مسلسل کئی اصحاب نے اس ضمن میں سوال پیش کیے تھے ، اس لیے مجبوراً چند نکات اسی سلسلے میں لاچار قلم بند کررہا ہوں۔

۱۔پہلی غلطی : یہ مسلمانوں کا قاضی مراد ہے یا انگریزوں کا گونگا ، بہرا اور اندھا جج مراد ہے؟

ترجمان صاحب نے اپنے مکالمے میں جس قاضی کو پیش کیا ہے وہ انگریزی عدالت کا جج ہے جس کے نہ صرف ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں ، اور نہ صرف اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے بلکہ وہ صرف انھی امور پر سوال اٹھا سکتا ہے جو فریقین نے اس کے سامنے پیش کیے ہوں ، وہ صرف وہی ثبوت دیکھ سکتا ہے جو مدعی نے اس کے سامنے پیش کیے ہوں ، وہ مدعی اور مظلوم کے درمیان فرق دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے ، نہ ہی اسے مظلوم کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے ، نہ ہی وہ اپنے اوپر یہ لازم سمجھتا ہے کہ مظلوم کی دادرسی کرے اور ظالم کے خلاف ثبوت اور شواہد اکٹھے کروائے ، نہ ہی وہ کمرۂ عدالت سے باہر جا کر خود صورتِ واقعہ اور میدانی حقیقت معلوم کرنے کا اختیار رکھتا ہے ۔ یہ اندھا، گونگا، بہرا اور اپاہج جج انگریزوں کے وضع کردہ نظام و قوانین کا مظہر جج ہے ، نہ کہ مسلمانوں کے قاضی کا مثل ہے ۔

کاش ترجمان صاحب ذرا سی مشقت اٹھا کر مسلمان قاضی اور اس معذور جج کے درمیان تفریق پر اردو میں ہی کوئی کتاب پڑھ لیتے کہ اسلام و مغرب کے پاس ججز کے ضمن میں کیا کیا اختیارات ہوتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اس سوال پر غور کریں کہ انکی ذمہ داریاں کیونکر ایک دوسرے سے ہوتی ہیں؟ اگر انکے لئے یہ سمجھنا بھی مشکل ہو تو کم از کم سپریم کورٹ کے اختیارات ہی دیکھ لیں کہ وہ "جے آئی ٹی" تشکیل دے سکتی ہے یا نہیں؟ وہ "رٹ" جاری کرسکتی ہے یا نہیں؟

۲۔ دوسری غلطی : انکے معترضہ قاضی نے فقہ پڑھی ہے یا المورد کی میزان رٹ دکھی ہے؟

ترجمان صاحب نے جس شخص کو قاضی کے منصب پر بٹھایا ہے، اس نے "تخصص فی المیزان : الطبع الاخیر" کا کورس تو یقیناً کیا ہوا ہے لیکن اس کے بعد فقہ کا مطالعہ صرف سطحی اور سرسری طور پر ہی کیا ہوا ہے اور وہ بھی ثانوی مآخذ کے طور پر ، بلکہ تیسرے درجے کے مآخذ کے طور سے ۔ (اور وہ بھی اردو میں ، ورنہ کم از کم بیسویں صدی عیسوی کے مصری مصنف عبد القادر عودہ کی کتاب "التشریع الجنائی" کو "التشریح الجنائی" تو نہ لکھتے۔ واضح رہے کہ کی بورڈ پر عین اور ح ایک دوسرے سے اتنی دور واقع ہیں کہ عین کی جگہ ح لکھا ہی نہیں جاسکتا ہےجب تک واقعی تشریع کو تشریح نہ مانا جائے۔

کم از کم یہ بات تو میں سو فی صد یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ترجمان صاحب نے امام سرخسی کی المبسوط ج 9 ، کتاب الحدود ، کا مطالعہ کیا ہی نہیں ہے ورنہ ایک تو وہ "بونگی" بالکل بھی نہ مارتے جو انھوں نے امام سرخسی کے حوالے سے ماری ہے اور دوسرے انھیں اسی کتاب میں یہ بات تو

ضرور ملتی کہ فساد کے جرم پر عبرت ناک طریقے سے سزاے موت دینے کا اختیار حکمران اور قاضی کے پاس ہے اور اس کے ثبوت کےلیے اقرار یا گواہی ضروری نہیں بلکہ قرائن بھی کافی ہوتے ہیں۔

بہرحال ترجمان صاحب کے فرض کردہ متخصص فی المیزان : الطبع الاخیر قاضی کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ بچی کے ساتھ کی گئی زیادتی فقہ کی رو سےزنا کی تعریف میں ہی نہیں آتی ہے، اس لیے وہاں سرے سے قذف کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ اس نام نہاد قاضی کو یہ بھی علم نہیں ہےکہ فقہ کی رو سے یہاں بچی پر تشدد کی بدترین قسم کا ارتکاب کیا گیا ہے جس پر فقہی قواعد کی رو سے حدود اور قصاص کے بجاے فقہی تصور "سیاستہ"[140] کا اطلاق ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس شنیع ترین جرم کا ارتکاب کرنے والے بدبخت کو بدترین سزا دینا لازم ہے ۔

یہ نام نہاد قاضی یہ بھی نہیں جانتا کہ فقہ کی رو سے اس معاملے میں بارِ ثبوت بچی یا اس کے ولی پر نہیں بلکہ حکومت پر ہے کہ وہ بہرصورت معلوم کرے اور ناقابلِ تردید ثبوت عدالت میں پیش کرکے ثابت کرے کہ جرم کا ارتکاب کس نے کیا ہے ؟ یہ نام نہاد قاضی یہ بھی نہیں جانتا ہے کہ فقہ کی رو سے قاضی پر لازم ہے کہ اگر مجرم معلوم نہ ہوسکے یا جرم ثابت نہ ہوسکے تو اس صورت میں اس پر لازم ہے کہ حکمران پر اس بچی کے ساتھ کیے گئے مظالم کی تلافی لازم کردے۔

۳۔ تیسری غلطی: اس متخصص فی المیزان :الطبع الاخیر :قاضی نے فقہاے کرام کے اصول فقہ نہیں پڑھے ہیں ۔

اس کی وجہ تو خیر واضح ہےکہ اس نام نہاد قاضی کا تخصص تو میزان کے آخری دستیاب ایڈیشن کے "اصول و مبادی" میں ہی پنہاں ہے۔ اسے اصولِ فقہ سے کیا نسبت؟ اس لیے یہ نام نہاد قاضی یہ بھی نہیں جانتا ہے کہ فقہاے کرام جس قاضی کا ذکر کررہے ہیں وہ یا تو مجتہد ہوتا ہے اور یا تو مقلد ہوتا ہے ۔ پہلی صورت میں وہ اصول خود وضع کرتا ہے ، ان کے درمیان ہم آہنگی یقینی بناتا ہے اور پھر خود ان اصولوں کی روشنی میں فروع مستنبط کرتا ہے ۔ وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ ایک بات حنفی فقہ کی المبسوط سے لے تو دوسری بات حنبلی فقہ کی المغنی سے لے کر کام چلائے ۔ پھر اگر دوسری صورت ہے کہ یہ قاضی مقلد ہے تو فقہ کی رو سے اس پر لازم ہے کہ کسی ایک فقہی مذہب کی ہی اتباع کرے کیونکہ ایک فقہی مذہب کے اصول آپس میں ہم آہنگ ہوتے ہیں اور دو یا زائد مذاہب کے اصول بسا اوقات ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے نہیں چل سکتے ہیں[141]۔ اس صورت میں بھی یہ قاضی یہ کر ہی نہیں سکتا تھا کہ ایک بات حنفی فقہ کی المبسوط سے لے اور دوسری حنبلی فقہ کی المغنی سے لے۔

ہاں! چونکہ یہ قاضی میزان کے آخری دستیاب ایڈیشن کا متخصص ہے، اس لیے یہ بات قابلِ فہم ہے کہ کیوں وہ ایک اصول ایک جگہ سے ، دوسرا اصول دوسری جگہ سے ، ایک فقہی جزئیہ ایک کتاب سے، دوسرا فقہی جزئیہ دوسری کتاب سے ، عموماً اردو تراجم سے ، یا سنی سنائی سے ، یا سینہ در

---

[140] **السیاستہ الشریعہ**

[141] **صاحب مضمون چونکہ خود مقلد ہیں اور فقہ واحد کے رواج کی طرف رجحان رکھتے ہیں جبھی انھونے غالباً اسی سبب یہاں اس امر کو بیان کیا ہے واللہ علم ۔معج**

سینہ پہنچنے والی روایت سے ، لیتا ہے اور اس چکر میں ہی نہیں پڑتا کہ یہ اصول اور جزئیات آپس میں ہم آہنگ ہیں بھی یا نہیں ہی ہیں ؟

فقہی لحاظ سے مسئلے کی صحیح نوعیت:

ترجمان صاحب کی ساری فرض کردہ صورت حال فقہی لحاظ سے غلط ہے ۔ فقہاے کرام کی تصریحات کی روشنی میں مسئلے کی صحیح نوعیت یہ ہے:

۱۔ اس معاملے میں بارِ ثبوت بچی کے ولی پر نہیں بنتا ہے بلکہ حکمران پر ہے اور مجرم تک پہنچنا قاضی کی ذمہ داری ہے جس کے لیے وہ صرف حکمران کی جانب سے پیش کیے گئے ثبوتوں پر ہی انحصار کرنے کا پابند نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پر لازم ہے کہ آگے بڑھ کر خود ایسی تدابیر اختیار کرے کہ مجرم کا حال معلوم ہوسکے اور اس کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت اکٹھے کیے جاسکیں۔

۲۔ چونکہ اس معصوم بچی کے ساتھ پیش آیا ہوا واقعہ حقیقت ِ امر میں سرے سے ہی حدِ زنا کا مسئلہ ہے ہی نہیں ، بلکہ یہ فساد کی بدترین قسم ہے جس کے لیے فقہاے کرام "سیاسہ" کے تصور کی رو سے قاضی کےلیے یہ اختیار مانتے ہیں کہ وہ قرائن اور جدید ترین ذرائع سے میسر آنے والے ثبوتوں کی روشنی میں مجرم کو ایسی عبرت ناک سزا دے کہ پھر کسی کو اس طرح کے جرم کے ارتکاب کی جرات ہی نہ ہوسکے۔

۳۔ بلفرض محال اگر مجرم کا حال و ماجرا اگر معلوم نہ ہوسکے تب بھی بچی کے ساتھ کیا گیا ظلم رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ اس کی تلافی کی ذمہ داری حکمران پر ہے اور قاضی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حکمران سے مظلوم کا یہ حق وصول کروائے ۔

المورد کے تجدد کی رو سے معاملے کی نوعیت:

ترجمان صاحب کی طرح میں بھی یہ بتا سکتا تھا کہ المورد کے تجدد کی رو سے اس مسئلے کی کیا نوعیت ہے اور اس تجدد کی رو سے حکمران کے اختیارات اور قانون کے ساتھ جو کھلواڑ ہوتا ہے، اس سے اس طرح کے معاملے میں کیا فسادِ عظیم برپا ہوسکتا ہے، لیکن میں بہرحال اس سطح تک نہیں گرسکتا ہوں کہ اس عظیم اور دردناک قومی سانحے کو پوائنٹ سکورنگ کے لیے استعمال کرسکوں مجھے اس سے معذور جانیے۔

ایک نصیحت:

وہ امر جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ ترجمان صاحب اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھیں گے، پھر بھی نصیحت کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میں پورے خلوص سے انھیں یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ فقہاے کرام کے متعلق یاوہ گوئی سے قبل ایک دفعہ فقہ اور اصولِ فقہ کو سمجھنے کی کوشش ضرور کریں، ترجمانی کے فرائض انجام دینے کی وجہ سے زیادہ فرصت نہ ہو تو کم از کم فقہاے احناف کے

ہاں "سیاسہ" کا تصور ہی سمجھنے کی کوشش کریں ، اور ہاں۔ اس مقصد کے لیے مستشرقین یا مستغربین کے بجاے فقہاے کرام ہی کی کتب کا مطالعہ کریں ، اور وہ بھی انکی اصل زبان میں دیکھی جائیں ۔

پس نوشت:

قاضی حسین احمد صاحب مرحوم کی دختر ایم این اے بنے تو ان کی صلاحیت کے باوجود اسے "اقربا پروری" سے تعبیر کیا جاتا ہے،اب اللہ جانے پتہ نہیں المورد میں ڈائریکٹر کا عہدہ اقربا پروری کا نتیجہ ہے یا نہیں ہے؟

اگروہ زندہ ہوتی' فقہ پر ہیجانی کیفیات کی بنیادپرکی گئی تنقید کاجائزہ

از: ڈاکٹر زاہد مغل

ویسے تو بحث کا یہ موقع مناسب نہیں لگتا ہے، مگر ایک صاحب نے اپنی پوسٹ میں "موقع کا زیادہ سے زیادہ" فائدہ اٹھانے کے لیے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ "دیکھیے فقہ کے اصولوں کے مطابق حالیہ کیس میں متاثرہ بچی کو کبھی وہ عدل و انصاف نہ مل پاتا جو سب لوگوں کے دل کی آواز ہے۔"

چناچہ برادر محمد مشتاق صاحب نے اُن کی پوسٹ میں پیوست اصولی غلطیوں کی عمدہ طریقے سے نشاندہی فرما دی ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ ہے کہ متعلقہ پوسٹ میں پیوست غلطی کو ایک مزید نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے۔
متعلقہ پوسٹ میں اصل نکتہ (کہ نصوص کی روشنی میں فقہاء کرام کی پوزیشن میں کیا غلطی و مسئلہ ہے) پر کوئی نقد، یہاں تک کہ اشارہ تک موجود نہیں ہے، ان کی پوسٹ کے پس پشت دلیل کا تمام تر وزن "فی الوقت موجود جذباتی ہیجان" سے مستعار ہے، یہ ہیجان کس بنا پر قایم ہے؟
اس بنا پر کہ:

الف: ایک چھوٹی سی بچی کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

ب: اسے قتل کر دیا گیا۔

ج: اسے کچرا کنڈی میں ڈال دیا گیا۔

د: ہر قسم کے میڈیا میں اس پر غم و غصے سے بھرپور فضا ہے۔

یہ ہے وہ مجموعہ جس کے سہارے انہوں نے اپنا کیس (ان کی اصولی غلطیوں کو فی الحال اگنور کیجیے اور ایک لمحے کے لیے یہ مان لیجیے کہ یہ معاملہ جوں کا توں ہے جیسے انہوں نے بیان کیا) کھڑا کیا ہے۔ اپنی پوسٹ میں انہوں نے نہایت سادگی کے ساتھ اس مفروضے کو درست فرض کر لیا کہ اس غم و غصے کی حالت میں لوگوں کے دلوں میں جو غصہ ہے، گویا وہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے اور چونکہ غامدی صاحب کا اجتہاد اس فوری غصے کی تسکین کا باعث بن سکتا ہے، لہذا وہ درست ہے، جبکہ فقہاء کی پوزیشن اس غصے کی تسکین کے لیے کافی نہیں ہے، لہذا وہ غلط ہے۔

اول تو یہ ایک غیر ثابت شدہ و باطل مفروضہ ہے اور اگر شرعی احکامات کو اس طرح وقتی جذبات کے حوالوں سے ناپے جانے کا درست اصول مان لیا جائے تو پھر رسول اللہ ﷺ کے گستاخانہ کارٹون بنانے والے کے قتل کو بھی آپ جائز سمجھیے کیونکہ یہ بھی مسلمانوں کے غم و غصے میں تسکین کا باعث ہے۔ لہٰذا ہم چاہیں گے کہ صاحب پوسٹ بجائے موجودہ ہیجانی کیفیت کو استعمال کرنے کے نصوص کی روشنی میں اپنے مقدمے کو پیش کریں۔

دوسری بات یہ کہ صاحب پوسٹ نے چپکے سے ایک مناظرانہ چالاکی کا مظاہرہ کیا ہے،وہ یہ کہ انہوں نے بات یہاں سے شروع کی کہ ''اگر بچی زندہ ہوتی تو؟'' یعنی (الف) تا (د) کے مجموعے سے مل کر جو فضا بنی ہوئی ہے، اس میں سے (ب) تا (د) کو انہوں نے قاری کی نظر سے اوجھل کردیا ہے، اور پھر اپنا تجزیہ داغ دیا۔ بھائی مسئلہ یہ ہے کہ جس معاشرتی تناظر سے آپ اپنے کیس میں وزن پیدا کرنا چاہتے ہیں، (ب) تا (د) کو اگنور کرنے کے بعد اس میں وہ حساسیت ہی غائب ہوجاتی ہے اور ممکن ہے کہ جب آپ صرف صورت (الف) میں اپنے کیس کو پیش کریں تو آپ کی بات کو جانچنے کا میرٹ بھی بدل جائے۔

چلیں میں آ جیسوں کو سمجھانے کے لیے مثال دیتا ہوں: یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے کے کیسز پائے جاتے ہیں، اور تو اور خود خاندانوں میں (چچا، ماموں وغیرہ کی صورت میں) اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ بسا اوقات یہ معاملات کسی سبب معلوم بھی ہوجاتے ہیں، تو کیا لوگ اپنے متعلقہ رشتہ دار کو پکڑ کر سنگسار کر دیتے ہیں، یا پولیس کے حوالے کردیتے ہیں؟ نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ تناظر بدل گیا ہے اور جب تناظر بدل گیا تو عین ممکن ہے کہ ایک جرم ثابت کرنے کے لیے جس وجہ یا دلیل کو آپ ایک کیس میں کافی سمجھ رہے تھے، ممکن ہے کسی دوسرے تناظر میں اسے کافی نہ سمجھیں۔ اگر یہ بات سمجھ آگئی کہ انہوں نے اپنا مقدمہ ایک مخصوص کیس کے تناظر میں مفروضوں کے ساتھ کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے، تو اب اس سے اگلی بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ متعدد جہات میں توازن قائم کرتے وقت وہ اکثر وقتی یا حادثاتی نوعیت کے جذبات سے متاثر ہوکر ''عمومی و حادثاتی'' پہلوؤں کو خلط ملط کر دیتا ہے، مثلا حالیہ واقعے کی سنگینی کے تناظر میں فی الوقت بہت سے لوگ ''سخت سے سخت سزا'' (مثلا رجم یا سر عام پھانسی وغیرہ) کی حمایت کرر ہے ہیں، مگر یقین مانیے کہ چند ماہ بعد تفتیش کے بعد (جب جذبات ذرا ٹھہراؤ کی سطح پر آچکے ہوں گے) اگر عدالت واقعی مجرم کو سرعام رجم کرنے کی سزا سنا دے اور حکومت اس پر عمل کا فیصلہ کرلے تو انھی لوگوں کی ایک اکثریت اس کے خلاف لب کشائی کر رہی ہوگی۔

ہیومن رائٹس کی یہی تنظیمیں پھر اس ''ظلم'' پر عالمی میڈیا کو متوجہ کریں گی بلکہ خود ہمارے میڈیا والے بھی شور مچا دیں گے۔
انسانی زندگی سے متعلق ہر عمل کی متعدد جہات ہوتی ہیں اور انسانی عمل کو ریگولیٹ کرنے والا ہر قانون، جی ہاں ہر قانون و تشریح، ان متعدد جہات میں اقداری ترجیح کا کوئی پیمانہ لازما

قائم کرتا ہے۔ مثلا قصاص کی سزا میں جہاں کسی جان تلف کرنے کی سزا کا پہلو ہے تو دوسری طرف ایک اور جان کو تلف کرنے یا مثلا مجرم کے لواحقین کے غم یا ان کی معاشی کفالت کا پہلو وغیرہ موجود ہوتا ہے۔ اب قصاص کا قانون ان کے درمیان اقداری ترجیح کا یہ پیمانہ فرض کرتا ہے کہ اول الذکر (یعنی جان تلف کرنے کی سزا) دیگر پہلوؤں سے بہرحال مقدم ہے، اس لیے اسے نافذ کیا جائے گا۔

چنانچہ شارع جب کوئی حکم متعین کرتا ہے تو وہ درحقیقت متعدد پہلوؤں کے مابین اقداری ترجیح کا ایک توازن ہوتا ہے۔ اسی طرح شارع نے زنا کی سزا کے لیے نصاب و اثبات کا جو طریقہ کار مقرر کیا ہے، اس میں "فرد کی عصمت" کو انتہائی اہمیت و ترجیح دی گئی ہے۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک آدھ کیس میں عمل کے ارتکاب کا اظہار یوں ہو کہ ان دیگر پہلوؤں کا حاصل جمع اول الذکر کے مساوی ہوجائے یا اس پر غالب آجائے، اور اس کی بےشمار مثالیں جمع یا فرض کی جاسکتی ہیں، بالی وڈ سے ہالی وڈ تک کی فلموں میں ایسی تھیمز پر بے شمار فلمیں موجود ہیں جہاں ایک "قاتل ہیرو" کو بالاخر عدالت رہا کر دیتی ہے، اور تمام ناظرین کا دل یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ "یہی عدل کا تقاضا تھا، عدالت نے بالکل درست کیا"۔

لہذا غور طلب امر ہے کے بلآخر ان کیسز کو کیسے ایڈریس کیا جائے؟ کیا ایسے کیسز کو مد نظر رکھتے ہوئے "اصل و عمومی قانون" ہی کو تبدیل کر دیا جائے یا انھیں ایڈریس کرنے کے لیے عمومی قانون میں کوئی ایسا اضافی قضیہ شامل کیا جائے جو اس کیس کو اس عمومی کیس سے ممیز کر سکے، جس کی عمومی سزا موجود ہے؟ ہمارے فاضل دوست کا کہنا دراصل یہ ہے کہ اس کیس کو ایڈریس کرنے کے لیے پورے نظام فکر کو بدلنا لازم ہے، (جس کے لیے انہوں نے سوائے ہیجانی کیفیت کو استعمال کرنے کے کوئی دلیل نہیں دی ہے) جبکہ علماء پاکستان میں اس موضوع پر ہونے والی بحث میں پہلے ہی اس قسم کے کیسز سے متعلق یہ واضح کرچکے ہیں کہ ان میں تعزیرا سزائے موت دی جاسکتی ہے، نیز اس کے لیے چار گواہوں کی شرط بھی لازم نہیں ہے۔[142]

اب دیکھیے کہ علماء نے مسئلے کا حل پہلے ہیپیش کر چکے ہیں، مگر چونکہ صاحب پوسٹ کے نزدیک مسئلے کا حل اہم نہیں ہے، بلکہ اہم چیز اپنے فکری مخالف کو غیر معقول ثابت کرنا ہے نیز اپنے گروہی مفادات کو بڑھاوا دینا اصل مقصد ہے، لہذا انہوں نے مسئلے کی ایسی منظر کشی کی ہے جس سے اس ہیجانی کیفیت میں لوگوں کو یہ لگے کہ "دیکھومسلمانوں کی فقہ کتنی ظالم ہے اور غامدی صاحب کا مذہب کتنا اچھا ہے"۔ (یہاں موقع کی نزاکت اجازت نہیں دیتی ہے ورنہ معمولی سے تھاٹ ایکسپیریمنٹ سے ہم اپنے محترم کو ایسی مثال تخلیق کرکے دکھاتے جس سے ان کی فقہ کے احکامات سے ایک فریق پر بظاہر ظلم ہوتا دکھائی دے، ہم نے وہ مثال لکھ کر پھر محو کر دی کہ اس سے بہت سے لوگوں کے جذبات مجروح ہوجائیں گے)۔

---

[142] **کیونکہ یہ معاملہ خالصاً زنا بلجبر یا رضا سے قدرے مختلیف ہے لہذا ریاست و حکومت سیاستِ شریعہ کے تناظر میں کوئی سزا چاہے پھانسی،گردن زدنی یا پھر موت کا کوئی معقول طریقہ نافذ کرسکتی ہے۔معج**

ہمارے نزدیک ان کی یہ پوسٹ علم کی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے، کیونکہ اس میں کوئی علمی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اسے زیادہ سے زیادہ ‘‘موقع کا بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے وضع کردہ مناظرانہ اپیل’’ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی مثال اس بریلوی مناظر کی سی ہے کہ جب وہابی مناظر نے دوران مناظرہ تقریر میں ‘‘قال قالا رسول اللہ ﷺ ’’ کہا تو بریلوی مناظر نے شور مچا دیا کہ دیکھو یہ گستاخ رسول اللہ ﷺ کو کالا کالا کہتا ہے، میں پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ وہابی گستاخ ہے، اور لوگوں نے پکڑ کر وہابی مولوی کی پھینٹی لگا دی۔

مغالطہ:اچھا ہوازینب تم مرگئی ورنہ مولوی تم سے چار گواہ مانگتے

از: ڈاکٹر محمد مشتاق احمد[143]

<u>جنسی تشدد زنا کی قسم نہیں ہے، نہ ہی اس کےلیے معیار ثبوت زنا کا ہے:</u>

پہلی بات یہ ہے کہ فقہاے کرام کی ساری بحث باہمی رضامندی سے کیے جانے والے زنا سے متعلق ہے۔ اکراہ کا ذکر اس میں دیگر اثرات کا جائزہ لینے کے برسبیل تذکرہ آگیا ہے،دوسری بات یہ ہے کہ جرم کی نوعیت اور اس کا معیارِ ثبوت دو الگ الگ امور ہیں اور انھیں الگ الگ ہی سمجھنا ضروری ہے، اس لیے ہم پہلے جرم کی نوعیت پر بحث کرتے ہیں۔ جرم کی نوعیت سمجھنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ **<u>ریپ یا "زنا بالجبر"</u>** کا تصور ہے، اس تصور نے ہی فقہاے کرام کے موقف کو سمجھنا جدت پسندوں کی نگاہ میں مشکل بنادیا ہے اور انگریزی قانون کے اس تصوری عدم تفہیمی کیغلطی کا تمام ملبہ فقہاے کرام پر ڈال دیا جاتا ہے۔

پچھلی پوسٹ میں جہاں **<u>امام سرخسی</u>** کے حوالے سے **<u>زنی بمکرھۃ</u>** کی صورت کا ذکر ہے وہاں وہ ایک سیریز آف کیسز کا حصہ ہے جس میں پہلے ہی سے زنا ثابت شدہ ہے اور وہ اس پر بحث کررہے ہیں کہ اس صورت میں جبکہ عورت پر زبردستی کی گئی تھی اور اس بنا پر عورت سے حد ساقط ہوگئی تو کیا مرد سے بھی ساقط ہوسکتی ہے کہ فعل اس نے تنہا تو نہیں کیا تھا؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ مرد کا فعل الگ ہے اور عورت کا فعل الگ اور مرد کو اس کے فعل کی سزا دی جائے گی۔ اس لیے وہ زنا کی حد سے نہیں بچ سکتا ہے۔ وہ یہاں یہ بحث کر ہی نہیں رہے کہ **<u>"زنا بالجبر"</u>** کا معیارِ ثبوت کیا ہے؟
ان کی بحث اس سوال پر ہے کہ جب زنا ثابت ہوچکا ہے لیکن ساتھ ہی اکراہ (جبر)بھی ثابت ہوا ہے تو کیا اکراہ کی وجہ سے زنا کی حد معطل ہوجائے گی؟ اس کا جواب وہ نفی میں دیتے ہیں، پس جہاں اکراہ بھی ثابت شدہ ہو اور زنا بھی ہو ثابت شدہ ہو تو اکراہ کرنے والے کو اکراہ کی سزا بھی دی جائے گی اور زنا کی بھی، یہ رہا ایک مسئلہ۔

اب آئیے دوسرے مسئلے کی طرف: جہاں صرف اکراہ ثابت ہو تو وہاں آخرکار کیا کیا جائے گا؟ اس سیدھے سادے سوال میں ہی سارے مسئلے کی کنجی منہاں ملتی ہے، اس سیدھے سادے سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں اکراہ ثابت ہو وہاں اکراہ کی سزا دی جائے گی ، اس پر سوال قائم ہوتا ہے کہ

[143] چیئرمین شعبۂ قانون : بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی۔ اسلام آباد

اکراہ کی سزا آخر کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے بہت سے دیگر جرائم کی طرح اکراہ کے جرم کی سزا بھی متعین نہیں کی ہے بلکہ اسے حکمران کی صواب دید پر چھوڑا ہے جو اکراہ کی صورت اور نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پر مناسب سزا مقرر کر سکتا ہے، سنگین صورتوں میں وہ سزائے موت بھی مقرر کر سکتا ہے، بہت زیادہ سنگین صورتوں میں وہ سزائے موت کےلیے کوئی عبرتناک طریقہ بھی تجویز کرسکتا ہے، یوں فقہائے کرام کےلیے یہ معاملہ حدود کا نہیں ہے، بلکہ "سیاسہ" کا ہے۔

اب سوچیے کہ اکراہ کی ممکن صورتیں کیا ہوسکتی ہیں؟ انسان کس حد تک وحشی ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی جامع و مانع فہرست مرتب کرنا کسی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے، ہم صرف چند موٹی موٹی کیٹگریز ہی ذکر کرسکتے ہیں، ان کیٹگریز میں ایک کیٹگری "جنسی تشدد" کی بھی ہے۔ اب اس پر سوچیے کہ جنسی تشدد کی کون کون سی ممکن صورتیں ہوسکتی ہیں؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اس کی جامع مانع فہرست بنانا ممکن ہی نہیں ہے۔ بے شمار صورتیں ہوسکتی ہیں جن میں ایک وہ صورت بھی ہوسکتی ہے جسے انگریزوں نے ریپ کہا تھا اور پھر یہاں اس کےلیے زنا بالجبر کا ترجمہ رائج کرایا گیا۔

واضح رہے کہ اب اگر کسی شخص نے کسی عورت کو نوچا کھسوٹا اور دیگر کئی وحشیانہ طریقے اختیار کیے لیکن اس نے دخول فی القبل نہیں کیا تو وہ جنسی تشدد تو ہے لیکن زنا بالجبر نہیں ہے۔ اسی طرح اگر اس نے دخول فی الدبر کیا تو یہ جنسی تشدد تو ہے لیکن زنا بالجبر نہیں ہے، نہ ہی ان دونوں صورتوں کو ریپ کہا جاسکتا ہے[144]۔

اس لیے ایک تو ریپ اور زنا بالجبر کا تصور انتہائی حد تک ناقص ہے، جنسی تشدد کی بے شمار دیگر قسمیں، جو زیادہ سنگین بھی ہوسکتی ہیں، اس تعریف میں آتی ہی نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اسے "زنا" کی صورت بنا دیا گیا ہے، جو فقہائے کرام کے اصولوں کے مطابق غلط ہے، یہ زنا کی قسم نہیں بلکہ جنسی تشدد کی قسم ہے، اکراہ کی قسم ہے، جنکے نزدیک سیاسہ بھی جرم ہے۔ اس بحث کے بعد معیارِ ثبوت کا مسئلہ خود بخود واضح ہوگیا۔ جب جنسی تشدد کا جرم زنا کے جرم سے الگ جرم ہے اور اس پر سیاسہ کے اصول کا اطلاق ہوتا ہے تو پھر اس کے ثبوت کےلیے چار گواہوں کی شرط بھی ضروری نہیں ہے اور اس کی سزا بھی سو کوڑے یا رجم کے علاوہ کچھ اور شکل اختیار کرسکتی ہے۔

<u>کیا جنسی تشدد کے ثبوت کےلیے چار گواہ چاہئیں؟</u>

اسلامی قانون سے مناسبت رکھنے والے کسی بھی شخص سے یہ سوال پوچھیے، وہ اس کا جواب نفی میں دے گا، کہ متخصصین فی المیزان کی ساری بحث ہی غلط نہج پہ چل رہی ہے اور ان کی سمجھ میں آ بھی نہیں رہا کہ انھیں غلطی کہاں سے لاحق ہوئی ہے کیونکہ یہ بے چارے پروپیگنڈے کے متاثرین میں سے ہیں اور اس لحاظ سے قابلِ رحم ہیں۔

---

144 **مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ: 375**

پروپیگنڈے کی وضاحت کے لیے اس امر پر غور کریں کہ یہ پاکستان میں حدود آرڈی نینسز کے خلاف تھے، اس میں بار بار یہ جھوٹ دہرایا گیا اور جو ہنگامہ اٹھایا گیا اور بقول غامدی صاحب جس کےلیے کہ ریپ کی شکار خاتون سے چار گواہ طلب کیے جاتے ہیں اور وہ بے چاری چار گواہ کہاں سے لائے۔ یہاں کسی نے اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ جرم زنا آرڈی نینس ایک دفعہ پڑھ کر تو دیکھ لیا جائے کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ چلیں ہم آپ کو اس آرڈی نینس کی بعض دفعات پڑھوا دیتے ہیں۔

دفعہ 6: میں زنا بالجبر کی تعریف پیش کی گئی تھی ۔

دفعہ 8: میں اس کےلیے معیار ثبوت یہ رکھا گیا تھا کہ ملزم اقرار کرے یا اس کے خلاف چار گواہ پیش ہوں۔ آرڈی نینس کے ناقدین نے اس سے آگے پڑھنے کی زحمت گوارا ہی نہیں کی۔

دفعہ 10 : میں قرار دیا گیا تھا کہ چار گواہ نہ ہوں تو کیا کیا جائے گا۔ ملاحظہ کریں:

whoever commits : zina-bil-jabr which is not liable to hadd, or for which proof in either of the forms mentioned in **Section 8** is not available and the punishment of 'qazf' liable to hadd has not been awarded to the complainant, or for which hadd may not be enforced under this Ordinance, shall be liable to tazir.

اسی دفعہ کی ذیلی **دفعہ 3:** میں قرار دیا گیا تھا:

Whoever commits zina-bil-jabr liable to tazir shall be punished with imprisonment for a term which may extend to twenty-five years and shall also be awarded the punishment of whipping numbering thirty stripes.

ان دفعات کی روشنی میں یہ دعوی قطعی غلط تھا کہ ریپ کی شکار خاتون اگر چار گواہ پیش نہ کرسکی تو ریپ ثابت نہ ہوتا ہے، یا یہ کہ ریپ کے ثبوت میں ڈی این اے اور میڈیکل رپورٹس ناقابل اعتبار ٹھہرائی گئی ہیں۔یہاں بحث صرت اتنی تھی کہ چار گواہ "حد" کی سزا کےلیے درکار تھے۔ ڈی این اے اور دیگر رپورٹس اور ثبوتوں پر 25 سال تک قید اور 30 کوڑوں کی تعزیری سزا دی جاسکتی تھی۔

جہاں تک قذف کا تعلق ہے، ریپ کے مقدمے میں ایک امکان یہ بہرحال موجود ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ملزم کو جھوٹے دعوے میں فریم کیا جارہا ہو، اس لیے اس آرڈی نینس میں یہ قرار دیا گیا کہ اگر الزام لگانے والی کو عدالت نے قذف کی سزا سنائی تو پھر ریپ کے ملزم کو ریپ کی تعزیری سزا نہیں دی جاسکے گی، یہ تو عین منطقی بات تھی۔ جب کہ اس پر لگایا گیا الزام عدالت میں جھوٹا ثابت ہوا تو کیسے اسے ریپ کی سزا دی جاسکتی ہے؟
قانون نے پولیس کو یہ اختیار نہیں دیا تھا کہ وہ ریپ کا الزام لگانے والی خاتون پر قذف کا مقدمہ بھی دائر کردے، قذف آرڈی نینس میں قذف کی تعریف صرف زنا کے الزام پر محیط تھی، نہ کہ زنا بالجبر کے الزام پر۔ تاہم پولیس، بالخصوص پنجاب پولیس، نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا جس کی وجہ سے

مظلوم خواتین کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اس سلسلے کو وفاقی شرعی عدالت نے روکا تھا۔

یہ تو رہا حدود آرڈی نینسز اور "زنا بالجبر" کا معاملہ جس میں حدود آرڈی نینسز کے تحت بھی جرم کو چار گواہوں کے بجاے دیگر طریقوں سے ثابت کیا جاسکتا تھا لیکن اس صورت میں حد کے بجاے تعزیـــــــــــــر کـــــــــــــی ســـــــــــــزا دی جـــــــــــــاتی ہـــــــــــــے۔
اس کے بعدجاتے جاتے پھر بیان کرتا چلوں کہ (متخصصین فی المیزان کی سمجھ میں تو ایک بار پھر کم علمی اور ہٹ دھرمی کے سبب کچھ سمجھ نہیں آئے گا لیکن عام لوگوں کے لیے واضح کردوں کہ) ہماری بحث "زنا بالجبر" پر نہیں بلکہ "جنسی تشدد" پر ہورہی ہے۔ اب کیا متخصصین فی المیزان کسی ایک فقیہ کا نام بتاسکتے ہیں جو جنسی تشدد کے ثبوت کےلیے چار گواہ لانا لازمی سمجھتے ہوں؟

چلـیں کسـی ایسـے فقیـہ کـا ہـی نـام بتـادیں جـو جنسـی تشـدد کـے الـزام کـو قـذف کہتـا ہـو؟ یہ بھی نہیں تو کسی ایسے فقیہ کا نام بتادیں جو "زنا بالجبر" کے الزام کو قذف کہتا ہو اور اس وجہ سے ثبوت میں چار گواہ مانگتا ہو۔

یہ بھی نہ ہوسکے تو کم از کم یہ تو مان لیجیے کہ فقہ اور فقہاے کرام کے متعلق آپ خواہ مخواہ کی بدگمانیوں میں مبتلا ہیں۔

صـــــــــــلاے عـــــــــــام ہـــــــــــے یـــــــــــارانِ نکتـــــــــــہ داں کےلـــــــــــیے

زنا،قحبہ گری،زناکاعادی مجرم اورزنا بالجبر : کیاغامدی صاحب سب کےلیےچارگواہ ضروری سمجھتےہیں؟

از: تحریر ڈاکٹر محمد مشتاق احمد[145]

یہ امر دیکھا گیا ہے کہ دیگر کئی امور کی طرح اس معاملے میں بھی نہ صرف یہ کہ غامدی صاحب کی آرا میں ارتقا (کبھی معکوس ارتقا) واقع ہوا ہے، بلکہ چونکہ یہ آرا حالات کے دباو کے نتیجے میں تبدیل ہوتی رہی ہیں

جبھی ان میں تعارض بھی موجود ہے ، چنانچہ جب کبھی فقہائے کرام پر نکتہ چینی کی ضرورت محسوس ہو اور لوگوں کی جذباتی کیفیت کو مزید برانگیختہ کرنے کا موقع ہو تو غامدی صاحب کے فکری مقلدین اس طرح کے اقتباسات پیش کرنا شروع کردیتے ہیں کہ: ثبوت جرم کے لیے قرآن مجید نے کسی خاص طریقے کی پابندی لازم نہیں ٹھیرائی ہے، اِس لیے یہ بالکل قطعی بات دکھتی ہے کہ اسلامی قانون میں جرم اُن سب طریقوں سے ثابت ہوسکتا ہے جنھیں اخلاقیات[146] قانون کے ضمن میں مسلمہ طور پر ثبوتِ جرم کے طریقوں کی حیثیت سے قبول کرتی ہو۔

اور جن کے بارے میں عقل[147] تقاضا کرتی ہے کہ اُن سے اِسے ثابت ہونا چاہیے ، چنانچہ حالات، قرائن، طبی معاینہ، پوسٹ مارٹم، انگلیوں کے نشانات، گواہوں کی شہادت ، مجرم کے اقرار، قسم ، قسامہ اور اِس طرح کے دوسرے تمام شواہد سے جس طرح جرم دنیا میں ثابت ہوتے ہیں ، اسلامی شریعت کے جرائم بھی اُن سے بالکل اِسی طرح ثابت قرار پاتے ہیں ۔ عموماً زنا بالجبر کی بحث میں غامدی صاحب کے متاثرین غامدی صاحب کے بیان کردہ اس اصول سے ایک استثنا کا ذکر کرتے ہیں : کہ شریعت نے زنا کے جرم کے ثبوت کےلیے چار گواہ ضروری قرار دیے ہیں، اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ زنا کا جرم زنا بالجبر سے کافی مختلف ہے اور یہ کہ یہ حرابہ کی ایک قسم ہے ۔

---

[145] چیئرمین شعبۂ قانون : بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی۔ اسلام آباد

[146] اب یہاں یہ الگ امر ہے کہ وہ اخلاقیات کس اقدار کی حامل ہے یا انفرادی موضوعی مسلہ سے تعلق رکھتی ہو یا پھر انسانی حقوق کی مقلد اخلاقیات پر مبنی ہو یا پھر شرعی ماخذات و آثار پر استوار ہو جسے عموماً جدت پسند رد کردیتے ہیں اور ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ غیر اقداری یا پھر منفرد انفرادی نوعیت کی حامل ہو،اس ضمن میں تمام غامدیت و جدیدیت مغالطوں اور ابہام کی گندی گلیوں میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔معج

[147] عقل بلذات مذہبی و فلسفیانہ ادب میں کیا شہ ہے اور نفسیات و فعلیات میں اسکا کیا کردار ہے یہ بھی ایک علمی تنازع ہے ،جسے دیکھا جائے تو عقل ایک تفاوت پذیر ،متغیر ذہنی استعداد نظر ّتی ہے اور یہ علمیاتی ذرایع ،حسیات و تجربات پر بہت دارومدار کرتی ہے،جہاں صاف غلطی و خطا کا مسلہ ہمیشہ درپیش رہتا ہے۔معج

مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ قرآن نے نص صریح میں ایک اور جرم کےلیے بھی چار گواہ ضروری قرار دیے ہیں اور اس جرم کو غامدی صاحب ''حرابہ'' ہی میں شمار کرتے ہیں۔ آئیے خود غامدی صاحب کے الفاظ ملاحظہ کریں:

''دوم یہ کہ کسی معاشرے میں اگر قحبہ عورتیں ہوں تو اُن سے نمٹنے کے لیے قرآن مجید کی رو سے یہی کافی ہے کہ چار مسلمان گواہ طلب کیے جائیں جو اِس بات پر گواہی دیں کہ فلاں فی الواقع زنا کی عادی ایک قحبہ عورت ہے ۔ وہ اگر عدالت میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ گواہی دیتے ہیں کہ ہم اِسے قحبہ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور عدالت نقدو جرح کے بعد اُن کی گواہی پر مطمئن ہو جاتی ہے تو وہ اُس عورت کو سزا دے سکتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآءِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ، فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا.[148]

''اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں، اُن پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو ۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو اُن کو گھروں میں بند کر دو ، یہاں تک کہ موت اُنھیں لے جائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راہ نکال دے'' ۔

اس آیت کے متعلق غامدی صاحب کی یہ تاویل کس حد تک درست ہے، سردست ہم اس پر بحث نہیں کرنا چاہتے ہیں، ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ زنا کے علاوہ ایک اور جرم بھی ہے جس کے لیے قرآن نے چار گواہ ضروری قرار دیے ہیں اور اس جرم کی تشخیص انھوں نے ''قحبہ گری'' سے کی ہے ۔
اب ایک قدم آگے بڑھا کر دیکھیے کہ قحبہ گری یا ''زنا کی عادی عورت'' کے جرم کو غامدی صاحب حدود میں شمار کرتے ہیں یا نہیں اور اگر ہاں تو کس حد کا اطلاق اس جرم پر کرتے ہیں؟ اِس صورت میں اصل مسئلہ چونکہ عورت ہی کا ہوتا ہے، اِس لیے مرد زیربحث نہیں آئے ہیں۔ یعنی اِس بات کے گواہ کہ یہ فی الواقع زنا کی عادی قحبہ عورتیں ہیں۔

سورۂ نور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اِس جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی یہ شرط اِسی طرح برقرار رکھی گئی ہے۔ اِس سے یہ واضح ہے کہ یہ ایک عارضی حکم تھا، چنانچہ اِس میں جس راہ نکالنے کا ذکر ہے، وہ بعد میں اِس طرح نکلی کہ قحبہ ہونے کی وجہ سے اِن عورتوں کو زنا اور فساد فی الارض، دونوں کا مجرم قرار دیا گیا اور اِن جرائم کی جو سزائیں سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۲ اور سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۳۳ میں بیان ہوئی ہیں، وہ بعض روایتوں کے مطابق اِن پر نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی۔''

---

[148] النساء ۴ : ۱۵

((البیان:للغامدی : سورۃ النساء: آیت :15 پر حاشیہ : میں اس اقتباس کو بار بار پڑھیے اور بالخصوص درج ذیل مقامات پر غور کریں
''سورۂ نور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اِس جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی یہ شرط اِسی طرح برقرار رکھی ہے۔''
قحبہ ہونے کی وجہ سے اِن عورتوں کو زنا اور فساد فی الارض، دونوں کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔''
''اِن جرائم کی جو سزائیں سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۲: اور سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۳۳: میں بیان ہوئی ہیں، وہ بعض روایتوں کے مطابق اِن پر نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے''۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ قحبہ دو جرائم کا ارتکاب کرتی ہے: زنا اور فساد فی الارض اور اس وجہ سے اسے دونوں جرائم کی سزا دی جاتی ہے، ایک سزا سورۃ النور میں ہے (زنا کی) اور دوسری سزا سورۃ المآئدۃ میں ہے (فساد فی الارض کی) ، قحبہ کا جرم ثابت کرنے کےلیے معیار ثبوت چار گواہوں کی گواہی ہے کیونکہ '' سورۂ نور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اِس جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی یہ شرط اِسی طرح برقرار رکھی ہے'، اب اس پر ایک اور نکتے کا اضافہ کیجیے۔

<u>قرآن کریم نے بے حیائی کے ضمن میں عموماً دو قسمیں بیان کی ہیں:</u>

مسافحات اور متخذات اخدان۔ غامدی صاحب نے ان الفاظ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے : "بدکاری کرنے والیاں اور آشنائی گانٹھنے والیاں"۔ ان کی رائے یہ ہے کہ سورۃ النسآء کی آیت 15 میں مسافحات کا ذکر ہے اور آیت 16 میں متخذات اخدان کا ذکر ہے ۔

<u>چنانچہ آیت 16 کی تاویل میں کہتے ہیں:</u>

''یہ زنا کے عام مجرموں کا ذکر ہے جو بالعموم یاری آشنائی کے نتیجے میں اِس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اِس میں زانی اور زانیہ، دونوں چونکہ متعین ہوتے ہیں، اِس لیے دونوں کا ذکر ہوا ہے اور مذکر کے صیغے زبان کے عام قاعدے کے مطابق شریک غالب کے لحاظ سے آئے ہیں۔ یہی ایذا ہے جو بعد میں سو کوڑوں کی صورت میں متعین کر دی گئی'' ۔

پس قحبہ گری ہو یا زنا ، سفاح ہو یا اتخاذ اخدان، فساد فی الارض ہو یا "عام زنا "، دونوں کےلیے غامدی صاحب چار گواہوں کی شرط ضروری مانتے ہیں، اب ان دو باتوں کے ساتھ تیسری بات کا اضافہ کیجیے کہ روایات میں جہاں رجم کی سزا کا ذکر ہے، اسے غامدی صاحب قحبہ گری، فساد فی الارض اور زنا بالجبر کی سزا قرار دیتے ہیں ۔ یہ بات اتنی مشہور ہے کہ اس کےلیے کوئی اقتباس پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ، اب دیکھیے کہ رجم کی سزا کے متعلق روایات سے کیا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا کس بنیاد پر دی گئی ہے؟ کسی بھی روایت میں آپ کو اقرار یا چار گواہوں کے سوا کوئی تیسرا طریقہ نہیں ملتا ہے۔

لے دے کے ایک روایت (فجر کے وقت عورت پر جنسی حملے کا واقعہ) ملتی ہے جس سے غامدی صاحب کے متاثرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ "زنا بالجبر" کی سزا "متاثرہ عورت کی گواہی" پر دی گئی ۔ اس روایت پر الگ بحث کی ضرورت ہے لیکن سردست اتنا نوٹ کرنا کافی ہے کہ غامدی صاحب کے اصولوں کے مطابق اس روایت سے استدلال ہی غلط ہے کیونکہ اس کی سند بھی مضطرب ہے اور متن بھی اور جب تک روایت سنداً صحیح نہ ہو غامدی صاحب اسے استدلال کےلیے استعمال کرنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ نیز اس روایت میں بھی اس شخص کے اقرار کا ذکر بہرحال ملتا ہے۔

ان تین باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب فساد فی الارض میں زنا شامل ہوجائے تو غامدی صاحب اس کے ثبوت کےلیے چار گواہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اب جبکہ یہ معلوم ہوچکا کہ غامدی صاحب صرف زنا کےلیے ہی نہیں بلکہ زنا+فساد کے مجموعے کے ثبوت کےلیے بھی چار گواہوں کی گواہی ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے ترجمان صاحب کو دو میں سے ایک بات ماننی چاہیے:

۱۔ یہ کہ وہ زنا بالجبر کے ثبوت کےلیے بھی چار گواہوں کی گواہی ضروری سمجھتے ہیں ۔

۲۔ یہ کہ وہ زنا بالجبر کے ثبوت کےلیے چار گواہوں کی گواہی اس لیے ضروری نہیں سمجھتے کہ فساد فی الارض کی ہر قسم کے ثبوت کےلیے چار گواہوں کی گواہی ضروری نہیں ہوتی ۔

ہمیں معلوم ہے کہ ترجمان صاحب پہلا امکان تو مان ہی نہیں سکتے ہیں ،کیونکہ وہ پہلے ہی اپنے ایک غلط مفروضے کی وجہ سے فقہاے کرام کے خلاف اچھی خاصی ڈرامے بازی کرچکے ہیں، اس لیے دوسرے امکان پر بحث ضروری ہوگئی ہے ۔

<u>اس صورت میں ان پر لازم ہے کہ وہ درج ذیل تین سوالات کے جواب دیں:</u>

۱۔ یہ کہ زنا اور قحبہ گری کےلیے چار گواہ کیوں چاہئیں؟ ایک گواہ یا دو گواہ یا تین گواہ کیوں کافی نہیں ہیں؟ اگر گواہوں کی تعداد سے فرق نہیں پڑتا بلکہ اصل چیز گواہی کا معیار ہے (وہ بات جو یہ حلقہ مسلسل دھڑلے سے کہتا آیا ہے) تو ان دو جرائم کے ثبوت کےلیے چار گواہ کیوں درکار ہیں؟ جہاں تک فقہاے کرام کا تعلق ہے وہ زنا کےلیے تو چار گواہ ضروری سمجھتے ہیں لیکن "قحبہ گری" کو وہ سیاسہ جرائم میں سمجھتے ہیں اور اس کے ثبوت کےلیے چار گواہوں کی گواہی ضروری نہیں سمجھتے ہیں اور یہی قرینِ عقل بھی ہے۔

فرد کی پردہ پوشی ایک امر ہے اور فحاشی کا اڈا چلانا ایک بالکل ہی مختلف امرہے، دونوں جرائم کو ایک نوعیت کا جرم سمجھنا ایک سنگین حماقت ہے اور یہ حماقت کم از کم غامدی صاحب تو نہیں کرسکتے ہیں ۔ اسی لیے انھوں نے قحبہ گری کو عام جرائم سے اٹھا کر "فساد فی الارض" میں شامل کردیا ہے ۔

ہاں! اس سوال کا جواب ان کے ذمے باقی رہتا ہے کہ فساد فی الارض کے ثبوت کےلیے "حالات، قرائن، طبی معاینہ، پوسٹ مارٹم، انگلیوں کے نشانات، گواہوں کی شہادت ، مجرم کے اقرار، قسم ، قسامہ اور اِس طرح کے دوسرے تمام شواہد سے جس طرح جرم دنیا میں ثابت ہوتے ہیں" اسی طرح یہ جرم ان سے کیوں ثابت نہیں ہوتا ہے؟ وہ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ کسی معاشرے میں اگر قحبہ ذدہ عورتیں ہوں تو اُن سے نمٹنے کے لیے قرآن مجید کی رو سے یہی کافی ہے کہ چار مسلمان گواہ طلب کیے جائیں جو اِس بات پر گواہی دیں کہ فلاں فی الواقع زنا کی عادی ایک قحبہ گر عورت ہے ۔ وہ اگر عدالت میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ گواہی دیتے ہیں کہ ہم اِسے قحبہ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور عدالت نقدو جرح کے بعد اُن کی گواہی پر مطمئن ہو جاتی ہے تو وہ اُس عورت کو سزا دے سکتی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ جو لوگ یہ گواہی دیں گے کہ ہم اِسے قحبہ کی حیثیت سے جانتے ہیں "وہ یہ کس بنیاد پر کہیں گے؟ کیا وہ یہ کہیں گے کہ ہم خود اس کے گاہک رہے ہیں؟ یا یہ کہیں گے کہ ہم نے دوسروں کو اس کے پاس اس مقصد کےلیے آتا جاتا دیکھا ہے؟ اگر یہ دوسری بات ہے تو کیا اس سے بدرجہا بہتر طرقِ اثبات اور نہیں ہوسکتے ہیں؟ کیا یہاں شہادت میں سی سی ٹی وی فوٹیج کام نہیں کرسکے گی؟ یہ سوال غامدی صاحب کے ایک متاثر ڈاکٹر صاحب نے زنا بالجبر کے متعلق اٹھایا تھا۔ یہ سوال قحبہ عورتوں اور چکلے کے بارے میں کیوں نہیں اٹھایا جاسکتا ہے؟

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب غامدی صاحب چار گواہوں کی شرط زنا کی عادی ایک معاشی قحبہ گر عورت" کےلیے ضروری سمجھتے ہیں تو یہ کیسے ثابت ہوگا کہ وہ "زنا کی عادی" ہے ؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ "زنا کی عادی قحبہ عورت" اور "بدکاری کو پیشہ بنانے والوں" کو ناصرف غامدی صاحب خالی "زنا" کے مجرم نہیں مانتے ہیں بلکہ وہ انہیں "فساد فی الارض" بلکہ اس سے آگے بڑھ کر "حرابہ" کا مرتکب مانتے ہیں اور حرابہ کے مرتکب کےلیے وہ جو سزائیں تجویز کرتے ہیں ان میں ایک سزا رجم بھی ہے ۔

<u>یقین نہ ہو تو یہ ان کی عبارت پڑھیں:</u>

"زمین میں فساد پیدا کرنے کی تعبیر اُس صورت حال کے لیے آتی ہے، جب کوئی شخص یا گروہ قانون سے بغاوت کرکے لوگوں کی جان و مال ، آبرو اور عقل و رائے کے خلاف برسر جنگ ہو جائے۔ چنانچہ قتل دہشت گردی، زنا زنا بالجبر اور چوری ڈاکا بن جائے یا لوگ بدکاری کو پیشہ بنا لیں یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئیں یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن جائیں یا نظم ریاست کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں [149]۔"

آگے وہ واضح کرتے ہیں کہ حرابہ کی سزا میں ایک تقتیل بھی ہے اور یہ کہ رجم تقتیل کی ایک

---

[149] **میزان : حدود و تعزیرات**

صــــــــــــــــــــــــــــــــــــورت ہــے۔
‘‘رجم ،یعنی سنگ ساری بھی ،ہمارے نزدیک اِسی کے تحت داخل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اوباشی کے بعض مجرموں کو یہ سزا اِسی آیت کے حکم کی پیروی میں دی ہے’’۔

تو سوال یہ ہے کہ کیسے ثابت ہوگا کہ عورت ‘‘عام زنا’’ کا جرم نہیں کررہی ہےبلکہ اس کی ‘‘عادی’’ ہے؟ کیا محض گواہوں کی اس گواہی پر کہ وہ ‘‘عادی’’ ہے یا اس کےلیے عدالتوں کے سابقہ فیصلے درکار ہوں گے کہ کئی بار اسے ‘‘عام زنا ’’کی سزا عدالت نے دے دی ہے (جو غامدی صاحب کے نزدیک سو کوڑے ہیں) لیکن اس کے باوجود یہ ‘‘عادی’’ ہے اور یہ اس عادت کو نہیں چھوڑ رہی تو اس وجہ سے اب اسے فساد فی الارض، بلکہ حرابہ، کی سزا کے طور پر رجم کیا جائے یا اس کے ہاتھ پیر کاٹ لیے جائیں یا اسے مصلوب کیا جائے یا اسے ‘‘علاقہ بدر’’ کیا جائے ؟ اس آخری صورت میں ویسے یہ امکان تو رہتا ہی ہے کہ اپنے علاقے سے نکل کر وہ اور کھل کر اپنی عادت پر عمل شروع کردے کیونکہ وہاں تو کوئی اسے جاننے والا بھی نہیں ہوگا۔ اپنے علاقے میں کم از کم لوگوں کو اس کی عادت کا معلوم تو ہوتا ہے ۔

غامدی صاحب کی سادہ فکری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ‘‘عادی مجرموں’’ کو بھی ایک ہی دفعہ کی کارروائی میں تقتیل ، یعنی رجم، کی سزا سنانے کے قائل ہیں حالانکہ اس کا ‘‘عادی مجرم’’ ہونے کےلیے اور کچھ نہیں تو سابقہ مجرمانہ ریکارڈ اور سزائیں تو ہونی چاہئیں۔ تاہم ان کے مقلدین ان فقہاے کرام پر استہزائیہ جملے چست کرتے ہیں جو ذرا سا بھی شبہ پیدا ہونے کی صورت میں حد کے ساقط ہونے کی بات کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ زنا بالجبر اور قحبہ گری میں فرق کی وجہ کیا ہے؟ کیا صرف یہ کہ ایک میں عورت ملزمہ ہے تو چار گواہ چاہئیں اور دوسرے میں مرد ملزم ہے تو ڈی این اے رپورٹ اور سی سی ٹی وی فوٹیج بھی کافی ہے؟ یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ قحبہ گری اور زنا بالجبر کے علاوہ ‘‘فساد فی الارض’’ اور حرابہ کی ایک قسم ‘‘زنا کا عادی مجرم’’ بھی ہوتا ہے ، خواہ مرد ہو، تو کیا اس کےلیے بھی چار گواہ چاہئیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ اور اگر ہاں تو چار گواہ کیسے ثابت کریں گے کہ وہ پہلی دفعہ یہ جرم نہیں کررہا بلکہ ‘‘عادی’’ ہے ؟ یا اس کے جرم کے ثبوت کےلیے قرائن کافی ہوں گے؟

<u>آخری بات:</u>

آخری بات یہ ہے کہ زنا بالجبر ، قحبہ گری اور ‘‘عادی ’’ مجرموں پر غامدی صاحب ‘‘عام جرائم’’ کا قانون لاگو نہیں کرتے ہیں بلکہ انھیں ‘‘فساد فی الارض’’ اور ‘‘حرابہ’’ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے ترجمان قحبہ اور زنا کے عادی مجرم کو زنا بالجبر کے مرتکب سے اس بنیاد پر مختلف سمجھتے ہیں کہ قحبہ اور زنا کا عادی مجرم یہ جرم دوسرے فرد کی مرضی سے کرتا ہے جبکہ زنا بالجبر کا مجرم یہ جرم عورت کی مرضی کے بغیر کرتا ہے تو یہ فرق ناقابلِ قبول ہے۔

اسکی بنیادی وجہ یا علت یہ ہے کہ یہ فرق لبرلزم کے ڈسکورس کی پیداوار ہے اور اسے اسلامی قانون کے اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں ہے،باقی باتیں ایک طرف صرف اس ایک بات پر غور کریں کہ لبرلزم کے اصولوں کی روشنی میں ایک بار کا زنا یا بار بار کا زنا کوئی جرم نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ فریقین کی مرضی سے کیا جاتا ہے جبکہ اسلامی قانون کی رو سے یہ اللہ کے خلاف جرم ہے کیونکہ اللہ نے اس سے روکا ہے اور اس پر سزا مقرر کی ہے ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ غامدی صاحب بھی مانتے ہیں کہ اسلامی قانون کے اصولوں کی روشنی میں ایک بار کا زنا جرم ہے اور بار بار کا زنا فساد فی الارض اور حرابہ ہے ۔ اس بنیادی اختلاف کے بعد کیسے لبرلزم کے اصول (مرضی کی موجودگی یا عدم موجودگی) کو یہاں فرق کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے؟

بہرحال غامدی صاحب کے ترجمان اور مقلدین پر لازم ہے کہ وہ ہمیں صاف الفاظ میں بتائیں کہ زنا کی درج ذیل چار قسموں میں جب وہ تین قسموں کےلیے چار گواہ ضروری سمجھتے ہیں تو چوتھی قسم کےلیے کیوں ضروری نہیں سمجھتے ہیں بالخصوص جبکہ وہ پہلی قسم کے سوا باقی تینوں قسموں کو فساد فی الارض اور حرابہ مانتے ہیں ؟

بحث ختم کرنے سے قبل پھر وہ اقسام تذکرہ کرتے جاتے ہیں تاکہ انکو مد نظر رکھ کر قاری معاملہ فہمی حاصل کرسکیں۔

۱۔ ‘‘عام زنا۔
۲۔ بدکاری کا پیشہ :قحبہ گری۔
۳۔عادت زنا۔
۴۔ زنا بالجبر ۔

اسلام کے تعزیری قوانین اور جدید دنیا

از:-------------------------------------

عصر حاضر میں جرائم نے ایک عالم گیر وبا کی صورت اختیار کرلی ہے، دنیا کا کوئی خطہ ان سے محفوظ نظر نہیں آتا ہے۔ تمام ممالک، خواہ وہ ترقی یافتہ ہوں، یا ترقی پذیر، یا پس ماندہ، ہوں سب ہی ان کی لپیٹ میں آچکے ہیں،اور ان کا دائرہ سماج کے تمام طبقات تک وسیع ہوچکا ہے، خود ہمارا ملکِ عزیز بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے، بلکہ اس کا شمار دنیا کے ان چند گنے چنے ملکوں میں ہوتا ہے، جہاں جرائم کا گراف کافی اونچا سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی دن کا اخبار اٹھاکر دیکھ لیجئے، وہ قتل، چوری، ڈکیتی، اغوا، اسمگلنگ، لوٹ کھسوٹ، زنا بالجبر، اقدام زنا، جنسی تشدد، دست درازی، جہیز کے لیے زدو کوب، رحم مادر میں بچیوں کا قتل، بچوں کی خرید و فروخت اور جبری مزدوری، رشوت، شراب نوشی اور منشیات کا استعمال، غرض مختلف جرائم کے واقعات اور ان کی رپورٹوں سے بھرا ہوانظر آتا ہے۔

ہر معاشرے و ملک کے دانش وران اور اربابِ حل و عقد جرائم کے انسداد کی تدابیر ڈھونڈنے میں سرگرداں دکھتے ہیں، لیکن جرائم ہیں کہ کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھتےہی جارہے ہیں ، یہ صورتحال تقاضا کرتی ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین کا مطالعہ کیا جائے اور یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ وہ انسداد جرائم میں کس حد تک معاون ہیں۔ اسلام کے علمبرداروں اور اس کی ترجمانی کرنے والوں پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عماتہ الناس وعامتہ الخاص دونوں پر ان قوانین کی معنویت آشکارا کریں اور ان کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کودور کریں۔

اسلام کے تعزیری قوانین کے مطالعہ و جائزہ کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ قوانین آزمودہ ومجرب ہیں[150]، تاریخ کے ایک عرصہ میں یہ ایک خطہ زمین میں نافذ رہے ہیں اور سماج میں ان کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے گئے ہیں۔ جس زمانے میں یہ قوانین نافذ کیے گئے اس زمانے میں سرزمینِ عرب فتنہ و فساد کی آماج گاہ بنا ہوا تھا، لوٹ مار، قتل و غارت گری، چوری ڈکیتی، عصمت دری، شراب نوشی اور دیگر سماجی برائیاں، جن کا آج ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کررہے ہیں،وہاں عام تھیں، اور مابعد ریاست مدینہ کے دور میں ان قوانین کے نفاذ کے

---

[150] **اس ضمن میں خاکسار کے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے ’‘ ریاست مدینہ دور رسالت اور عہد ہائے خلفائے راشین میں علمی و تحقیقی مطالعہ:۱ ہجری تا ۲۰ ہجری:قران،احادیث صحیحہ،و تاریخ صحیحہ کی روشنی میں تحقیق کردہ کا مطالعہ نافع ثابت ہوگا۔معج**

نتیجے میں یہ برائیاں تقریباً ختم ہوگئیں اور پورے خطے میں امن وامان کا دور دورہ ہوگیا۔ اس سلسلے میں حضرت عدی بن حاتمؓ، جو ۹ھ میں مشرّف بہ اسلام ہوئے، بیان کرتے ہیں کہ :

ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں مخاطب کرکے فرمایا ''اے عدی، اگر تم کچھ عرصہ مزید زندہ رہے تو ضرور دیکھ لوگے کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کرکے مکہ پہنچے گی اور خانۂ کعبہ کا طواف کرے گی، پورے سفر میں اسے اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہوگا'' حضرت عدیؓ بیان کرتے ہیں کہ:'' رسول اللہ ﷺ کی اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے ہوئے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں[151]''

اسلام کا مزاج یہ رہا ہے کہ یہ انسانوں کو عقیدہ کی پوری آزادی دیتا ہے [152]اور انھیں دائرۂ ایمان میں داخل ہونے پر مجبور نہیں کرتا ہے، لیکن وہ کسی شخص کو اس بات کی چھوٹ بھی نہیں دیتا ہے کہ وہ انسانی مصالح کو پامال کرتا پھرے، اور انسانوں کی جانوں کے درپے ہونے لگے، یا ان کے مالوں میں لوٹ کھسوٹ کرتاپھرے، ان کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہو، یا ایسے کام کرے جن سے نسل انسانی کے تسلسل میں رکاوٹ آئے، یا عقل انسانی میں فتور پیداہو۔ اسلام حقیقت میں ان مصالح میں سے کسی مصلحت پر دست درازی کو وہ سنگین جرم قرار دیتا ہے اور اس پر سزا عائد کرتا ہے۔

اس موضوع پر امام غزالیؒ نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے،انھوں نے پانچ مقاصدِ شریعت کاتذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

'' ان پانچوں اصولوں کی حفاظت 'ضروریات' (انتہائی ناگزیر چیزوں) کے درجے میں سے ہیں، اس لیے کہ یہ انسانی مصالح کااعلیٰ ترین درجہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ شریعت نے اُس منکر دین کو ،جو دوسروں کو گم راہ کرنے کے درپے ہو، قتل کرنے اور اس بدعتی کو، جو دوسروں کو اپنے خود ساختہ عقیدہ کی طرف دعوت دے، سزا دینے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح شریعت نے قصاص کو واجب کیا ہے، تاکہ انسانی جانیں محفوظ رہیں۔ شراب نوشی پر سزا لازم کی گئی ہے، تاکہ عقلیں محفوظ رہیں، جن کی وجہ سے انسانوں کو احکام کامکلّف کیا گیا ہے۔ زنا پر حد واجب کی گئی ہے، تاکہ نسل اور نسب محفوظ رہیں، چوروں اور لٹیروں کی سرزنش کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ انسانی اموال محفوظ و مامون رہیں، جو انسانوں کی معیشت کا ذریعہ ہیں اور جن کے وہ محتاج ہوتے ہیں،ان پانچوں بنیادی اصول کی پامالی کی ممانعت اور اس پر تنبیہ و سرزنش دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب میں پائی جاتی ہے[153]''

---

[151] **صحیح بخاری: کتاب المناقب: باب علامات النبوۃ فی الاسلام: ۳۵۹۵**

[152] **یہاں غیر مسلمین کی طرف اشارہ ہے ناکہ مسلمانوں کی طرف کہ ہر کوئی اپنا اپنا مذہب،مسلک،فقہ اور ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا کر دن کو پارا پارا کرکے کہے کہ مجھے آزادی اظہار ومذہب کا حق حاصل ہے،جبھی میں لبرل تناظر میں اپنے من چاہا ورژن کا اسلام اپنا سکتا ہوں،اسلام ایسی آزادی اور اتحاد پارہ پارہ کرے کی آزادی کو رد کرتا ہے ۔معج**

[153] **المستصفیٰ:جلد: ۱صہ:۲۷۷،۲۷۸**

اسلامی سزاؤں کے مقاصد:

جرائم کے ارتکاب کی صورت میں سزاوں کے بیان کے ساتھ قرآن کریم میں ان کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، یہ مقاصد بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ مجرم اپنے جرم کا بدلہ پائے، جو گھناؤنی حرکت اس نے کی ہے اس کا انجام جھیلے، جس حرام کام کا اس نے خواہش نفس سے مغلوب ہوکر ارتکاب کیا ہے، دوبارہ اس کے ارتکاب کی جرأت نہ کرسکے اور سزا کا خوف اس کے دل سے اس کا داعیہ ختم کردے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ یہ سزائیں دیگر افراد کے لیے عبرت کا باعث ہوں، ان کے ذہنوں میں ہر وقت یہ بات تازہ رہے کہ اگر انھوں نے ان جرائم کا ارتکاب کیا تو انھیں بھی ویسے ہی بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ شعور انھیں ارتکابِ جرم سے باز رکھے گا اور ان میں مجرمانہ ذہنیت نہیں پنپنے پائے گی۔

آیتِ قصاص کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَلَكُمْ فِىْ الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَاْ أُولِىْ الأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

''اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل و خرد رکھنے والو۔ امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کروگے''[154]۔

اسلامی تعزیرات کی حکمت و معنویت پر روشنی ڈالنے والی یہ ایک بہت معنیٰ خیز آیت ہے، قصاص میں قاتل کو بھی قتل کردینے سے بہ ظاہر ایک اور جان کا ضیاع ہوتاہے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس میں زندگی ہے۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے:

''یہ آیت بلاغت اور ایجاز کا ایک نادر نمونہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قصاص کو نافذ کیا جائے گا تو جو شخص کسی کو قتل کرنے کا خواہاں ہوگا وہ اس خوف سے رک جائے گا کہ بدلے میں اسے بھی قتل کردیا جائے گا،اس طرح دونوں زندہ بچ جائیں گے،عربوں میں جب کوئی شخص کسی کو قتل کردیتاتھا تو دونوں کے قبیلے غیظ و غضب سے بپھر جاتے تھے اور ان میں باہم جنگ ہونے لگتی تھی، اس طرح بہت بڑی تعداد کے قتل کی نوبت آجاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جب قصاص کو مشروع کیا تو تمام لوگ قانع ہوگئے اورانھوں نے باہم لڑائی جھگڑا بند کردیا۔ اس طرح انھیں زندگی مل گئی''[155]۔

---

[154] البقرہ:۱۷۹

[155] ابوعبداللہ القرطبی: الجامع لاحکام القرآن: الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب: ۲/۲۵۶

اس آیت کی بلاغت پر علامہ زمخشریؒ اورامام رازی نے بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ملاحظہ کیجیے۔[156]

اسلامی سزاؤں کے نفاذ سے ہر دور میں ان کے مطلوبہ مقاصد حاصل ہوتے رہے ہیں، موجودہ دور میں بھی اگر دنیا کے مختلف ممالک میں رو،نما ہونے والے جرائم کے اعداد و شمار پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت پورے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جن ممالک میں یہ سزائیں نافذ ہیں ان کے مقابلہ میں جن ممالک میں نافذ نہیں ہیں ان میں جرائم کا تناسب کئی ہزار گنا زیادہ ہے۔

اسلامی تعزیرات کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان کا نفاذ اسلامی ریاست کی ذمہ داری بنتی ہے،اور جس خطہ زمین میں اسلامی ریاست قائم نہ ہو وہاں کوئی دوسرا ادارہ یااجتماعیت انہیں نافذ کرنے کاحق نہیں رکھتی ہے۔

امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ:

‘‘امت کا اس بات پراجماع ہے کہ عوام کو مجرموں پر حدود جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے، بلکہ آزاد مجرمین پرحد جاری کرنے کااختیار صرف امام کو ہے[157]۔

[156] جاراللہ الزمخشری:الکشاف عن حقائق التنزیل: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی واولادہ، مصر: ۱/۳۳۳اور فخر الدین الرازی: مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر: المکتبۃ التوفیقیۃ مصر: ۵۱۔۵/۵۰

[157] فخر الدین رازی ۔امام التفسیر کبیر: جلد:۵صہ:۹

جرائم کے خاتمے کا اسلامی طریقہ کار

از:------------------------------------

اسلام نے جرائم کو جڑ سے اکھاڑ ڈالنے کے لیے جو منصوبہ ہمارے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے ،جس میں ممکن ہے اہم کو سمھجھنے میں خطا کو شایبہ خارج از امکان نا ہو مگر بحرحال کافی تحقیق و مطالعہ کے بعد اس خلاصہ کو پیش کیا جارہا ہے:جس میں سچ اللہ کی جانب سے ہوگا جبکہ خطا ہمارا عمل سمجھا جانا چاہئے:

١۔سب سے پہلے وہ انسان کو خدائے تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانے اور کی دعوت دیتا ہے اور نفس کی پاکیزگی کا ایک نظام پیش کرتا ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان کے دل اور دماغ میں جرم اور گناہ کا تصورپروان چڑھنے کے شایبہ کو پروان چڑھنے کے عمل کو محدود کردیتا ہے۔

٢۔اس کے بعد وہ ایک ایسا سماج قائم کرتا ہے جس میں رہ کر انسان اپنی بنیادی ضرورتیں اور خواہشات جائز ذرائع سے پوری کرسکتا ہے اور اسے ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ناجائز اور مجرمانہ وسائل اختیار نہیں کرنے پڑتے ہیں ۔

٣۔جب پہلے دو طریقوں سے ارتکاب جرائم کو روکنا ممکن نہیں ہو تو پھر انہیں روکنے و مسدود کرنے کے لیے حکومت کی مشینری کو حرکتمیں لانے کی ہدایت کرتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جرائم کی سخت سزائیں نافذکرنے سے پہلے اسلام، اسلامی ریاست کے ارباب اختیار کو عوام کے مذہب و مسلک اور رنگ و نسل سے بے نیاز ہوکر ان کے لیے ایسے وسائل بہم پہنچانے کا حکم دیتا ہے جن کے ذریعہ سے وہ خوراک، لباس، گھر اور تعلیم حاصل کرسکیں تا کہ وہ جائز ضرورتوں کے پورا ہونے کے بعد ناجائز وسائل نہ اختیار کرسکیں، اس کے علاوہ اسلام حکومت کو اس بات کا بھی ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ دولت سمٹ کر چند افراد ہی کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے ۔

اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے لیے ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے، اور خاص مذہبی ہدایت یافتہ ،تربیت یافتہ ماحول کی تشکیل،تخلیق اور مسلسل قایم شدہ ماحول کا ہونا لازمی قرار دیتا ہے[158] ،تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے قحط سالی کے زمانہ میں چوری کی سزا کے طور پر ہاتھ کاٹ دینے کی سزا کو ملتوی کر دیا تھا اور ایک دوسرے موقع پر آپ نے سرقہ کا ارتکاب کرنے والے

---

[158] معج

غلاموں کو اس بنا پر ہاتھ کاٹنے کی سزانہیں دی تھی کہ شہادتوں سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ ان کے آقاؤں کی کنجوسی اور سخت گیری کے باعث وہ لوگ اپنی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے، اور ایسی حالت کو پہنچ گئے تھے کہ ان کے لیے حرام مال کو کھانا بھی جائز ہوگیا تھا۔ اسی طرح اسلام نے جہاں شادی شدہ مرد اور عورتوں کے لیے سنگساری کی سزا تجویز کی ہے وہاں غیر شادی شدہ لوگوں کومحض کوڑوں کی سزا دینا کافی سمجھا ہے۔

اسلام نے کچھ اس طرح کے نظام معاشرت کو مرتب و مدون کیا ہے کہ ریاست س بات کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ عوام کو زندگی کے وسائل فراہم کرے اور عوام کو ضروریات زندگی سے بے نیاز کردے، اتنی آسانیاں پیدا کرنے کے باوجود بھی اگر کوئی شخص چوری کرتا ہے یا دوسروں کے مال پر غاصبانہ قبضہ جماتا ہے، یا دھوکہ کے سے روپیہ حاصل کرتا ہے تو بجا طور پر اس بات کا مستحق ہے کہ اُسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔
مثلا اسلام نے انسانی فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر صاحب استطاعت شخص کو چار شادیوں تک کی اجازت دی ہے اور موقع دیا ہے کہ اگر وہ ایک عورت سے مطمئن نہیں ہے تو ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرسکتا ہے لیکن اس سہولیت کے باوجود بھی اگر وہ زنا کاری کا مرتکب ہوتا ہے تو واقعی وہ سخت سزا کا مستوجب ہے اور ان حالات میں اسلام کی مقرر کردہ سزاؤں کو نہ تو سخت کہا جاسکتا ہے اور نہ غیر مہذب تصور کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے صرف سخت سزائیں دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ سزاؤں کے نفاذ سے پہلے اس نے ایک ایسا معاشرتی نظام بھی قائم کرنے پر زور دیا ہے جس میں جرائم کے ارتکاب کی گنجائش ہی باقی نہ رہے ۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو معاشرہ کو انحطاط اور بداخلاقی سے محفوظ رکھنے کے لیے اسلام نے بجا طور پر عبرت انگیز سزائیں مقرر کی ہیں تاکہ ان عبرت انگیزسزاؤں کو دیکھ کر دوسرے لوگ گناہ کے راستے پر چلنے سے باز رہ سکیں۔

دنیا کی تمام مہذب حکومتوں اور سوسائٹیوں میں جرم اور گناہ کو روکنے کے ضوابط موجود ہیں لیکن ان میں اور اسلام کے نظام جرم و سزا میں جو زبردست فرق موجود ہے وہ اس بات سے بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ متحدہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں آج سے چند سال پہلے صرف ایک سال کے اندر محض بڑی نوعیت کے تقریباً پانچ لاکھ جرائم کا ارتکاب کیا گیا تھا ، کیا جرائم کی اس تعداد کے پیش نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ امریکہ میں جرائم کو روکنے اور مجرموں کو سزا دینے کے لیے کوئی قانون موجود نہیں ہے؟

متحدہ امریکہ میں ان جرائم کو روکنے کے لیے قانون تو ضرور ہے لیکن اول تو جرم اور سزا سے متعلق غیر اسلامی قوانین میں جرائم کے بنیادی محرکات کے انسداد کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا، دوئم کسی جرم کے ارتکاب میں کامیاب ہوجاتے کے بعد مجرم کو جو فائدہ پہنچتا ہے اور اس کے وحشیانہ جذبات کو جو سکون حاصل ہوتا ہے چونکہ جرم کی سزا اس فائدہ اور سکون کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے اس لیے وہ اول ارتکاب جرم کے بعد بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے ، دوسرے اگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا تو وہ اس سزا کو آسانی کے ساتھ برداشت کرلیتا ہے اس طرح ان قوانین

اور ضابطوں سے جرائم کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے، یہی صورت حال ہمارے یہاں بھی ہے، یہاں جرائم پیشہ لوگ جرائم کرنے سے اس لیے باز نہیں آتے کیونکہ انہیں اس بات کا پورا اندازہ ہے کہ عدالتوں میں مقدمات بہت لمبے کھنچتے ہیں اور اس لمبے عرصہ میں مقدمات دائرکرنے والے افسران کا تبادلہ ہوجاتا ہے اس طرح مجرم کو بری ہونے میں آسانی ہوجاتی ہے ،اور وہ اس میں موجود سقم و خلا،کو مد نظر رکھ کر اپنے روپے،طاقت اور اثر و نفوذ سے جرم کی سز کو خود سے دور کرنے میں عموماً کامیاب رہتا ہے،ایسے ماحول و تناظر کے ہوتے ہوئے بھی شرع قوانین و ماحول کی دشمنی و عناد میں خود کو تباہ کرنا پاگل پن اور دیوانہ پن ہی سمجھا جاسکتا ہے اور ایسے منکر قانون انسانوں کے لئے پھر ظلم و جبر کا شکار بننا عین منطقی اور جایز مصلحت پر مبنی مانا جانا چاہئے[159]-

[159] معج

شرعی سزائیں:اور انکی اقسام و شرایط

از:-----------------------------------

دنیا کے عام قوانین میں جرائم کی تمام سزاؤں کو تعزیرات کا نام دیا جاتاہے‘ خواہ وہ کسی بھی جرم سے متعلق ہوں،اس لئے تعزیرات ہند، اور تعزیرات پاکستان کے نام سے جو کتابیں ملک میں پائی جاتی ہیں ان میں ہرقسم کے جرائم اور ہرطرح کی سزاؤں کا ذکر ملتا ہے ، غور کرنے سے معلوم پڑتا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں جرائم کی سزاؤں کی تین عمومی و بنیادی قسمیں ملتی ہیں:

۱۔حدود۔
۲۔قصاص۔
۳۔تعزیرات

۱۔ حدود:

یہ حد کی جمع ہے جو اس سزا کو کہتے ہیں جس کا تعیین کتاب و سنت میں کردیا گیا ہو۔ اس کا اطلاق درج ذیل سزاؤں پر ہوتاہے:حدِ زنا, حدّ قذف: بہتان تراشی[160] حدِ سرقہ[161]،حدِ حرابۃ[162]، حدِ شرب خمر[164]حدِ الردۃ[163]

۲۔قصاص:

اس کی اصل قران کی یہ آیات ہے جن میں کہا گیا ہے کہ :

اگر کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو بدلے میں اسے بھی قتل کردیا جائے گا[165]۔

اور اگر اس کا کوئی عضو تلف کردے تو بدلے میں اس کا وہ عضو بھی تلف کردیا جائے گا[166]

---

[160] **یعنی کسی پر زنا کاالزام لگانے یا اس کے نسب کا انکار کرنے کرنےکی سزا**

[161] **چوری کی سزا**

[162] **ڈکیتی اور اس سے مشابہ جرایم**

[163] **شراب پینے کی سزا**

[164] **اسلام سے پھر جانے کو ردّہ یا ارتداد کہا جاتا ہے**

[165] **البقرة: ۱۷۸**

[166] **المائدة: ۴۵**

اس امر اور اس سے مشابہ امور کو قصاص کہا جاتا ہے، بعض فقہاءنے قصاص کو بھی حد میں شمار کیا ہےکیونکہ اس کی سزا بھی کتاب و سنت کے ذریعے متعین کردہ ہے۔

۳۔تعزیر:

جن جرائم کی سزایئں قرآن و سنت میں منصوص نہیں ملتی ہے یا جن امور میں کسی جرم کے ثبوت کے لیے حدود و قصاص کے نفاذ کے لیے جو شرائط مقرر ہیں وہ پوری نا ہورہی ہوں ایسی صورت میں مجرم پر حد یا قصاص تو جاری نہیں کیا جاتا، لیکن اسے آزاد بھی نہیں چھوڑدیا جاتا، بلکہ اس کے جرم کے مطابق اسے کوئی دوسری سزا دی جاتی ہے۔ جنھیں اسلامی ریاست میں امیر ریاست،امیر صوبہ جات یا قاضی جرم، مجرم اور حالات کے مطابق حسب ضرورت نافذ کرتا ہے یہ سزائیں جسمانی بھی ہوسکتی ہیں، مالی بھی ممکن ہیں۔ جبکہ یہ نوبت کے لحاظ سے قید و بند کی بھی ہوسکتی ہیں اور شہر بدری کی بھی ممکن ہے، یا کوئی دوسری اس قبیل کی معقول سزا بھی وقت و حالت کی شرعی نصوص کی روشنی میں بھی ممکن ہے۔

اسکی ایک صورت یہ ہے کہ قاضی کو اس قبیل میں یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر زمانہ‘ ہر مکان اور ماحول کے لحاظ سے جیسی اور جتنی سزا انسداد جرم کے لئے ضروری سمجھے وہ جاری کرے، دوسرا یہ کہ اسلامی حکومت شرعی قواعد کا لحاظ کرتے جرائم کی سزاؤں کا کوئی خاص پیمانہ مقرر کردے‘ دونوں صورتیں ہی جائز ہیں ۔

<u>حدود میں گواہی کی شرائط:</u>

حدود کی سزائیں جتنی سخت نظر آتی ہیں انکی شرائط بھی اسی حساب سے سخت رکھی گئیں ہیں، حدود کے نفاذ میں شریعت اسلامیہ نے ضابطۂ شہادت بھی عام معاملات سے ممتاز اور بہت محتاط بنایاہے‘تاکہ کسی معصوم اور بے گناہ کو سزا نا دی جاسکے ۔ مثلا زنا کی سزا میں تو دو گواہوں کی بجائے چار گواہوں کو شرط قرار دے دیا اور وہ بھی جبکہ وہ ایسی عینی گواہی دیں جس میں کوئی لفظ مشتبہ نہ رہے۔

چوری وغیرہ کے معاملہ میں اگرچہ دوہی گواہ کافی ہیں‘ مگر ان دو کے لئے عام شرائط شہادت کے علاوہ کچھ مزید شرطیں بھی عائد کی گئی ہیں‘ مثلاً دوسرے معاملات میں مواقع ضرورت میں قاضی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کسی فاسق آدمی کے بارہ میں اگر قاضی کو اطمینان ہوجائے کہ عملی فاسق ہونے کے باوجودیہ جھوٹ نہیں بولتا تو قاضی اس کی گواہی کو قبول کرسکتا ہے، لیکن صرف حدود ‘میں قاضی کو اس کی گواہی قبول کرنے کا اختیار نہیں ہے مگر عام معاملات میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے، مگر حدود میں دو مردوں کی گواہی ضروری ہے۔

عام معاملات میں شریعت اسلام نے تمادی (مدت دراز گذر جانے) کو عذر نہیں قرار دیا ہے، واقعہ کے کتنے ہی عرصہ کے بعد کوئی گواہی دے تو قبول کی جاسکتی ہے، لیکن حدود میں اگر فوری گواہی نہ دی‘ بلکہ ایک مہینہ یا اس سے زائد دیر کرکے گواہی دی تو وہ عموماً قابل قبول تصور نہیں ہوتی ہے۔ اس طرح شریعت اسلامیہ میں قطع ید (ہاتھ کاٹنے) کی سزا مطلقاً ہر چوری پر عائد نہیں ہوتی ہے،

جسے عرف عام میں چوری کہا جاتاہے' بلکہ سرقہ جس پر سارق کا ہاتھ کاٹا جاتاہے اس کی ایک مخصوص تعریف یہ ہے کہ:

'' کسی کا مال محفوظ جگہ سے سامان حفاظت توڑ کرناجائز طور پر خفیہ طریقہ سے نکال لیا جائے''۔

اس تعریف کی رو سے بہت سی صورتیں جن کو عرفاً چوری کہا جاتاہے، حد سرقہ کی تعریف سے نکل جاتی ہیں، مثلاً محفوظ مکان کی شرط سے معلوم ہوا کہ عام پبلک مقامات: مثلاً مسجد' عیدگاہ' پارک' کلب' اسٹیشن' ویٹنگ روم' ریل' جہاز وغیرہ میں عام جگہوں پر رکھے ہوئے مال کی کوئی چوری کرے یا درختوں پر لگے ہوئے پھل چرالے یا شہد کی چوری کرے تو اس پر حد سرقہ جاری نہیں ہوگی ، بلکہ عام ممالک کے قوانین کی طرح تعزیری سزا دی جائے گی۔

اسی طرح وہ آدمی جس کو آپ نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی ہے خواہ وہ آپ کا نوکر ہو یا مزدور ومعمار ہو یا کوئی دوست' عزیز ہو وہ اگر آپ کے مکان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اگرچہ عرفی چوری میں داخل نہیں مگر بحر حال تعزیری سزا کا مستحق ہے، مگر ہاتھ کاٹنے کی شرعی سزا اس پر جاری نہ ہوگی، کیونکہ وہ آپ کے گھر میں آپ کی اجازت سے داخل ہوا تھا' اس کے حق میں حفاظت مکمل نہیں ہے۔اسی طرح اگر کسی نے کسی کی جیب کاٹ لی یا ہاتھ سے زیور یا نقد چھین لیا یا دھوکہ دے کر وصول کرلیا یا امانت لے کردینے سے انکار کردیا مُکر گیا یہ سب چیزیں حرام وناجائز اور عرفی چوری میں ضرور داخل ہیں۔ مگر چونکہ شرعی سرقہ کی تعریف میں داخل نہینہے اس لئے ان پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

بلکہ ان سب کی سزا تعزیری ہے جو حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے، اسی طرح کفن کی چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ اول تو وہ محفوظ جگہ نہیں ہے اور وہ کفن میت کی ملکیت نہیں ہے[167]، ہاں اس کا یہ فعل سخت حرام ہے، اس پر تعزیری سزا حسب صوابدید حاکم جاری کی جائے گی،اسی طرح اگر کسی نے ایک مشترک مال میں چوری کرلی جس میں اس کا بھی کچھ حصہ ہے، خواہ میراث کا مشترک مال تھا یا شرکت اور تجارت کا مال تھا تو اس صورت میں چونکہ لینے والے کی ملکیت کا بھی کچھ حصہ اس میں شامل ہے' اس ملکیت کے شبہ کی وجہ سے حد شرعی ساقط ہوجائے گی اور تعزیری سزا دی جائے گی[168]۔

---

[167] یہ نقظہ فہم کا محتاج ہے جبکہ اکثر میت کی تجہز و تکفین اسکے مال سے یا آل واولاد کے مال سے ہوتی ہے،اگر کہا جائے کہ وہ اسکے ورثا کا مال ہوا تو کہا جائیگا کہ اسکی تدوین کے وقت تک وہ مال ابھی تقسیم کے لئے اس کے ورثا کے اذہان میں بھی نہیں ہوتا ہے ،بلکہ نبی اکرمؐ نے اولاد کے مال کو باپ کا مال قرار دیا ہے جیسا کہ ایک فرد نے آپ سے اپنے باپ کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہی مال ہے،پھر ورثا کے دماغ میں دوران تدفین بھی یہ تصور پنہاں ہوتا ہے کہ یہ ہمارا باپ،بھائی،بھن،بیٹا یا دادا ہے،ہمارا ،اپنا کے الفاظ یہاں متوفی اور ورثا میں ایک جان ایک قالب کا مدعا و مقصد پیدا کردیتے ہیں،ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ متوفی کے مال سے اول تجہیز و تکفین اور اسکا قرضہ ادا ہوگا پھر وراثت کی تقسیم مکن ہوگی ۔معج

[168] تفصیلات کے لئے تفسیر معارف القرآن مولفہ حضرت مفتی محمد شفیع کو ملاحظہ کیا جائے

اسلام کے تعزیری قوانین پر بے رحمی کا اعتراض

از:---

اسلام کے تعزیری قوانین کی حکمت و معنویت سے جو حضرات واقف نہیں ہیں وہ ان پر مختلف پہلوؤں سے اعتراض کرتے رہتے ہیں، اور انھیں یہ سزائیں وحشیانہ اور سفّاکانہ دکھائی دیتی ہیں اور جن سے ان کی نظر میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔ جبکہ ایک اعتراض بہت زور شور سے یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام نے مختلف جرائم پر جو سزائیں تجویز کی ہیں وہ انتہائی بے رحمی اور سنگ دلی کی مظہر ہیں، آج کا ترقی یافتہ اور متمدن دور ان کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے ،اسلام کے بہت سے احکامات قدامت کے مظہر ہیں۔ اور آج کی مہذب اور شائستہ دنیا میں ان پر عمل در آمد کرنا ممکن نہیں ہوسکتا ہے۔

پھر ایسے اعتراضات صرف مخالفین ہی کی طرف سے نہیں کیے جاتے ہیں بلکہ آج جو مسلمان شائستہ اور ترقی پسند کہلاتے ہیں اور جنہوں نے اسلام کا مطالعہ براہ راست نہیں کیا ہوتا ہے بلکہ مغربی اہل قلم کے توسط سے کیا ہوتاہے، وہ بھی محض غلط فہی کی بنا پر اس قسم کے اعتراضات کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی پوری تعلیم میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ملتی جسے قدامت یا تاریک خیالی کا مظہر کیا جاسکے۔ اصل میں یہ اعتراض کرنے والوں کی نظر مسئلے کے صرف ایک پہلو پر رہتی ہے،وہ دوسرے پہلو کی طرف نہیں دیکھتے کہ یہ مجرمین معاشرہ میں کتنے فساد کا باعث بنتے ہیں اور ان کا وجود پاکیزہ سماج میں کتنا تعفّن پیدا کرتا ہے۔

جب جسمِ انسانی کے کسی عضو میں کوئی پھوڑا بن رہا ہو تو اس کے علاج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر یہ ناسوری پھوڑا پک گیا ہو تو اسے چیر پھاڑ کر گندا مواد باہر نکال دیا جاتا ہے ، اور اگر یہ جسم میں ظالمانہ سرایت کررہا ہو یا زخم کینسر بن گیا ہو تو اس عضو کو کاٹ کر پھینک دینے ہی میں عافیت سمجھی جاتی ہے اور مریض سے ہمدردی اور بھلائی کا یہی تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح جو مجرم اپنے جرم کی وجہ سے صحت مند معاشرہ کو بیمار کررہا ہو اور قوی اندیشہ ہو کہ اس کا فساد دوسرے افراد میں بھی سرایت کرجائے گا تو اس کا علاج کرنا اور اور اگر وہ لاعلاج ہو تو اسے سماج سے کاٹ کر پھینک دینا ہی تقاضائے دانش مندی اور قرین عقل ہے، ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اسلام نے جو سزائیں تجویز کی ہیں وہ بڑی اہانت آمیز اور رسوا کن ہیں۔ اگر ان سزاؤں کی معقولیت تسلیم کرلی جائے تو بھی ان کے نفاذ کے طریقوں کو کسی طرح پسندیدہ نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ سزا کوئی بھی ہو اور کتنے ہی آسان سے آسان طریقے سے دی جائے وہ بہ ہر حال اہانت آمیز اور رسوا کن ہوتی ہے۔

اگر کسی فرد یا سماج کا مزاج بگڑا نا ہو تو وہ سزا کی کسی صورت کو بھی لائقِ فخر اور باعثِ عزّ و شرف نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اسلامی تعزیرات میں وہ صورتیں خاص طور پر اسی لیے اختیار کی گئی ہیں ، تاکہ ان کی اہانت انگیزی اور ذلت آمیزی دیکھ کر دوسرے لوگ، جن کے اندر جرم کے جراثیم پنپ رہے ہوں،ان جرائم کے ارتکاب سے باز آجائیں۔

اسلامی تعزیرات کے بارے میں ایک اعتراض یہ بھی عام ہے کہ ان سے بنیادی انسانی حقوق[169] کی خلاف ورزی ہوتی ہے،کوئی شخص بایک عالی درجہ کا مجرم ہو ،لیکن اس کی جان محترم ہے اور کسی دوسرے انسان کو اس کی جان لینے کا حق نہیں ہے،اسی دلیل کی بنیاد پر پھانسی کی سزا کو کالعدم کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے دلائل سے یہ حضرات مجرم کے بنیادی حقوق کی تو پر زور وکالت کرتے ہیں،لیکن مظلوم اور مقتول کے انسانی حقوق ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

یقیناً انسانی جان محترم ہے،لیکن جتنی محترم قاتل کی جان ہے اتنی ہی محترم مقتول کی بھی جا ن تھی۔اگر قاتل نے اس احترام اور تقدس کو پامال کیا ہے تو اسے بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے(اگر مقتول کے ورثا اسکو معاف نا کریں) ۔
یہ تہذیب انسانی اور حقوق انسانی کے دعویدار جرائم پیشہ لوگوں پر تو رحم کھاتے ہیں مگر پوری عالم انسانیت پر رحم نہیں کھاتے ہیں، جن کی زندگیوں کو ان جرائم پیشہ لوگوں نے اجیرن بنارکھا ہوتا ہے، یہ روش تو سراسر عقل کے خلاف اور انصاف سے بھی متصادم ہے، کیونکہ ایک مجرم پر ترس کھانا پوری انسانیت پر ظلم کے مترادف ہے، جب کہ امن عامہ کو مختل کرنے کا سب سے بڑا سبب بھی یہی ہے۔

پھر اسلامی سزاؤں کے مقابلے میں نام نہاد انسانی حقوق کی پرواہ کرتے ہوئے جو قوانین لائے گئے ہیں ان میں یہ سقم ملتا ہے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی نظر میں ایک کھیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں ، اس لئے وہ جیل خانہ میں بیٹھے ہوئے بھی آئندہ اس جرم کو خوبصورتی سے کرنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں، جن اسلامی ممالک میں جرائم پر حدود نافذ ہیں ان کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہاں نہ بہت سے افراد ہاتھ کٹے نظر آتے ہیں نہ برسہا برس تک سنگساری کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے۔

اسلامی سزاؤں کا مسلمانوں کے قلوب پر اس قدر رعب اور دبدبہ ہوتا ہے کہ وہاں چوری ' ڈاکہ اور بے حیائی کا نام نظر نہیں آتا ہے،اس کی ایک مثال سعودیہ عربیہ کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ وہاں دن میں پانچ مرتبہ ہر شخص دیکھتا ہے کہ دکانیں کھلی ہوئی ہیں، لاکھوں کا سامان ان میں پڑا ہوا ہے اور دکان کا مالک بغیر دکان بند کئے ہوئے نماز کے لئے حرم میں پہنچ جاتا ہے، اس کو یہ وسوسہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا مال دکان سے غائب ہوجائے گا، اس کی مثال دنیا کے کسی متمدن اور مہذب ملک میں پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔

---

[169] **انسانی اقدار کا تصور ایک متغیر غیر اقداری بنیاد پر استوار ہوتی ہے جسے کسی ،خاص وقت و حالات میں کوئی معاشرہ،انسانی گروہ،اور ریاست انسانی و غیر انسانی تصور کرتا ہے،کبھی جرایم کی شدت و حدت اور عروج میں کل معاشرے کی بقا کے لئے ایک بظاہر سخت سزا ریاست انسانی معاشرے کے تحفظ کے لئے عین انسانی جانی جاتی ہے اور کبھی اسی انتھائی قلیل جرم میں اپنے اقدار و تصور کی روشنی میں اسے غیر انسانی سمجھتے ہیں ،خیر بات کوئی بھی ہو ایسے معیارات مبنی بر وحی نہیں ہوتے بلکہ انسانون کے اختراع کردہ ہوتے ہیں اور اور انسان اور انسانی گروہ خواہش نفس اور نمود و نمایش اور آسائیش اور خوش لگی کے مناظر کے شوقین ہوتے ہیں ،جبھی انکو اکثر شراب،شباب ،زنا،اور لواطت بھی عین انسانی اخلاق کےمطابق اعمال دکھتے ہیں یہ انکی نفسی ذہنی موضوعیت ہوتی ہے جو ان سے ایسے عقاید تسلیم کرواتی ہے۔معج**

جہاں تک رحمت وشفقت کا معاملہ ہے وہ شریعت اسلام سے زیادہ کوئی کسی عام و خاص کو ن سکھا نہیں سکتا ہے، جس نے عین میدان جنگ میں اپنے قاتل دشمنوں کا حق پہچانا اور حکم دیا کہ عورت اگر سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، اسی طرح بچہ سامنے آجائے تو بھی ہاتھ روک لیا جائے، بوڑھا سامنے آجائے تب بھی یہی حکم ملتا ہے، اسی طرح مذہبی عالم جو تمہارے مقابلہ پر قتل میں شریک نہ ہو، بلکہ اپنے طرز کی عبادت میں مشغول ہو، اس کو قتل نہ کرو۔

سید ابو الاعلی مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

اس زمانے کی لادینی تہذیب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرموں کے ساتھ ہیں اس لئے یہ نقطہ نظر بڑے زور وشور سے پیش کیاجاتاہے کہ اسلامی سزائیں وحشیانہ ہیں
اس کادوسرا مطلب یہ ہواکہ چوری کرنا کوئی وحشیانہ کام نہیں ہے البتہ اس پر ہاتھ کاٹنا وحشیانہ مجرمانہ اور غیر انسانی کام ہے
اور زناکاری تو کوئی جرم نہیں ہے لیکن زناکار کو کھلی چھوٹ دلوانا الحادی تہذیب کی دنیا کے اندر سستی تفریح ہے۔

مستفاد:

۱۔ ابوزید: سہ ماہی ایقاظ : ریپ کی سزا کے لئے چار گواہ! حقیقت کیا ہے؟

۲۔ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی:اسلام کے تعزیری قوانین کی معنویت: شرعی سزاوں کی تعریف اور انکی اقسام۔

۳۔ مولانا مفتی سید عبد القدوس ترمذی۔

۴۔ حسن مدنی: اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش بسلسلہ ڈی این اے ۔

۵۔ ایم۔ اے۔ زیدی: اسلام میں جرائم کو روکنے کے ضوابط ۔

-

سلسلہ تردیدِ الحاد:۴

جدید نسائیت پرستوں کے اسلامی اصول دین اور شرعی قوانین پر اعتراضات کا علمیاتی جایزہ و تردید:حقوق النسا کے تناظر میں

جدید نسائیت کا شرعی ،تہذیبی ،ثقافتی اور فسلفیانہ محاکمہ

مرتبہ: مقدمہ تخریج،تہذیب اورحواشی

ڈاکٹر محمد علی جنید

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش